حسب معمول ناشتے سے فارغ ہو کر سجاد نے دفتر جانے کی تیاری شروع کی۔ لباس تبدیل کر کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹائی کی ناٹ لگاتے ہوئے اس نے اپنا جائزہ لیا۔ خود ستائی کئے بغیر وہ خود کو نہایت آسانی سے خوب رو اور وجیہہ کہہ سکتا تھا۔ 32، 33 کی عمر کے باوجود وہ ابھی تک نوجوان لگتا تھا۔ چاہنے کے باوجود لباس کے معاملے میں وہ اہتمام نہیں کرتا تھا۔ وہی عام سا سوٹ جو دفتری ایگزیکٹوز کا مروجہ لباس ہے۔ روز وہ اسی طرح کا کوئی سوٹ پہن کر دفتر جاتا تھا۔ بس سوٹ کا رنگ بدلتا رہتا تھا۔ گرمیاں آتیں تو کوٹ جسم سے جدا ہو جاتا مگر ٹائی سے چھٹکارا نہ ملتا۔ انگریز اپنے پیچھے کیسی کیسی لعنتیں چھوڑ گئے ہیں۔

لباس کے معاملے میں جو وہ اہتمام نہیں کرتا تھا تو اس لئے کہ وہ عقل مند تھا۔ جانتا تھا کہ بیویاں بہت شکی ہوتی ہیں۔ اور قدسیہ تو اس معاملے میں عام بیویوں سے بھی دس ہاتھ آگے تھی۔ اس لئے وہ بہت محتاط رہتا تھا۔

کہتے ہیں کہ ادھر شیطان کا نام لو اور ادھر وہ حاضر۔ آئینے میں قدسیہ کا عکس ابھر آیا۔ وہ اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "ہو گئے تیار؟" اس نے پوچھا۔

"ارے ہماری تیاری کیا۔ دس منٹ لگتے ہیں تیاری میں۔" سجاد نے آہ بھر کے کہا۔

"تو زیادہ دیر لگا لیا کریں۔ اتنی حسرت سے کیوں کہہ رہے ہیں۔" قدسیہ شوخ لہجے میں بولی۔

"تمہاری صحت بہت عزیز ہے مجھے۔"

"میری صحت سے اس کا کیا تعلق؟"

"میں اہتمام سے تیار ہونے لگا تو تم دن میں بلڈ پریشر کی رات میں بے خوابی کی مریضہ بن جاؤ گی۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔ آپ کو جانتی ہوں میں۔ آپ کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔" قدسیہ کے لہجے میں فخر تھا۔

"تبھی اس روز شادی میں بے چاری روبینہ سے الجھنے لگی تھیں۔" سجاد نے اسے یاد دلایا۔

قدسیہ کھسیا گئی۔ "وہ اور بات ہے۔ وہ ریشہ خطمی ہوئی جا رہی تھی آپ پر۔ تو کیا میں تماشا دیکھتی رہتی۔ مجھے ایسی عورتیں اچھی نہیں لگتیں۔ اور اس روز بھی آپ پر شک تو نہیں تھا مجھے۔ آپ پر تو بڑا اعتبار ہے مجھے۔"

"تو ہونے دیتیں اسے ریشہ خطمی مجھ پر۔ یک طرفہ افیئر میں کیا حرج ہے۔"

"آدمی کو بہکتے دیر نہیں لگتی۔ ترغیب ہونی ہی نہیں چاہئے۔"

"بس یہی اعتبار ہے مجھ پر؟" سجاد نے شکایت کی۔

"اعتبار اپنی جگہ۔ میں تدبیر کی قائل ہوں۔ میں نے تو ایسا بندوبست کیا ہے کہ آپ عمر بھر مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتے۔ گنجائش ہی نہیں ہے آپ کے پاس۔"

"سب تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں وقت آنے پر۔" سجاد نے اسے اکسانے کی کوشش کی۔

"چھوڑیں ان باتوں کو۔ پرفیوم کیوں نہیں لگاتے آپ۔"

"تمہارے ڈر سے۔ پرفیوم لگاؤں گا تو کہو گی.... کسے پسینے کی بو سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

قدسیہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی۔ پھر اس نے پرفیوم کی ایک شیشی نکال کر خود سجاد کے لگائی۔

"اور اب خود ہی کسی کو پسینے کی بو سے بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔" سجاد نے اسے چھیڑا۔

"جی نہیں۔ یہ خاص قسم کی خوشبو ہے۔"

"کیا خاصیت ہے اس میں بھلا؟"

"اسے میں لگائی بجھائی کرنی والی خوشبو کہتی ہوں۔" قدسیہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "اب آپ کسی کے قریب جائیں گے تو یہ اس کی خوشبو جذب کر لے گی اور جب

آپ واپس آئیں گے تو اسے مجھ تک پہنچا دے گی۔ اور اس کے بعد تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اس چڑیل کی خیر نہیں۔"

"اس چڑیل کی تو خیر ہی خیر ہے۔" سجاد نے گہری سانس لے کر کہا۔ "وہ ہے ہی ایسی۔"

وہ مڑا تو قدسیہ نے اس کا کوٹ ایک جگہ سے مسکا ہوا دیکھا۔ "اتاریں اسے۔ میں استری پھیر دیتی ہوں ایک منٹ میں۔"

"رہنے دو۔ دیر ہو رہی ہے۔" سجاد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"اتاریں۔ مردوں کا حلیہ دیکھ کر ہی لوگ ان کی بیویوں اور ازدواجی زندگی کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں بلاوجہ کیوں خود کو بدنام ہونے دوں۔"

اس کے اصرار پر سجاد نے کوٹ اتار دیا لیکن وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔

"ایک بات تو بتائیں۔" قدسیہ نے استری کرتے کرتے کہا۔ "آپ اپنے کاروبار کے مالک ہیں۔ دفتر میں سب آپ کو جواب دہ ہیں۔ آپ کسی کو جواب دہ نہیں۔ پھر وقت کی پابندی کی اتنی فکر کیوں رہتی ہے آپ کو؟"

"دوسروں سے عمل کروانے کے لئے پہلے خود عمل کر کے دکھانا پڑتا ہے۔ کام لینے کے لئے کام کرنا ضروری ہے۔ ویسے بھی میں ڈسپلن کا آدمی ہوں۔ زندگی میں بے ترتیبی اور بے قاعدگی مجھے پسند نہیں۔ زندگی کو ہموار اور پرسکون ہونا چاہئے....."

"اور اچانک پن اور تھرل سے محروم۔" قدسیہ نے جلدی سے ٹکڑا لگایا۔ پھر اس کی طرف کوٹ بڑھا دیا۔ "یہ لیجئے۔ دو منٹ کی بات تھی۔"

"تمہاری خاطر اتنا تو بدل لیا خود کو۔" سجاد نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

"شکریہ جناب۔ اور ہم نے جو خود کو اس سے زیادہ بدل لیا..... صرف آپ کے لئے۔"

"میں بہت شکرگزار ہوں۔"

قدسیہ نے بریف کیس اٹھا کر اسے دیا۔ بریف کیس اٹھائے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اچانک ننھی مریم اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔ "کیا بات ہے گڑیا۔" اس نے جھک کے اس کا سر تھپتھپایا۔

"ابو ابو... میں بھی تکوں دی آپ تے تھاتھ۔" مریم نے تتلاتے ہوئے کہا۔
سجاد نے بڑی بے بسی سے قدسیہ کو دیکھا۔ بچوں کے معاملے میں وہ بے بس تھا۔ ان کی ننھی منی، معصوم سی اور ناممکن العمل خواہشوں کو بھی رد نہیں کر سکتا تھا۔ بچوں کو نفی میں جواب دینا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔ قدسیہ یہ بات خوب سمجھتی تھی اس لئے ایک اچھی بیوی کی طرح اس نے ڈانٹ ڈپٹ کا شعبہ اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ کبھی کبھار اپنے اس اختیار کا مظاہرہ وہ سجاد پر بھی کر دیتی تھی۔
اس وقت بھی قدسیہ اس کی مدد کو آگے بڑھی۔ "مریم۔" اس نے آنکھیں نکالتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں پتہ ہے، ابو دفتر جا رہے ہیں۔"
"کم از کم تم تو مجھے ابو نہ کہا کرو۔" سجاد نے شریر نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
قدسیہ بری طرح جھینپ گئی۔ اس کے رخسار دہکنے لگے۔ ایسے میں سجاد کو وہ ہمیشہ بے حد حسین لگتی تھی۔
"میں بھی دفتر داؤں دی۔" مریم نے ضد کی۔
قدسیہ کو غصہ آ گیا۔ "فضول باتیں نہ کیا کریں بچوں کے سامنے۔ میری بات کا اثر زائل کر دیا۔ اب خود بھگتیں۔"
سجاد نے سر جھکا کر دیکھا۔ مریم نے اس کی پینٹ کے پائینچے چھوڑ دیئے تھے۔ لیکن وہ سر اٹھا کر امید بھری نگاہوں سے اسے تک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں معصوم التجائیں مچل رہی تھیں۔ سجاد کو بے ساختہ اس پر پیار آ گیا۔ اس نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ "بیٹا... آپ دفتر تو نہیں جا سکتیں۔ ہاں، ہم آپ کو سیر کرا کر لا سکتے ہیں مگر ایک شرط ہے۔"
"تیا ابو؟"
"تو پھر آپ دفتر جانے کی ضد نہیں کریں گی۔"
"نہیں تروں دی ابو۔"
وہ مریم کو گود میں لئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ "ارے.... ارے.... کہاں لئے جا رہے ہیں اسے۔ دفتر کو دیر ہو جائے گی۔" قدسیہ نے اسے پکارا۔

سجاد نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "ہو جائے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "پہلے ہم اپنی بنیا رانی کو تھوڑی سی سیر کرا لائیں۔"

"بس یہی تو حماقتیں ہیں۔ آپ کا بس چلے تو دو دن میں بچوں کو بگاڑ کر رکھ دیں۔" قدسیہ کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔ "ابھی کہہ رہے تھے کہ بے قاعدگی پسند نہیں۔ اور اب...."

"اتنی بے قاعدگی میری زندگی کا ضابطہ ہے۔" سجاد نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔ "میں ابھی آیا۔"

○

لوسی تقریباً بھاگ رہی تھی۔ ریٹا کے لئے اس کا ساتھ دینا مشکل تھا۔ "اے لوسی.... اتنا بھاگنے کی کیا جرورت ہے۔" اس نے پکارا۔

لیکن لوسی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اسی طرح چلتی رہی۔ نہ اس نے پلٹ کر دیکھا' نہ کوئی جواب دیا۔

"پاگل ہے.... ایک دم پاگل۔" ریٹا کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے بڑبڑائی "اب ملیر لوکل نہیں ملنے گا۔ چاہے اولمپک سمجھ کر دوڑ لے۔" اس نے اپنے قدم اور سست کر لئے۔ تیز چلنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ لانڈھی لوکل کو 45 منٹ بعد آنا تھا۔

پھر اس نے آگے ہی آگے بھاگتی ہوئی لوسی کو ایک دم رکتے دیکھا۔ کہاں تو وہ بھاگ رہی تھی اور کہاں بت بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اچانک ملیر لوکل کا انجن اور اس کے پیچھے بوگیاں جاتی نظر آئیں۔ ٹرین ٹھیک وقت پر اسٹیشن سے نکلی تھی۔

ریٹا اپنے معمول کی رفتار سے چلتی اس تک پہنچی۔ "خالی پیلی بھاگتی تھی تو۔ اپن گھر سے ہی لیٹ چلے تھے۔" اس نے لوسی کو دلاسا دیا' جو ابھی تک بت بنی کھڑی تھی۔

"اب ٹیکسی کرنی پڑے گی۔" لوسی نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر ریٹا کی طرف مڑی۔ "او کے۔ ٹیکسی کریں گے۔ ففٹی ففٹی۔ او کے؟"

"ارے کیسا ففٹی ففٹی۔ میں پونے نو والی لوکل سے جاؤں گی۔ میرے کو لیٹ

ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"مجھے تو پڑتا ہے۔ میرا باس۔۔۔"

"تو پھر تو ٹیکسی میں جا۔ میرے کو ٹیکسی میں جانا ہی نئیں۔ اکھا بھاڑا تو دے کر چلتی ہوں۔"

"نو۔۔۔ نیور۔" لوسی نے پاؤں پٹخے۔

"دیکھ نا۔ تجھے جلدی پہنچنا ہے۔ ٹیکسی میں تو اکیلی جائے یا میں بھی جاؤں، تیرے کو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بل بھاڑا تو اتنا ہی بنے گا۔" ریٹا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں اکیلی جاؤں گی۔ تم کنجوس مکھی چوس۔"

"دیکھ ٹیکسی ساڑھے آٹھ سے پہلے ہی پہنچا دینے کا۔ اپن واں کیفے نیویارک میں تجھ کو کافی پلائے گا۔۔۔ گرما گرم کافی۔ او کے۔"

لوسی نے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ ڈرائیور سے بات کرنے کے بعد اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ ریٹا دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اس سے پہلے ہی ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی۔ "یو۔۔۔ آؤٹ۔" لوسی نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

"گرما گرم کافی، او کے۔" ریٹا نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا پھر ڈرائیور پر برس پڑی "اے مین، چلانے کا کہ نئیں۔ گولی کا مافک چلاؤ۔ ہم لوگ آٹھ پچیس پر دفتر پہنچنا مانگتا۔ ای دباؤ ایکسی لیٹر۔"

ٹیکسی ڈرائیور کو اس کی بات اتنی بری لگی کہ اس نے گاڑی کو ہوائی جہاز بنا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آٹھ بج کر بیس منٹ پر وہ دونوں کیفے نیویارک میں بیٹھی تھیں۔ بھاپ اڑاتی کافی کی پیالیاں ان کے سامنے رکھی تھیں۔ لوسی بار بار گھڑی دیکھے جا رہی تھی "اے۔۔۔ ابی تو بہت ٹیم پڑا ہے۔" ریٹا نے تقریباً اسے ڈانٹا۔ "وہ سامنے ای تو دفتر ہے تیرا۔"

"پتا ہے مجھے۔" لوسی نے چڑ کر کہا۔

"اے لوسی۔۔۔ ایک بات بول۔ تیرا باس بوت ڈراؤنا ہے۔ جالم ہے۔"

"ارے نہیں۔" لوسی نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ "وہ تو بہت ہینڈسم اور ڈیل

ہینڈ سم ہے۔ چاکلیٹی ہیرو ہے وہ تو۔ ذرا غور سے دیکھ لو تو یہاں کچھ ہونے لگے۔" لوسی نے دل پر ہاتھ رکھ کر دکھایا۔

"تو پھر ڈانٹتا بہوت ہوئیں گا۔"

"بالکل نہیں۔ اس نے تو کسی سے کبھی سخت بات بھی نہیں کی۔ بس کرتا ہے.... خوش اخلاقی سے۔"

"تو پھر تو اتنا کائے کو ڈرتی اس سے۔"

"اسے ڈسپلن پسند ہے۔ خود عمل کر کے دکھاتا ہے۔ ٹھیک نو بجے دفتر آ جاتا ہے۔ تو پھر ہم لوگ لیٹ کیسے ہوں۔"

"کھبصورت بھی ہے' پیسے والا بھی ہے۔ اتنے بڑے کاروبار کا مالک بھی ہے۔" ریٹا نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "اور تو اس کی سکریٹری ہے۔ اور تیرے مافک حسین لڑکی اپن نے دیکھی نئیں...."

"میرے دفتر میں دس لڑکیاں ہیں اور سب مجھ سے بڑھ کر حسین۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔" لوسی کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

"پر سکریٹری تو توئی ہے۔ تیرے کو لین ماری تیرے باس نے کبھی؟"

لوسی نے نفی میں سرہلایا۔ "کبھی نہیں۔"

"اور تو نے؟" ریٹا نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

"میں کیا کر سکتی ہوں۔ سج بن کے جاتی ہوں۔ اسمائیل دیتی ہوں.... لفٹ دیتی ہوں۔ پر وہ تو پتھر ہے پتھر۔ He has a stone in place of his heart" لوسی نے اداسی سے کہا۔ "میں نے پچھلی نوکری اس لئے چھوڑی کہ باس کہتا تھا' سکریٹری آدھی وائف ہوتی ہے.... فل ٹائم سکریٹری' پارٹ ٹائم وائف۔ اب یہ نوکری دل ٹوٹنے کی وجہ سے چھوڑ دوں گی۔"

"باس اتنی لڑکیوں میں کسی کو بھی لین نئیں مارتا؟" ریٹا نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ سب لڑکیاں اسے لائن مارتی ہیں۔ پر وہ کسی کو دیکھتا بھی نہیں۔"

"گیارہ لڑکیاں۔ سب تجھ سے کھبصورت۔ ایک سے بڑھ کر ایک اور کسی کا دال نئیں گلتا۔ تیرا باس پھرشتہ ہوئیں گا سالا۔"

"نہیں۔" لوسی نے سر ہلایا۔ "ہمیں ایک چکر تو اس نے چلایا ہوا ہے۔ دفتر سے باہر۔"

"تیرے کو کیسے معلوم پڑا؟"

"ہفتے میں ایک دن ڈسپلن کا پابند باس سب اصول توڑ دیتا ہے۔ اس روز دفتر میں ہے تو صبح ہی سے ایکسائٹڈ ہوتا ہے۔ ہر کام ہاف ہارٹیڈلی کرتا ہے۔ ساڑھے بارہ بجے دفتر سے نکلتا ہے.... لڑکوں جیسے شوخ کپڑوں میں۔ حالانکہ دفتر بزنس مین والے سوٹ میں آتا ہے۔ پھر وہ چار بجے واپس آتا ہے.... کوئی ٹیون گنگناتا ہوا.... آپ ہی آپ مسکراتا ہوا۔ مجھے پتہ ہے، کسی سے چھپ کر ملتا ہے وہ۔ اس دن وہ ٹھیک وقت پر دفتر سے اٹھ جاتا ہے گھر جانے کے لئے۔ چاہے کتنا ہی کام پڑا ہو۔ بیوی چار بجے فون کر کے پوچھتی ہے۔ کبھی کام زیادہ ہو تو بول دیتا ہے.... آج لیٹ ہو جاؤں گا۔ پر جس دن بن سنور کر واپس جاتا ہے، اس دن بیوی کو بولتا ہے.... نہیں جان.... ساڑھے پانچ بجے گھر پہنچ جاؤں گا۔ مکاری کرتا ہے کہ کہیں چوری پکڑی نہ جائے۔" اب لوسی سوچ رہی تھی کہ اس روز وہ بریف کیس میں اپنے وہ کپڑے لاتا ہو گا۔

"تب تو ٹھیک ہے۔ اچھا آدمی ہے.... ہیومن.... جسٹ ہیومن۔" ریتا نے طمانیت سے کہا۔ فرشتے اسے بہت برے لگتے تھے۔ اچانک اس کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں۔ "اے لوسی، تو اس کی وائف کو انفارم کر دے نا۔"

"میں کیوں کروں۔ انگور مجھے نہیں ملتا تو کیا۔ جس کے نصیب میں ہے، اسے ملتا ہے۔ تو میں کیوں کھٹا کروں۔"

"اے لوسی.... تو اپنا نام نہ بتانا۔ پر کال تو کر اس کی بیوی کو۔ مزا آئے گا۔"

لوسی سوچ میں پڑ گئی۔ بات سکریٹری شپ کے اصول کے خلاف تھی۔ باس کو پتہ چلتا تو نوکری جانی ہی جانی ہے۔ مگر گمنام کال تو کی جا سکتی ہے۔ اچانک اس کی نظر گھڑی پر پڑی۔ وہ بوکھلا کر اٹھ گئی۔ "او گاڈ.... اٹ از ایٹ ففٹی فائیو۔"

"ارے سن تو...."

"پے منٹ تمہیں کرنی ہے۔ کر دینا۔ میں چلی۔ بائے۔" لوسی پرس جھلاتی ہوئی ریسٹورنٹ سے نکلی اور تیز قدموں سے اس عمارت کی طرف بڑھ گئی، جس میں فواد اینڈ

ن کے دفاتر تھے۔

○

اگلی صبح مریم سب کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ سجاد کا معمول تھا کہ وہ اپنے بیٹے راشد کو اسکول چھوڑ کر آتا تھا۔ اس کے بعد ناشتہ کر کے لباس تبدیل کرتا تھا۔ راشد کے اسکول کا وقت ساڑھے سات بجے کا تھا۔

کار کی چابی سجاد کے ہاتھ میں دیکھ کر مریم مچل گئی۔ "ابو.... میں بھی داوٗدی اَتول۔" اس نے ضدی پن سے کہا۔

"تم نہیں جا سکتیں اسکول۔ ابھی بہت چھوٹی ہو۔" قدسیہ نے اسے سمجھایا۔

"بھائی بھی تو تھوٹے ہیں۔ پھر وہ تیوں واتے ہیں اَتول۔" ننھی مریم نے اعتراض کیا۔

"بھائی چھوٹے نہیں، تم سے چار سال بڑے ہیں۔"

سجاد نے جھک کر مریم کو گود میں اٹھا لیا۔ "گڑیا.... بیٹا.... تم ہماری طرح اسکول جایا کرو.... ہمارے ساتھ۔ دیکھو، ہم جاتے ہیں۔ اسکول کا گیٹ دیکھتے ہیں اور واپس آ جاتے ہیں۔ ایسے ہی تم بھی کرنا۔"

"تھیت ہے ابو۔"

اسی وقت کمرے کی طرف سے راشد نمودار ہوا۔ "ابو.... میں تیار ہو گیا۔" اس کی نظر سجاد کی گود میں لدی مریم پر پڑی تو وہ بھڑک کر بولا۔ "اتاریں اس چڑیل کو۔"

"چڑیل نہیں، یہ تو میری پری ہے۔" سجاد نے کہا۔ "اور میرے ساتھ اسکول جا رہی ہے۔"

"ہنہ.... بڑی آئی اسکول جانے والی۔ جاہل ہے۔ اسے تو الف ب بھی نہیں آتی۔"

"جاہل نہیں، ہاں ان پڑھ ہے ابھی۔" سجاد نے ہنستے ہوئے تصحیح کی۔ "اور وہ بھی اس لئے کہ ابھی صرف ڈھائی سال کی ہے۔ اگلے سال سے یہ بھی اسکول جانے لگے گی۔ اچھا اب چلو۔"

وہ چلے گئے۔ راشد کو اسکول چھوڑ کر وہ واپس آیا تو مریم اس کے کندھے پر

چڑھی ہوئی تھی۔ "چلیے۔ اب ناشتا کرتے ہیں۔" اس نے مریم کو کندھے سے اتارا۔ مریم کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں، جیسے چندا ماموں اس کی جھولی میں اتر آئے ہوں۔

سجاد نے گود میں اٹھا کر اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ "اب تو خوش ہے میری شہزادی؟"

مریم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کی آنکھوں کی جگمگاہٹ اور بڑھ گئی۔ اور جب سجاد برابر والی کرسی پر بیٹھا تو مریم نے کرسی پر کھڑے ہو کر اس کی پیشانی چوم لی۔ "آپ بہت اچھے ہیں ابو۔"

قدسیہ پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔ "سچ آپ بہت بگاڑتے ہیں بچوں کو۔" اس نے خفگی سے کہا لیکن اس کی آنکھیں کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں۔ سجاد ان آنکھوں کی زبان خوب سمجھتا تھا۔

"بچوں کے سامنے ایسی نظروں سے نہ دیکھا کرو۔" وہ بولا اور قدسیہ جھینپ گئی۔

ناشتا کرتے ہوئے قدسیہ نے کہا۔ "مریم کے جلدی اٹھ جانے سے آج تک کی مرتب زندگی بے ترتیب ہونے سے بچ گئی۔ اب یہ آپ کو تنگ نہیں کرے گی۔"

"یہ خود سے نہیں اٹھی ہے۔ میں نے جگایا ہے اسے۔" سجاد نے کہا۔

"اچھا۔ اور کل جب آپ دفتر لیٹ پہنچے تو کیا ہوا؟"

"میں لیٹ پہنچا ہی نہیں۔ دو شارٹ کٹ لگائے اور اپنی مقرر کردہ تیز رفتاری کی حد سے تجاوز کیا۔ پہنچا میں وقت پر۔"

"گویا زندگی میں خلل آ گیا چند منٹ کو۔" قدسیہ نے شوخی سے کہا۔ "مگر ایک بے قاعدگی تو سرزد ہوئی آپ سے۔ ڈسپلن تو ٹوٹا۔"

"بیگم، بچوں کی خاطر بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور بچے اس معاملے میں اپنی ماں پر گئے ہیں۔ انہیں بھی میرے ڈسپلن سے دشمنی ہے۔"

"بہتان ہے۔ میں تو خود آپ کے ڈسپلن کی پابندی کرتی ہوں۔"

"سو سنار کی تمہاری اور ایک لوہار کی تمہاری۔" سجاد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں۔"

مریم پھر اس کی گود میں لٹک گئی۔ "آپ تو جلدی آئیں ابو۔" اس کے لہجے میں

شوخی اور شرارت تھی۔
قدسیہ نے جلدی سے اسے گود میں لے لیا۔ "تم ابو کو تنگ کرتی ہو گڑیا؟" اس نے مریم کا رخسار چومتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں تو۔" مریم نے نفی میں سرہلاتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا۔
قدسیہ مریم کو گود میں لئے پورچ تک آئی۔ سجاد کار میں بیٹھنے لگا تو اس نے پوچھا "شام کو جلدی آئیں گے نا؟"
سجاد نے اثبات میں سرہلا دیا۔

○

کار کو گیٹ سے گزارتے ہوئے سجاد نے سر گھما کر دیکھا۔ بیوی اور بیٹی دونوں ہاتھ ہلا رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ خدا حافظ کہتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے ایک لحے کو گاڑی روکی۔ مریم کا ننھا منا ہاتھ ہلتے دیکھ کر اس کے دل میں عجیب سی خوشی مچلنے لگی۔ زندگی کس قدر خوب صورت تحفہ ہے خدا کا۔ اس نے بے حد سرشار ہو کر سوچا۔ پھر اس نے جواباً ہاتھ ہلایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

تمام راستے پرسکون انداز میں، مخصوص رفتار سے ڈرائیو کرتے ہوئے وہ بڑی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ بہت سرشار تھا وہ۔ خوشگوار ازدواجی زندگی کتنی بڑی نعمت ہے۔ محبت کرنے والی بیوی... پیارے پیارے بچے اور پرسکون گھر۔ اور کیا چاہئے آدمی کو۔ اس کا دل شکر گزاری سے معمور ہو کر چھلک اٹھا۔

لیکن دفتر والی بلڈنگ میں قدم رکھتے ہی وہ یکسر بدل گیا۔ اب اس کے چہرے پر متانت اور سنجیدگی تھی۔ آفس میں داخل ہونے کے بعد لوگوں کے سلام کا جواب دیتا ہوا وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتا رہا۔ آؤٹر روم میں اس کی سکریٹری لوسی اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لگاوٹ بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری۔ "گڈ مارننگ سر۔" لگاوٹ اس کے لہجے میں بھی تھی۔

"مارننگ۔" سجاد نے خشک لہجے میں کہا اور اسے دیکھے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے بیٹھے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ "کم ان پلیز۔" اس نے پکارا۔

بھی بن سکتی ہوں۔"
سجاد نے بڑی کڑی نگاہوں سے اسے گھورا۔ "وائف وائف ہوتی ہے۔ یا ہوتی ہے یا نہیں ہوتی ہے۔ وہ کوئی چکن یا کھانے کی پلیٹ نہیں ہوتی کہ کہہ دیا کہ کوارٹر لے آؤ یا ہاف لے آؤ۔"
"سوری سر۔" لوسی کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ پڑا۔
"اور اس کے لئے تمہیں یہ جاب چھوڑ کر کسی ڈھنگ کے دفتر میں جاب تلاش کرنا ہوگی۔" سجاد نے سرد لہجے میں کہا۔
مگر وہاں محبت نہیں ہوگی۔ لوسی نے دل میں کہا۔ مگر باس سے کچھ اور کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا سر۔ وہ آپ نے اتنا آل آف سڈن پوچھا....."
"خیر.... کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں' جن کے سامنے لاکھوں کیا' کروڑوں کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ اچھا یہ بتاؤ' اپائنٹ منٹ کس وقت کا ہے؟"
"دو بجے کا سر۔" لوسی نے خطرہ ٹل جانے پر سکون کی سانس لی۔
"میں رحمان صاحب سے بات کروں گا۔ وہ دیکھ لیں گے۔ اور کچھ۔"
"اور کچھ ضروری خط ہیں سر۔ آپ نے کہا تھا' آج ڈکٹیشن دیں گے۔"
"ممکن ہوا تو میں مشین پر ریکارڈ کر دوں گا۔ نہیں تو کل دیکھا جائے گا۔ اب جاؤ۔" سجاد نے کہا۔ "اور ہاں' میں کوئی کال بھی ریسیو نہیں کروں گا۔"
کمرے سے نکل کر دروازہ بند کرتے ہی لوسی نے ہاتھ کی چیزیں میز پر پٹخیں اور ہینڈ بیگ سے رومال نکال کر چہرے کا پسینہ پونچھنے لگی۔ کیسا اندھا باس ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔ کاش اتنا ہینڈ سم نہ ہوتا۔ اور ہینڈ سم تھا تو اتنا پتھر دل نہ ہوتا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ یہ پتھر پگھلتا بھی ہے۔ بلکہ آج پگھلا ہوا ہے۔ بیوی سے بے وفائی کرنے والا ہے۔ وہ اس خوش نصیب کے بارے میں سوچنے لگی' جس کے لئے باس کا دل پگھلتا ہے۔ لاکھوں کے نقصان کی پرواہ بھی نہیں کرتا۔
کیا وہ میں نہیں ہو سکتی؟ اس نے حسرت سے سوچا۔

○

ہمیشہ کی طرح اس روز بھی سجاد کی عجیب کیفیت تھی۔ ایک عجیب سا اضطراب تھا۔

ان خوف تھا۔ کچھ خدشے تھے۔ مگر ان سب سے بالاتر ایک ہیجان تھا' جو اس کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔ عام طور پر آدمی کی یہ کیفیت ٹین ایج میں ہوتی ہے' جب کوئی محبت کی منہ زور ندی اسے حقیر تنکے کی طرح بہائے لئے جا رہی ہو۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ صرف سوا نو بجے تھے۔ اس کا ہاتھ اضطراری طور پر ڈائریکٹ لائن والے ٹیلی فون کی طرف بڑھا مگر اس نے اسے روک لیا۔ ابھی یہ مناسب نہیں تھا۔ اس نے سوچا' اتنی دیر کچھ کام ہی نمٹا لیا جائے۔

اس نے میز پر رکھی فائلیں اپنی طرف گھسیٹ لیں۔ اوپر والی فائل کھول کر اس نے کاغذات کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن اس وقت وہ اس کے لئے بے معنی تھے۔ ساری معنویت تو اس مسکراتے ہوئے حسین چہرے میں تھی' جو ان کاغذات کے نیچے سے جھانک رہا تھا۔ ان آنکھوں میں تھی جو اپنے اندر بلاوے سجائے اسے اشارے کر رہی تھیں۔۔۔ پکار رہی تھیں۔

اس کا ہاتھ پھر ٹیلی فون کی طرف بڑھنے لگا لیکن اس نے فوراً ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ بے صبرا پن اور جلد بازی اچھی نہیں۔ اس نے ہمیشہ کی طرح خود کو سمجھایا۔ احتیاط بہت ضروری ہے۔

اور احتیاط واقعی بہت ضروری تھی۔ وہ جلتی پر تیل کا کام کرتی تھی۔ وجود میں ایسا ہیجان اٹھاتی۔۔۔ ایسی سنسنی جگاتی تھی کہ لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔ بے قراری حد سے نہ گزر جائے تو جلنے کا کیا مزہ۔ اس نے جان لیا تھا کہ محبت کا مزہ تبھی ہے' جب وجود میں دھیمی دھیمی آگ ہر وقت جلتی رہے۔

اس نے فائلیں پیچھے دھکیل دیں۔ اس وقت وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ہاں خطوط نمٹانے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ اس نے خطوط اٹھائے اور اپنی توجہ کام پر مرکوز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دشواری تو ہوئی مگر جیسے تیسے خطوط پڑھ کر اس نے فائلوں کی کے لئے ہدایتی نوٹ لکھے۔ جواب طلب خطوط اس نے ایک طرف رکھ دیئے۔ اس وقت وہ جواب لکھوانے کے قابل ہی نہیں تھا۔ اس نے جواب طلب خطوط کو گزشتہ روز کے خطوط کے ساتھ رکھ دیا۔

اس دوران میں وہ بار بار بے تابی سے گھڑی کو دیکھتا رہا تھا۔ سوئیوں کی حرکت

اتنی ست تھی کہ اسے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ وقت کا بھی عجیب مزاج ہے۔ بس آدمی کو ستاتا ہے....tease کرتا ہے۔ انتظار ہو تو گزرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اور بے خودی ہو تو یوں گزرتا ہے کہ گھڑی ایک پل کی بھی نہیں رہتی۔

اضطراب تھا کہ بپھرے ہوئے سمندر کی طرح اسے اچھالتا ہوا بہائے لئے جا رہا تھا۔

اس نے بزر دے کر لوسی کو بلایا اور نوٹ لکھے ہوئے خطوط اس کے حوالے کر دیئے۔ پھر "بے کار مباش کچھ کیا کر" کے مصداق ایک فائل لے کر بیٹھ گیا۔ لیکن اس کی نظریں کاغذات کے نیچے سے جھانکتے ہوئے اسی چہرے میں الجھی رہیں۔ وقتاً" فوقتاً" بے تاب نظریں گھڑی کی طرف اٹھتیں۔

بالآخر دس بج گئے۔ اس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ پانچ منٹ اور انتظار کر لیا جائے۔ احتیاط کے بڑے فائدے ہیں اور وہ تھا بھی محتاط آدمی۔

لیکن دس بج کر پانچ منٹ تک وہ ٹائم بم کی طرح ہو گیا۔ اب ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوتی تو وہ دھماکے سے پھٹ جاتا۔ اس نے ڈائریکٹ لائن والا ٹیلی فون اپنی طرف کھینچا' ریسیور اٹھایا اور وہ نمبر ڈائل کرنے لگا' جو اس کے دل پر نقش تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں.... اب کوچہ جاناں آتا ہے' اب کوچہ جاناں آتا ہے۔

پھر دل کو قرار آ گیا۔ دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔ "ہیلو؟" جانی پہچانی مترنم آواز سنائی دی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح یہ خاص کال ریسیو کرتے وقت اس آواز کی کھنک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے وہ دلکش سراپا لہرا گیا.... پھولوں سے لدی ہوئی وہ نرم و نازک شاخ۔ "سیماب!" اس نے چھلکتی آواز میں پکارا۔ یہ نام وہ جب بھی پکارتا' نوک زباں پر ہر بار ایک نیا ذائقہ محسوس ہوتا۔ ہر بار سانسوں میں ایک نئی خوشبو ہلکورے لینے لگتی۔ "میں سجاد بول رہا ہوں۔" ذرا توقف کے بعد اس نے مزید کہا۔

"جیسے میں تمہاری آواز پہچانتی نہیں۔" سیماب نے چوٹ کرنے والے انداز میں کہا۔

ہر بار گفتگو اسی انداز میں شروع ہوتی تھی۔ ہر بار یسماب کا یہ جملہ اسے ایک بہت بڑے اعزاز کا احساس دلاتا تھا۔ جیسے وہ کچھ اور معتبر ہو گیا ہو۔ "یسماب.... آج آ رہی ہو نا؟" اس کے لہجے میں بے تابی تھی.... مچلتی ہوئی آرزوئیں تھیں۔ یسماب کا جواب بھی اسے معلوم تھا۔ ہاں عذر ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے تھے۔

"اوہ سجاد۔ نہیں بھئی، آج تو مشکل ہے۔" دوسری طرف سے یسماب نے کہا۔

"کیا مشکل ہے؟" وہ جھنجلا گیا۔

"تم بھول جاتے ہو کہ مجھے بچوں کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ انہیں اس طرح چھوڑ کر آنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"انہیں چند گھنٹوں کے لئے آیا کے پاس چھوڑنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔" اس نے دلیل دی۔

"نہیں سجاد۔ آج میرا آنا مشکل ہے۔ کچھ ضروری کام بھی ہیں۔"

"یسماب.... پلیز یسماب۔" وہ بری طرح گڑگڑانے لگا۔

"بچوں کی طرح ضد نہ کیا کرو۔" یسماب کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"دیکھو یسماب.... تمہیں میری قسم۔ تمہیں آنا پڑے گا۔ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔"

"نہیں.... تمہاری قسم کی تو اتنی اہمیت نہیں۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔"

"سنو یسماب.... تمہیں آنا ہی ہو گا۔" وہ اچانک ہی بپھر گیا۔

"کیوں؟ نہیں آئی تو تم کیا کر لو گے؟" یسماب کے لہجے میں چیلنج تھا۔

"میں.... میں...." وہ سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی.... وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ لیکن وہ یسماب کو جانتا تھا۔ اس کے سامنے کمزوری دکھانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ایسی ہی لڑکی تھی۔ آپ اس کے رستے میں بچھ جائیے تو یا تو وہ آپ کی طرف دیکھے بغیر راستہ بدل کر چلی جائے گی یا آپ کے اوپر قدم رکھتی ہوئی یوں گزر جائے گی، جیسے آپ ہموار زمین ہوں۔ ایسی ہی انانیت تھی اس میں۔ اور وہ دوسروں میں بھی انانیت تلاش کرتی تھی۔

ذرا دیر سوچنے کے بعد سجاد نے راستہ نکالا۔ "میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر تم آج نہ آئیں تو آئندہ تم سے کبھی نہیں ملوں گا۔"

"بکتے ہو تم۔ مجھ سے نہیں ملو گے تو تمہارا گزارہ کیسے ہو گا۔"

اب کے سجاد بری طرح بھڑک گیا۔ "میری سکریٹری لوسی کو دیکھا ہے تم نے' وہ میرے ایک اشارے کی منتظر ہے۔ سمجھیں کچھ؟"

ریسیور پر چند لمحے خاموشی رہی۔ یقیناً وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اور یہ اچھی علامت تھی۔ پھر بھی سجاد کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ امید و بیم کی کیفیت میں ریسیور ہاتھ میں تھامے' کانوں سے لگائے بیٹھا تھا۔

"ٹھیک ہے سجاد۔" بالآخر ریسیور پر سیماب کی آواز ابھری۔ "میں آ جاؤں گی۔ لیکن ڈیئر' ذرا وقفوں کا بھی خیال رکھو۔ میرا خیال ہے' ہم اوور پلے کر رہے ہیں۔ اتنی جلدی جلدی ملنا تو کوئی اچھی بات نہیں۔ کسی نے دیکھ لیا تو؟"

سجاد کو اس کی نصیحتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ پھر وہ بولا تو اس کی آواز بھی مسرت اور سنسنی کے بوجھ سے لرز رہی تھی.... "تو پھر تم آ رہی ہو نا؟"

"ہاں۔ لیکن کب اور کہاں؟"

"ایک بجے سبحانی چوک سے میں تمہیں پک کر لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔"

دوسری طرف ریسیور رکھ دیا گیا۔ سجاد چند لمحے ریسیور ہاتھ میں تھامے بت بنا بیٹھا رہا۔ ہیجان پہلے سے سوار ہو گیا تھا۔ سنسنی موج در موج جسم کی دیواروں سے سر ٹکراتی پھر رہی تھی۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اب بھی ایک مسئلہ تھا۔ اسے ڈھائی گھنٹے گزارنے تھے۔ پہاڑ جیسے ڈھائی گھنٹے۔ کاش..... کاش وہ اس سے گیارہ بجے مل سکتا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ اسی لئے اس نے خود ایک بجے کا وقت طے کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو اسکول سے خود واپس لاتی ہے اور یہ وہ معمول تھا' جسے وہ اس کی ناراضی کی قیمت پر بھی نہیں ٹال سکتی تھی۔

چند لمحے وہ یونہی بیٹھا رہا۔ انٹر کام پر لوسی کو ہدایت دی کہ وہ رحمان صاحب کو

اس کے پاس بھیج دے۔ دو منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی اور رحمان صاحب اندر آ گئے۔ وہ فواد اینڈ سن کے جنرل منیجر تھے۔ ان کی عمر 45 برس کے قریب تھی۔

"تشریف رکھیے۔" سجاد نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

رحمان صاحب بیٹھ گئے اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"مجھے آج ایک ضروری کام سے جانا ہے.... ساڑھے بارہ بجے۔" سجاد نے کہا۔

رحمان صاحب کے ہونٹوں پر ایک ثانئے کے لئے معنی خیز مسکراہٹ ابھری اور فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

"اور دو بجے ایک اہم میٹنگ تھی میری۔" سجاد نے مزید کہا۔ "فرحان ایسوسی ایٹس والوں سے؟"

"جی ہاں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ لاکھوں کا کانٹریکٹ ہے۔ اب آپ ہی ان سے ڈیل کرلیں۔ آپ کے لئے اس ڈیل میں تین اضافی بونس ہیں۔"

"لیکن جناب' آپ کی بات اور ہے۔ آپ زیادہ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون سی شرائط۔"

سجاد نے ان کی بات کاٹ دی۔ "میں آپ کو مکمل اختیار دے رہا ہوں۔ ویسے بھی آپ جنرل منیجر ہیں۔"

"جی بہتر۔ میں ڈیل کرلوں گا انشاء اللہ۔ اور کوشش کروں گا کہ آپ کی توقع پر پورا اتروں۔"

"جاتے وقت اس ڈیل کی فائل مس لوسی سے لے لیجئے گا۔ اس میں میرے ریمارکس اور نوٹ بھی ہیں۔ گڈ لک۔"

رحمان صاحب چلے گئے۔ ان کی معنی خیز مسکراہٹ اس کی نظروں سے چھپی نہیں رہی تھی۔ شروع میں اس طرح کی مسکراہٹ اسے بے حد توہین آمیز لگتی تھی۔ لیکن اب وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔ رحمان صاحب کیا' دفتر کے سبھی لوگ جانتے تھے کہ ہفتہ دس دن میں ایک بار اس کی غیر نصابی سرگرمیوں کا دن آتا ہے۔ وہ دن مقرر نہیں تھا۔ تھوڑا برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو اسے خود بھی علم نہیں ہوتا تھا کہ یہ پروگرام کب بنے گا۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بج کر بائیس منٹ ہوئے تھے۔ گویا اسے ابھی دو گھنٹے سے کچھ زائد وقت گزارنا تھا۔ اس نے بڑی بیزاری سے سامنے رکھی فائل کھول لی۔ لیکن فائل سے اسے سروکار نہیں تھا۔ وہ سیماب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
جب وہ پہلی بار سیماب سے ملا تو وہ سات سال کی تھی اور وہ خود نو سال کا تھا...

○

رافعہ خالہ پانچ سال بعد یو کے سے واپس آئی تھیں۔ وہ امی اور ابو کے ساتھ ان کے گھر گیا تھا۔ ان کے اور اپنے بنگلے میں ویسے تو کوئی فرق نہیں تھا مگر وہاں سوئمنگ پول دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ امی اور ابو کے بھی یہی تاثرات تھے۔
خالہ نے ان کے تاثرات دیکھ کر وضاحت کی۔ "افسر تو بس مچھلی ہیں.... مچھلی۔ پانی کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ سوئمنگ پول کے بغیر گھر مکمل ہی نہیں ہوتا ان کا۔"
اتنی بات ہوئی تھی کہ سیماب وہاں سے کھسک گئی۔ چند منٹ بعد پانی میں چھپاکے کی آواز سن کر وہ سب چونکے تو پتہ چلا کہ وہ سوئمنگ سوٹ پہنے پیراکی کے جوہر دکھا رہی ہے۔ یہ اسے گوارا نہیں تھا کہ پاپا کی تعریف کی جائے اور اس کے متعلق بتایا ہی نہ جائے۔
خالہ نے بھی یہی بات کہی۔ "میں نے اپنی جل پری کی تعریف نہیں کی تھی نا۔" وہ بولیں۔ "اب یہ عملی مظاہرہ کر کے دکھا رہی ہے۔"
سجاد پانی میں اس کے کرتب دیکھ کر اش اش کرتا رہا۔ وہ اسے بہت اچھی لگی۔ اسی لمحے وہ اس کے دل میں کھب گئی۔ حالانکہ وہ اس وقت محبت کا مفہوم بھی نہیں سمجھتا تھا۔
"بڑی زبردست ہے میری بیٹی۔" افسر خالو نے فخر سے کہا۔
"اس کے زبردست ہونے سے ہی ڈر لگتا ہے مجھے۔" خالہ زیر لب بولیں۔
یہ اس زبردست سے پہلا تعارف تھا اس کا۔ خالہ اور امی میں بڑی محبت تھی۔ آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ کبھی وہ آجاتیں اور کبھی یہ لوگ چلے جاتے۔ سیماب کے ساتھ سجاد کی اچھی گھٹنے لگی تھی۔
اس روز وہ خالہ کے ہاں گیا ہوا تھا اور اس وقت سوئمنگ پول کے پاس کھڑا تھا۔

پول اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس پر سحر سا طاری ہو جاتا تھا۔ پانی کے باہر رہ کر پانی اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن پانی کے اندر جانے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پانی کی قربت سے اسے خوف آتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ایک دن ساحل سمندر پر وہ ابو کا ہاتھ تھامے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑا تھا کہ ایک اونچی موج سر کے اوپر سے گزر گئی۔ اس لمحے کی گھبراہٹ وہ کبھی نہیں بھولا۔ پانی کے اندر اندھیرا تھا۔ اس نے گھبرا کر چیخنے کی کوشش کی تو منہ اور ناک میں بہت سارا پانی چلا گیا۔ اس وقت تو اسے پتہ نہیں چلا مگر بعد میں بہت دیر تک جلن ہوتی رہی۔۔۔ جی متلاتا رہا۔ موج اتری تو وہ ہاتھ چھڑا کر پیچھے ریت کی طرف بھاگا۔ ابو کہتے رہے کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ مگر وہ دیکھ چکا تھا کہ ڈرنے کی بات ہے۔ اس دن سے اس کے دل میں پانی کا ڈر بیٹھ گیا۔

وہ پول کے پاس کھڑا تھا کہ سیماب آ گئی۔ "تمہیں بھی پانی بہت اچھا لگتا ہے؟" اس نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ بہت اچھا۔" اس نے جواب دیا۔

"ہمارا پول خوب صورت ہے نا؟"

"بہت خوب صورت ہے۔"

"تو تم تیرتے کیوں نہیں؟"

سجاد جھرجھری لے کر رہ گیا "مجھے تیرنا نہیں آتا۔"

"جو تیر نہیں سکتا وہ زندگی کا لطف بھی نہیں اٹھا سکتا۔"

سجاد نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ یہ جملہ اس نے خالو جان کے منہ سے سنا تھا مگر سیماب کے منہ سے وہ بہت بڑا لگ رہا تھا۔

"تو تم تیرنا سیکھ لو۔" سیماب نے کہا۔

"نہیں سیکھ سکتا۔" سجاد بے بسی سے بولا۔

"کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ میں سکھا دوں گی۔"

"مجھے پانی کے اندر جانے سے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے!" وہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسنے لگی۔ "پانی اچھا لگتا ہے اور پانی سے ڈر بھی لگتا ہے۔ یہ تو بے وقوفی کی بات۔"

سجاد کو طرارہ آگیا۔ "سانپ بہت خوب صورت لگتے ہیں۔ لیکن سانپوں سے کھیلتا تو کوئی نہیں۔"

"مجھے سانپ خوب صورت لگیں گے تو میں ان سے ہرگز نہیں ڈروں گی۔ میں تو ان سے کھیلوں گی۔" سیماب نے ایک پل جھجکے بغیر کہا۔

"کہنے کی بات ہے۔ سانپ کو اپنے قریب دیکھ کر دم نکل جائے گا۔" سجاد کے لہجے میں حقارت تھی۔

سیماب نے اسے بہت غور سے دیکھا پھر بولی۔ "یہیں رکو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

سجاد وہیں کھڑا پول میں ہلکورے لیتے پانی کو سحر زدہ سا تکتا رہا۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ سیماب کب گئی اور کب واپس آئی۔ اسے تو ہلکا سا دھکا لگنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ اس کی محویت تو اس وقت ٹوٹی، جب اس نے خود کو پانی میں پایا۔ دو ڈبکیاں لگتے ہی اس نے چلانا شروع کر دیا۔

پھر اسے لگر پر کھڑی سیماب نظر آئی۔ نظر کیا آئی... ایک لمحے کو اس کی نظر سے گزری۔ کیونکہ وہ اس وقت نظر جما کر کچھ دیکھنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ سیماب کھڑی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں دلچسپی بھی تھی اور ملامت بھی۔ "اے.... یوں سینے کے بل لیٹو اور ہاتھ چلاؤ.... اور پاؤں سے پانی کو دھکیلو یوں...." اس نے مظاہرہ کر کے دکھایا۔

"نہیں.... میں ڈوب رہا ہوں..... میں مر جاؤں گا۔" سجاد بری طرح چلا رہا تھا۔ وہ کچھ سننے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔

"تم بزدل بھی ہو اور احمق بھی۔" سیماب نے سخت لہجے میں کہا۔

سجاد بدستور چلاتا رہا۔ اسے نہ کچھ سنائی دے رہا تھا نہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سیماب کے ہاتھ میں وہ رنگین ٹیوب بھی نہیں دیکھی تھی، جس میں ہوا بھری ہوئی تھی۔ سیماب نے وہ ٹیوب اس کی طرف اچھال دی۔ "لو اسے پکڑ لو۔ اب ڈوبو گے نہیں۔ بزدل۔"

اس لمحے سجاد کو نہ اس کی حقارت کا احساس تھا نہ اپنی توہین کا۔ اس کے چھوٹے سے ذہن کے نزدیک مسئلہ اس کی بقا کا تھا۔ اس نے جلدی سے ٹیوب کو جھپٹ لیا۔

ٹیوب کو تھام کر پانی کی سطح پر رہتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ پول سے کیسے نکلے۔ اس کے ہاتھ پاؤں مارنے کی وجہ سے پانی متلاطم ہو گیا تھا۔ وہ جب بھی مگر ایک ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کرتا' متلاطم پانی اسے پیچھے دھکیل دیتا۔ ٹیوب کو چھوڑنے کا خطرہ تو وہ مول لے ہی نہیں سکتا تھا۔

"نکلتے کیوں ہو۔ اب ٹیوب پکڑ کر تیرنا سیکھو۔" سیماب نے کہا۔

وہ ہدایات دیتی رہی اور وہ عمل کرتا رہا۔ لطف بھی آنے لگا اور خود اعتمادی بھی پیدا ہونے لگی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ ٹیوب چھوٹی... پتلی ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا پھر وہ چلایا۔ "اس کی ہوا نکل رہی ہے۔" اور یہ کہتے کہتے ٹیوب چھلکا سی ہو گئی اور وہ ڈبکیاں کھانے لگا۔ اس کے حلق سے چیخیں نکل رہی تھیں۔

"اب تم تیرنا سیکھ چکے ہو۔ تیرو نا۔" سیماب نے کہا۔

"مجھے نہیں آتا۔" اس نے بمشکل کہا۔

"اچھا... پانی کے اندر چیخنا مت۔ سانس روک لینا۔ کچھ بھی نہیں ہو گا تمہیں۔" سیماب نے اسے دلاسا دیا۔

لیکن اب کے وہ پانی میں زیادہ دیر رہا تو سیماب گھبرا گئی۔ وہ چلانے لگی "پاپا... پاپا... جلدی آئیں۔ سجاد ڈوب رہا ہے۔"

مگر شاید گھر تک آواز نہیں سنی گئی۔ یا تمام بڑے باتوں میں منہمک تھے۔ کسی نے سنا نہیں۔ اب تو سجاد چلانا بھی بھول گیا تھا۔ سیماب بھی پریشان ہوئی۔ وہ پانی میں کودی اور تیرتی ہوئی اس کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ ڈبکی کھا کر ابھرا تو سیماب نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ہاتھ پاؤں نہیں چلاؤ۔ خود کو ڈھیلا چھوڑ دو۔"

جیسے تیسے وہ اسے اوپر لے آئی۔ خود باہر نکل کر اس نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اسی وقت اندر سے سب لوگ نکل آئے۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" خالو جان نے کہا۔

"سجاد پانی میں گر گیا تھا۔ میں نے اسے نکالا ہے۔" سیماب نے کہا۔ سجاد تو کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں تھا۔

"میری بہادر بیٹی۔" خالو نے بے حد فخر سے کہا۔

بعد میں سجاد اس بارے میں سوچتا تو متضاد جذبات کا شکار ہو جاتا۔ کبھی اسے غصہ آتا اور کبھی پیار۔ احسان مندی کا جذبہ امنڈ آتا کہ سیماب نے اسے مرنے سے بچایا۔ مگر پھر غصہ آتا کہ موت کے منہ میں دھکا بھی تو اسی نے دیا تھا۔ وہ مرعوب بھی ہوا۔ سیماب اس سے چھوٹی تھی پھر بھی اس نے خود اس کی مدد کی۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو مدد لینے کے لئے گھر کی طرف بھاگتی اور اتنی دیر میں وہ ڈوب جاتا۔

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سجاد نے پیراکی سیکھ لی۔

دو ہفتے بعد وہ لوگ پھر خالہ کے ہاں گئی۔ ذرا دیر بعد سیماب نے کہا۔ "سجاد.... ادھر آؤ۔ میں تمہیں کچھ دکھاؤں گی۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اوپری منزل کے بڑے کمرے میں لے گئی۔ وہاں اس نے اسے شیشے کے چند بڑے کیسوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ سجاد نے حیرت سے اسے دیکھا۔ شیشے کے ہر کیس میں ایک سانپ موجود تھا۔

"کیسے لگے؟" سیماب نے پوچھا۔

"سچ مچ کے ہیں؟" سجاد نے پوچھا۔

"تو اور کیا۔ ربڑ کے ہوتے تو یہ گھر کیوں بنواتے ان کے لئے۔" سیماب نے کہا پھر پوچھا "کیسے ہیں؟ خوب صورت ہیں نا؟"

"ہاں، بہت خوبصورت ہیں۔ اب خود ہی دیکھ لو، اچھے اور خوب صورت لگنے کے باوجود ان سے کھیل تو نہیں سکتے ہم۔"

"کیوں نہیں۔ میرا تو جب جی چاہتا ہے، ان سے کھیلتی ہوں۔"

"جھوٹی۔" سجاد نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

سیماب نے برا نہیں مانا۔ کبھی کبھی سجاد کو وہ خود سے بڑی لگتی تھی۔ بڑے تضادات تھے اس میں اور وہ کم عمر ہونے کے باوجود انہیں سمجھتا اور ان کے بارے میں الجھتا تھا۔ مثلاً وہ بہت اتھلی بھی تھی اور بہت گہری بھی۔ بہت انا پرست بھی تھی اور کبھی بڑی سے بڑی توہین کو بھی پی جاتی تھی۔ کچھ بھی تھا، اس کی کشش اس کے لئے ناقابل تردید تھی۔ وہ اس کی طرف یوں کھنچتا تھا، جیسے لوہا مقناطیس کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔

"تمہیں ان میں سے کون سا اچھا لگتا ہے؟" سیماب نے اس سے پوچھا۔
اب اس نے انہیں غور سے دیکھا۔ وہاں چار کیس تھے اور چار سانپ تھے۔ ان کے رنگ' ان کی کھالوں کے ڈیزائن بلاشبہ بہت پرکشش تھے۔ "چاروں ہی خوب صورت ہیں۔" وہ بولا۔

"سب سے اچھا کون سا لگ رہا ہے؟"
ذرا غور کرنے کے بعد سجاد نے ایک کیس کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں جو سانپ تھا' وہ سرخ رنگ کا تھا اور جابجا سیاہ دائرے بنے تھے۔

"تو اس سے کھیلو۔"
"دماغ خراب ہو گیا ہے۔" سجاد بری طرح بھڑکا۔
"چلو۔۔ دونوں مل کر اس سے کھیلتے ہیں۔ مجھے بھی یہ بہت اچھا لگتا ہے۔" یہ کہہ کر سیماب نے شیشہ سرکایا اور ہاتھ بڑھا کر اس سانپ کو پکڑ لیا۔ سجاد کی تو گھگھی بندھ گئی۔ وہ بت بن کر رہ گیا۔ لیکن جب سیماب سانپ کو لئے اس کی طرف بڑھی اور قریب پہنچ کر سانپ کو اس کی طرف بڑھایا تو وہ دہشت سے چلایا اور اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ سیماب سانپ لئے ہوئے اس کے پیچھے تھی۔ اور اسے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ چیختا ہوا اوپر کمروں میں چکر لگاتا رہا۔ اتفاق سے زینے نظر آئے تو وہ نیچے اترا۔ ڈرائنگ روم میں سب لوگ موجود تھے۔ وہاں بھی وہ اس حال میں پہنچے کہ وہ آگے آگے تھا اور سیماب پیچھے پیچھے۔
امی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "کیا ہوا؟" انہوں نے اسے پوچھا۔ وہ ان سے لپٹ گیا۔ اسی وقت امی کی نظر سانپ پر پڑی اور وہ بھی چیخنے لگیں۔
خالو جان بیٹھے ہنستے رہے۔ ان کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا۔ "اس سانپ سے ڈر رہے ہو سجاد بیٹے۔" انہوں نے شفقت سے کہا۔ "ارے میاں' یہ تو بے ضرر ہے۔ بے ضرر نہ ہوتا تو یہ سیماب اسے ہاتھ لگا سکتی تھی۔"
سجاد کی سمجھ میں بھی بات آ گئی۔ یہ بات تو اسے بھی سوچنی چاہئے تھی۔ لیکن اس نے نہیں سوچی۔ چھوٹا ہونے کے باوجود اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اس پر سیماب کا رعب پوری طرح بیٹھ چکا ہے۔ اس حد تک کہ اس کے خیال میں وہ ہر

ناممکن کام بھی کر سکتی ہے۔

لیکن اتنے خطرناک تجربوں کے باوجود وہ اس سے بھاگا نہیں بلکہ اس کی طرف اور زیادہ کھچا۔ دونوں طرف سے آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ اس کے باوجود کبھی امی اور ابو کو اس کی ضد کی وجہ سے بھی خالہ کی طرف جانا پڑتا تھا۔

ایک مہینے میں وہ دونوں بہت قریب ہو گئے۔ وہ عجیب بچی تھی۔ ایک طرف لڑکیوں کی طرح نرم و نازک.... گڑیوں سے کھیلنے والی.... بات بات پہ رونے والی۔ دوسری طرف لڑکوں سے زیادہ سخت۔ کرکٹ کھیلنے کو وہ تیار' زور آزمائی پر بھی آمادہ۔ دونوں میں لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔ سیماب ضدی بھی بہت تھی۔ جبکہ سجاد بہت صلح جو اور امن پسند تھا۔ مگر جب ضد کرتا تو کسی قیمت پر پیچھے نہ ہٹتا۔ دونوں میں لڑائی ہوتی تو 100 میں سے 99 مرتبہ وہی صلح کرتا.... اسے مناتا۔ لیکن ایک بار ایسا ہوتا تو وہ ڈٹ جاتا۔ تب سیماب ہی اسے مناتی۔

"میں ایسی ہوں نہیں۔" ایک دن اس نے سجاد سے کہا۔ "میں کسی کو مناتی وناتی نہیں۔ مجھے پرواہ نہیں ہوتی' کوئی روٹھتا ہے تو روٹھے۔"

"تو مجھے کیوں مناتی ہو۔" سجاد نے کہا۔

"پتا نہیں کیوں۔ تم مجھے پورے نہیں لگتے۔ پھر بھی۔ تم میں کوئی کمی ہے۔"

سجاد نے سوچا' مجھے اس میں کوئی چیز زیادہ لگتی ہے۔ اسے مجھ میں کوئی چیز کم لگتی ہے "کیا کمی ہے' بتاؤ۔"

سیماب کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "بہادری کی.... تم ڈرپوک ہو۔"

سجاد کی سمجھ میں آ گیا۔ سیماب میں بہادری کی زیادتی تھی۔

دو ماہ بعد سیماب والدین کے ساتھ لندن واپس چلی گئی۔ تب سجاد کو پتا چلا کہ وہ اسے کتنی اچھی لگتی تھی۔ وہ اسے بہت یاد کرتا تھا۔ اسکول کی کلاسیں بدلتی رہیں' زندگی گزرتی رہی۔ وہ بڑھتا رہا۔ لیکن ایک بہت بڑی کمی کے احساس کے ساتھ جیسے وہ نامکمل ہو۔ کوئی بھی دوست سیماب کے چھوڑے ہوئے اس خلا کو نہیں بھر سکا تھا۔ اس نے کم عمری میں ہی ساتھی کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔

ٹرن.... ٹرن.... ٹرن....

بچاریوں چونکا جیسے کسی نے اسے جھنجوڑ دیا ہو۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ مگر ٹیلی فون کی گھنٹی کی بھی یہ عجب خاصیت ہے۔ بولنا شروع کرتی ہے تو کسی طرح چپ ہی نہیں ہوتی۔۔۔ جب تک کہ ٹیلی فون اٹینڈ نہ کر لو۔۔۔ عورت کی طرح۔

پھر بھی اس کا ہاتھ فوراً ریسیور کی طرف نہیں بڑھا۔ اسے لوسی پر بری طرح غصہ آیا۔ جب وہ کہہ چکا ہے کہ اسے ہرگز ڈسٹرب نہ کرے۔ تمام اپائنٹ منٹ تک کینسل کر دیے اس نے۔ ایسے میں کوئی کال اندر دینے کا کیا مطلب ہے۔ اسے لوسی کی خبر لینی پڑے گی اچھی طرح۔

مگر پہلا مسئلہ لوسی نہیں تھی' ٹیلی فون کی گھنٹی تھی جو اب بھی بج رہی تھی۔ اس نے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسی لمحے احساس ہوا کہ لوسی کا کوئی قصور نہیں۔ ڈائریکٹ لائن والے ٹیلی فون کا تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔

اس کا ہاتھ ریسیور سے چھوا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ڈائریکٹ لائن! یہ فون کس کا ہو سکتا ہے۔ یہ نمبر تو اس نے زیادہ لوگوں کو دیا بھی نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سیماب کا فون ہو۔ مگر سیماب اب فون کیوں کرے گی؟ ملاقات کینسل کرنے کے لیے۔ اس کے اندر سے ایک آواز نے جواب دیا۔ نہیں' یہ کیسے ممکن ہے؟ سیماب کا معاملہ ہو تو کچھ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ ناممکن کچھ بھی نہیں رہتا۔

تب تو اسے یہ فون ریسیو نہیں کرنا چاہیے۔ نہ وہ فون ریسیو کرے گا' نہ ملاقات خطرے میں پڑے گی۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی کسی ضدی بچے کی طرح۔۔۔ بلکہ سیماب کی طرح اڑی ہوئی تھی۔ مسلسل بجے جا رہی تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق کم از کم پندرہ گھنٹیاں بج چکی تھیں۔ عام طور پر لوگ اتنی کوشش سے پہلے ہی مان لیتے ہیں کہ ان کا مطلوبہ فرد فون ریسیو کرنے کے لیے موجود نہیں ہے مگر یہ گھنٹی اب بھی بج رہی تھی۔ بجے جا رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ سیماب کا ہی فون ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ فون اسے ریسیو کرنا پڑے گا ورنہ گھنٹی بجتی رہے گی۔ سیماب تو پیچھا ہونے والی نہیں۔

ریسیور اٹھانے سے پہلے اس نے اپنی جنگی حکمت عملی مرتب کی۔ اگر سیماب ملاقات منسوخ کرنے کا کہے گی تو وہ کیا کرے گا۔ کیسے اسے مجبور کرے گا۔ کون سے حربے ہیں اس کے پاس....؟ کچھ بھی نہیں، سوائے اس کے کہ آئندہ وہ اس سے کبھی نہیں ملے گا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ یہ کھوکھلی دھمکی ہے۔ یہ اس کے لئے ممکن ہی نہیں۔ اگر سیماب اس پر بھی نہ مانی تو....؟ تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ مگر اس افیئر کی تاریخ گواہ تھی کہ اس دھمکی کے بعد سیماب ہتھیار ڈال دیتی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا کیونکہ گھنٹی ابھی تک نہیں تھکی تھی۔ "یس پلیز.... سجاد اسپیکنگ۔" اس نے باوقار لہجے میں کہا۔

دوسری طرف سے جانی پہچانی آواز سنتے ہی اس کے وجود سے ٹینشن یوں نکل گئی، جیسے غبارے سے ہوا۔ اس نے سکون کی گہری سانس لی۔

"کہاں تھے آپ؟ اتنی دیر سے گھنٹی بج رہی تھی۔ میں تو اب فون رکھنے ہی والی تھی۔"

'تمہیں فون رکھ ہی دینا چاہئے تھا۔' سجاد نے دل ہی دل میں کہا۔ پھر وہ ایک دم پریشان ہو گیا "قدسیہ.... کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟"

"جی ہاں۔ خیریت ہے۔"

"تو پھر اس وقت فون کرنے کا کیا مطلب؟"

"کیوں بھئی.... میں تو کسی بھی وقت فون کر سکتی ہوں آپ کو۔"

"صرف ایمرجنسی میں۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ دفتر میں تو میں ڈسپلن میں ذرا بھی فرق نہیں آنے دیتا۔"

"تو اسے بھی ایمرجنسی سمجھ لیں۔"

"کچھ بتاؤ تو۔"

"آپ کو شاید یاد نہیں، آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔"

"مجھے یاد ہے۔ میں تاریخیں کبھی نہیں بھولتا۔" سجاد جھنجلا گیا۔

"میں نے سوچا، ممکن ہے آپ کو یاد نہ ہو۔ آج شام جلدی آئیں گے نا۔"

"ہاں.... یقیناً۔"

وہ ریسیور رکھنے والا تھا کہ قدسیہ نے کہا۔ "ایک بات اور۔"

"وہ بھی کہہ دو جلدی سے۔ میں بہت مصروف ہوں۔"

"آپ بہت یاد آ رہے تھے۔ آپ کی آواز سننے کو دل چاہ رہا تھا۔"

"جب سامنے ہوتا ہوں تو تمام وقت بولتی رہتی ہو۔ تو پھر آواز سننے کو ترستا ہی ہے۔ آج شام کے بعد سن لینا میری آواز۔"

"کاش۔۔۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اڑ کر آپ تک پہنچ جاتی۔۔۔۔" قدسیہ کی آواز جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"مگر فلائٹ واپس ہو جاتی۔ کیونکہ یہاں لینڈنگ کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ اچھا۔ خدا حافظ۔" سجاد نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اس نے دراز کھول کر سیماب کی فریم شدہ تصویر نکالی اور اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتا رہا۔ بارہا اس کا جی چاہا تھا کہ اس فریم کو میز پر سجا لے۔ لیکن دراز میں چھپا کر رکھی گئی تصویر جو ہیجان جگاتی ہے' وہ میز پر سجی ہوئی تصویر نہیں جگا سکتی۔ اس نے تصویر کو دوبارہ دراز میں رکھ دیا۔ اس کا تصور کسی تصویر کا محتاج نہیں تھا۔ تصویر تو بس سنسنی کے لئے تھی۔

اس کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ آج اس کی شادی کی سالگرہ تھی۔ سچ یہ ہے کہ اسے یہ بات یاد ہی نہیں تھی۔ ورنہ شاید وہ۔۔۔۔ نہیں' سیماب کو تب تو وہ ضرور فون کرتا۔ کیسی تھرلنگ بات ہے۔ شادی کی ساتویں سالگرہ۔۔۔۔ اور بے وفائی۔۔۔۔ تھوڑی سی بے وفائی! اور شام کو بیوی کے ساتھ سیلی بریشن۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ کیسے زندگی میں رنگ ہی رنگ بھر جاتے ہیں۔ خوشی اور سنسنی ایک دوسرے سے لپٹ کر رگوں میں دوڑتی۔۔۔ چیختی چلاتی پھرتی ہیں۔

اس نے سوچا' اٹھ کر' جانے کی تیاری کرے۔ مگر گھڑی دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ دس بج کر تینتیس منٹ۔ صرف گیارہ منٹ گزرے ہیں جب سے۔ اتنا عرصہ زندگی کا دوبارہ جی لیا' اتنی باتیں کر لیں اور اتنا سوچ لیا۔۔۔ صرف گیارہ منٹ! وقت کتنا سست رفتار ہے۔

وہ پھر اسی دلکش چہرے کی کہانی میں کھو گیا!

○

خالہ اور خالو سات سال بعد سیماب کو لے کر پھر پاکستان واپس آئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ سجاد کی مسیں بھیگنے لگی تھیں۔ سیماب کی یادوں کا' اس کی کمی محسوس کرنے کا مفہوم کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سیماب سے ملتے ہوئے اس کے انداز میں جھجک تھی۔

لیکن سیماب کے تو انداز ہی اور تھے۔ وہ تو آتے ہی اس سے لپٹ گئی۔ وہ بوکھلا گیا" ارے.... ارے ہٹو۔ کیا کرتی ہو۔"

"یار اتنے سالوں کے بعد مل رہے ہو۔ اچھی طرح ملو۔" وہ اور چپک گئی۔

سجاد نے گھبرا کر خالہ اور خالو کو دیکھا۔ خالہ جھینپ رہی تھیں۔ نظریں چرا رہی تھیں مگر خالو بے پروائی سے ابو سے باتیں کر رہے تھے۔

بڑے باتوں میں مصروف تھے۔ سیماب نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر لان کی طرف چل دی۔ سجاد چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور جو اسے نظر آیا' وہ مایوس کن تھا۔ سیماب ایک دم لمبی ہو گئی تھی اور بالکل لڑکا لگ رہی تھی۔ انداز تو اس کے پہلے ہی سے لڑکوں والے تھے۔ لیکن عجیب تر بات یہ تھی کہ اس کی کشش کا وہی عالم تھا بلکہ وہ پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ جب وہ اس سے لپٹی تو اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ اب بھی وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی اور وہ عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

ایک درخت کے پاس پہنچ کر وہ رک گئے۔ "چلو.... یہاں بیٹھتے ہیں۔" سیماب نے کہا۔

دونوں بیٹھ گئے۔ چند لمحے بعد سیماب نے کہا۔ "ذرا پرے ہٹو.... تمہیں ٹھیک سے دیکھ لوں۔"

وہ دیکھنے لگی۔ سجاد کو عجیب سا لگا۔ وہ کھسیانے لگا۔ "کیسے بے ڈھب اور لمبے ہو گئے ہو۔" بالآخر سیماب نے تبصرہ کیا۔ "اور یہ بال کتنے برے لگ رہے ہیں چہرے پر۔ چوزے اور مرغے کے درمیان کی چیز لگ رہے ہو۔"

"آئینہ بھی دیکھ لیا کرو کبھی؟" سجاد نے چڑ کر کہا۔

"اور آواز کوے جیسی ہو گئی ہے۔" سیماب نے سنی ان سنی کر دی۔ "واہ کیا

کمیونیکیشن ہے۔ منا اور لوے کٹ؟"

سجاد اپنی آواز کی تبدیلی پر خود بھی پریشان تھا۔ وہ بھاری ہوتی ہوئی آواز اسے خود بھی اجنبی لگتی تھی۔ لڑکے جب جوانی کی سرحد میں قدم رکھنے لگتے ہیں تو انہیں اس مرحلے سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ اور کھسیا گیا۔ "تو مت کرو مجھ سے بات۔" اس نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"یہی تو نہیں ہو سکتا۔ یہاں بات کرنے کو کوئی اور ہے ہی نہیں۔"

"تو واپس چلی جاؤ۔" سجاد اٹھ کھڑا ہوا اور ناراض ہو کر چل دیا۔ سیماب نے اسے منانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

ناراض ہونے کو تو وہ ہو گیا مگر اس امید پر کہ وہ اسے منا لے گی۔ اس لئے کہ یہاں ایک وہی اس کا دوست ہے۔ وہ اس کی ضرورت ہے۔ مگر دو دن بعد ابو اور امی ان لوگوں سے ملنے گئے تو اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ سیماب اپنے دو چچا زاد بھائیوں کے درمیان متحرک رہی تھی۔ وہ دونوں ہی اس پر والہ و شیدا ہو رہے تھے۔ سیماب نے اسے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ بات تک نہیں کی۔

تب سجاد کو یہ پتا چلا کہ اس بار ان لوگوں کا قیام خالو کے چھوٹے بھائی کے گھر تھا۔

وہاں سے واپس آیا تو وہ بہت اداس اور پژمردہ تھا۔ یوں لگتا تھا' جیسے کوئی بہت قیمتی چیز اس سے چھن گئی ہے۔ سچ یہ تھا کہ سیماب کی بے رخی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ تبعاً" وہ بہت خود دار اور ناک والا تھا۔ اس کے باوجود کئی بار اس کا جی چاہا کہ سیماب سے خود ہی بات کر لے۔ لیکن سیماب نے اپنے ہر انداز سے واضح کر دیا تھا کہ اس کی سننے گی بھی نہیں۔ اب وہ اس بات پر بھی جھنجلا رہا تھا کہ سیماب کے معاملے میں وہ اتنا کمزور کیوں ہو گیا ہے۔

گھر آ کر وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوا۔ سیماب ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنے عکس کو دیکھتے ہی سوچا۔ رخساروں پر' ٹھوڑی پر' ہونٹوں کے اوپر نرم' مڑے ہوئے ہلکے بال.... واقعی مرغے جیسی ہیئت ہو رہی تھی اس کی۔ اپنا آپ خود اسے بھی برا لگ رہا تھا۔

آئینہ دیکھ کر وہ اور پژمردہ ہو گیا مگر پھر دل میں امید کی ننھی سی کرن پھوٹی۔ اس کرن کی روشنی میں اسے ابو کا کلین شیو' تر و تازہ چہرہ نظر آیا۔ وہ بھی ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ وہ ابو سے بہت ملتا ہے۔ تو پھر وہ اتنا گندہ کیوں لگے.... کیوں رہے کہ دوسروں کو بھی برا لگے اور خود کو بھی۔

اس نے جلدی سے باتھ روم کا دروازہ اندر سے بند کیا اور کیبنٹ میں سے ابو کا شیو کا سامان نکال لیا۔ ابو کو شیو کرتے ہوئے وہ ہمیشہ غور سے دیکھتا تھا۔ ان کی نقل کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ وہ تو شیو کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ ریزر اس کی نرم جلد کے لئے بے حد ظالم ثابت ہو رہا تھا۔ جا بجا کٹ لگ گئے اور خون کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئیں جو دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹے چھوٹے کنوئیں سے بن گئے۔ اس نے آفٹر شیو لوشن لگایا تو ناچ ہی اٹھا۔ خراشوں میں جیسے مرچیں سی بھر گئیں۔ روئی موجود تھی۔ اس نے وہ لگائی اور لمحوں میں چہرہ کپاس کا کھیت بن کر رہ گیا۔

آخر میں اس نے آئینے میں نتیجہ دیکھا' جو خاصا مایوس کن تھا۔ اب وہ اور طرح سے برا لگ رہا تھا۔ مگر بہرحال پہلے سے بہت بہتر تھا۔

دن بھر خراشوں میں جلن ہوتی رہی۔ ایسا کچھاؤ تھا کہ لگتا تھا' چہرہ اتنا ہی بڑا ہے مگر جلد کم ہو گئی ہے۔

اگلے روز خالہ آئیں۔ وہ انہیں چپکے سے سلام کر کے باہر نکل گیا۔ وہ لان کے درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ ذرا دیر بعد سیماب وہاں آ گئی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے بری طرح ہنس رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آ بیٹھی مگر ہنسی روکنے کی کوشش میں اس کا پورا جسم ہل رہا تھا۔

سجاد کو اس کا ہنسنا بہت برا لگا۔ وہ منہ بنائے بیٹھا رہا۔ اس نے ہنسنے کی وجہ بھی نہیں پوچھی۔ ذرا دیر میں سیماب نے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور گھٹے گھٹے لہجے میں بولی "سوچا تھا' اب تم سے بھی بات نہیں کروں گی۔"

"تو نہ کرو۔" سجاد نے بھنا کر کہا۔

"کیسے نہ کروں۔ تم حرکتیں ہی ایسی کرتے ہو۔"

"کیسی حرکتیں؟"

"اب بھی دیکھ لو۔ پہلے مرغا تھے اور اب ابلا ہوا انڈا بن گئے۔" سیماب نے کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

"تمہیں اس سے کیا؟"

"بس تم برے لگتے ہو تو برا لگتا ہے۔"

"تمہیں تو اپنے چچا کے بیٹے اچھے لگتے ہیں۔"

"تم اپنی جگہ اور وہ اپنی جگہ۔" سیماب نے بے نیازی سے کہا۔

ذرا دیر بعد وہ پھر ہنسنے بولنے لگے۔

یوں قبل از وقت شیو کر کے سجاد نے خود کو وقت سے پہلے بڑا کر لیا۔

ایک روز خالہ اکیلی آئی ہوئی تھیں۔ وہ امی سے بات کر رہی تھیں۔ سجاد نے گزرتے ہوئے سیماب کا تذکرہ سنا تو دروازے پر رک کر سننے لگا۔

"میں تو باجی ہر وقت سیماب کی طرف سے پریشان رہتی ہوں۔" خالہ کہہ رہی تھیں۔

"کیوں بھئی۔ اتنی پیاری بیٹی ہے تمہاری۔" امی نے کہا۔

"بہت آزاد خیال ہے باجی۔ مجھے تو ڈر لگا رہتا ہے۔"

"بچی ہے ابھی۔ ناسمجھ ہے۔ سمجھ دار ہو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں باجی۔ میں جانتی ہوں۔ وہ اندر سے آدھی مغربی ہے، آدھی مشرقی۔ کبھی تو مجھے لگتا ہے، دو لڑکیاں گھسی ہوئی ہیں اس میں۔ میں فیصلہ کر کے آئی ہوں کہ اب اسے لندن نہیں لے کر جاؤں گی۔ میں تو اب خود بھی نہیں رہنا چاہتی مگر افسر کہتے ہیں کاروبار سمیٹنے میں دو سال لگیں گے۔"

"تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔" امی نے کہا۔ "اور سوچا کیا ہے اس سلسلے میں؟"

"میں تو آپ کے پاس چھوڑ کر جاتی اسے۔ لیکن افسر نہیں مانتے۔ وہ اسے اختر کے ہاں چھوڑنے پر راضی ہیں۔"

"چلو.... کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق پڑ بھی سکتا ہے باجی۔ مگر خیر.... دیکھا جائے گا۔"

"سنو نرگس۔" امی ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔ "میں پہلے سے تمہارے کان میں ڈال رہی ہوں۔ میں سیماب کو بہو بنانا چاہتی ہوں۔ وقت آنے پر اسے مانگوں گی سجاد کے لئے۔"

"اس سے اچھا کیا ہے باجی۔ آپ سے بڑھ کر کون ہے۔"

سجاد آگے بڑھ گیا۔

اسے آج بھی یاد تھا۔ اس وقت اس نے مانگنے کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن یہ سوچ کر اس کی دھڑکنیں بے ربط ہو گئی تھیں کہ سیماب اب لندن واپس نہیں جائے گی۔ یہیں رہے گی۔ اس بات پر اسے افسوس بھی ہوا کہ وہ اپنے چچا کے ہاں رہے گی۔ کاش.... وہ انہی کے ہاں رہتی۔

اس نے چونک کر گھڑی کو دیکھا۔ وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔

دس بج کر اکتالیس منٹ!

○

بعد میں اسے یہ افسوس بھی نہیں رہا۔ اس نے سمجھ لیا کہ سیماب ہواؤں کی طرح آزاد لڑکی ہے۔ وہ جہاں بھی رہے گی' آزاد ہی رہے گی۔ جتنا وہ اب اس سے ملتی تھی' اس کے گھر میں رہ کر بھی اس سے زیادہ نہیں ملتی بلکہ اس کے لئے یہ اچھا ہی تھا کہ وہ اپنے چچا کے گھر ٹھہری تھی۔ وہ اس سے ملتی تھی تو اسے خوشی ہوتی تھی۔ لیکن وہ ان کے ہاں ٹھہری ہوتی اور اسی طرح اپنے چچا زاد بھائیوں عامر اور عاطر سے ملنے جایا کرتی تو وہ کڑھتا۔ اسے افسوس ہوتا کہ وہ ان کے گھر میں ہوتے ہوئے بھی اس سے اچھی طرح نہیں ملتی۔ اب وہ جانتا تھا کہ عامر اور عاطر کے یہی جذبات ہوں گے۔ وہ کڑھ رہے ہوں گے۔

سیماب کا اسکول میں داخلہ ہو گیا تھا اور وہ اسکول جانے لگی تھی لیکن اس سلسلے میں وہ سخت بور تھی۔ "ایسی بور جگہ میں نے کبھی نہیں دیکھی۔" وہ اکثر کہتی۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ دم گھٹ جائے گا میرا۔ میں مرجاؤں گی۔"

"کیوں.... ایسی کیا بات ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ وہ بہت اچھا سکول ہے۔" سجاد

نے کہا۔

"خاک اچھا ہے۔ جہاں دل نہ لگے' اس جگہ کو اچھا کہا جا سکتا ہے؟" سیماب حقارت سے بولی۔

"اسکول پڑھنے کی جگہ ہے' دل لگانے کی تو نہیں۔" سجاد نے اعتراض کیا۔

اس وقت عامر اور عاطر بھی سیماب کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ عامر نے ہنس کر کہا۔ "یہ تو ہر جگہ دل لگانا چاہتی ہے۔"

"ذرا عادی ہو جائے گی تو اسکول میں بھی دل لگ جائے گا۔" سجاد بولا۔

"نہیں لگے گا۔" عاطر نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "وہ گرلز اسکول ہے۔"

"کیا مطلب؟" سجاد کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔

"وہاں صرف لڑکیاں ہوتی ہیں۔" عامر نے وضاحت کی۔ "اور سیماب کا دل صرف لڑکوں میں لگتا ہے۔"

"اسی لئے یہاں تم تینوں کے درمیان بیٹھی ہوں۔" سیماب نے تڑخ کر کہا۔ "ورنہ میں لڑکیوں میں ہوتی اور تم تینوں الگ الگ بور ہو رہے ہوتے۔"

"ہماری طبیعت تمہارے جیسی نہیں ہے۔" عاطر بولا۔

"جھوٹے ہو۔ جس بات کو برا سمجھتے ہو' اسے کرنے سے باز نہیں آتے۔ مگر اسے چھپا کر رکھ لیتے ہو۔ میں جو بات جیسے ہو' ویسے ہی کہہ دیتی ہوں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" عامر اور عاطر نے بیک آواز کہا۔

سجاد چند لمحے سوچتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ سیماب ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اسے اس لئے سیماب اور اچھی لگی۔ وہ دلیر تھی' بولڈ تھی' منافق نہیں تھی۔ "نہیں بھئی۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "میں مانتا ہوں کہ سیماب ٹھیک کہہ رہی ہے۔ نہ ماننے سے حقیقت تو نہیں بدلے گی۔"

"اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔" عامر نے کہا۔ "تم اس معاملے میں سیماب کے مزاج کے ہو گے لیکن میں نہیں ہوں۔"

"میں بھی نہیں ہوں۔" عاطر بولا۔

"اگر سچ کہہ رہے ہو تو تم دونوں ایب نارمل ہو۔" سیماب نے کہا۔

"وہ کیسے؟" عاطر کے لہجے میں چیلنج تھا۔

"فطرت یہی ہے کہ مرد کو عورت کی اور عورت کو مرد کی کمپنی اچھی لگتی ہے۔ اور جو لوگ فطرت کے خلاف عمل کریں' وہ ایب نارمل ہوتے ہیں۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔" عاطر نے کہا۔ "تم انگلینڈ میں رہ کر انگریزوں جیسی بے شرم ہو گئی ہو۔ کوئی پاکستانی لڑکی یہ بات نہیں کہہ سکتی۔"

"میرے خیال میں سیماب ٹھیک کہہ رہی ہے۔" سجاد نے سنجیدگی سے کہا۔

"تمہارا کیا ہے۔ تم تو سیماب کے چمچے ہو۔" عامر نے طعنہ دیا۔

بات بڑھی اور اتنی بڑھی کہ ان کی لڑائی ہو گئی۔

اس کا فائدہ سجاد کو ہوا۔ سیماب کی اس سے دوستی پکی ہو گئی۔ جو کچھ سجاد نے سوچا اور کہا' وہ محض سیماب کو خوش کرنے کے لئے نہیں تھا۔ اس کا مزاج ہی ایسا تھا۔ طبعاً" وہ بہت معقولیت پسند تھا۔ معقول بات اس کی سمجھ میں آتی تھی تو وہ اسے کشادہ دلی سے قبول بھی کر لیتا تھا۔

سیماب کو وہ اچھا تو لگتا تھا لیکن اسے اس کی یہ بات بہت بھائی۔ اس کے بعد دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔

اس عمر میں لڑائیاں پکی نہیں ہوتیں۔ عامر اور عاطر نے بھی اپنی غلطی مانی اور ان کے درمیان صلح ہو گئی۔ لیکن ترجیحات کا تعین ہو چکا تھا۔

آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کبھی سجاد بھی اختر چچا کے گھر چلا جاتا۔ اور سیماب تو تھی ہی من موجی۔ ہفتے میں دو تین بار تو وہ آتی ہی تھی۔ کبھی ویک اینڈ پر آتی تو رات کو رک بھی جاتی۔ امی اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ ان کے خیال میں وہ ان کی ہونے والی بہو تھی۔

ان قربتوں کے نتیجے میں عاطر اور سجاد کی دوستی ہو گئی لیکن سجاد کی عامر سے کبھی نہیں بنی۔

○

دس بج کر چھیالیس منٹ!

ایک سال گزر گیا۔ اب سجاد نہ مرغا تھا نہ ابلا ہوا انڈا۔ وہ بے حد وجیہہ و شکیل

لڑکا تھا۔ میٹرک کے بعد اس نے کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں لڑکیاں بھی تھیں۔ تھوڑا وقت گزرا تو وہ کئی لڑکیوں کی دلچسپی کا محور بن گیا۔ لیکن خود اس نے کبھی کسی لڑکی میں دلچسپی نہیں لی۔ ایک تو وہ طبعاً شرمیلا تھا۔ دوسرے اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ایک لڑکی میں دلچسپی لیتا ہے۔ بلکہ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ اسے سیماب سے محبت ہے۔ لیکن یہ بات کالج کی کئی لڑکیوں کے اظہار محبت کے بعد اس کی سمجھ میں آئی۔

کبھی وہ کالج کی لڑکیوں سے سیماب کا موازنہ کرتا تو اسے ایک پل کو مایوسی ہوتی۔ کالج کی لڑکیوں میں عجیب سی خوب صورتی تھی، جسے وہ محسوس تو کر لیتا تھا، سمجھ نہیں پاتا تھا۔ جبکہ سیماب میں وہ بات نہیں تھی۔ وہ غور سے دیکھتا تو اسے اعتراف کرنا پڑتا کہ چہرے کی خوب صورتی کے اعتبار سے سیماب کالج کی لڑکیوں سے بہت حسین ہے مگر کہیں کوئی کمی تھی اس میں۔ شاید وہ دبلی پتلی بہت تھی..... اور شاید وہ لمبی بھی بہت تھی..... تاڑ کی طرح۔ اس میں شاید توازن کی.... تناسب کی کمی تھی۔ اس سے زیادہ وہ کبھی کچھ سمجھ نہیں سکا۔

مگر ایک دن بات اس کی سمجھ میں آ گئی!

سیماب لڑکی سے زیادہ لڑکا لگتی تھی۔ یہ بات سمجھنے میں اسے اتنی دیر اس لئے لگی کہ سیماب کی تمام حرکتیں لڑکوں والی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتی، فٹ بال کھیلتی۔ ہاتھا پائی اور دھینگا مشتی سے بھی وہ کبھی نہیں ہچکچاتی تھی۔ یہاں رہتے ہوئے ایک سال ہوا تو وہ بات بھی لڑکوں کی طرح کرنے لگی۔ اسے، عامر اور عاطر کو یار کہہ کر مخاطب کرتی۔ بس یہی غنیمت تھا کہ خود اپنے لئے وہ تانیث کا صیغہ استعمال کرتی تھی۔ اس کے لڑکا پن کا یہ پہلو اتنا نمایاں تھا، اتنی سامنے کی بات تھی کہ اس کے پیچھے چھپی ایک اور سامنے کی حقیقت وہ نہ دیکھ سکا۔ اور وہ حقیقت یہ تھی کہ دبلی پتلی ہونے کے باوجود سیماب اس نزاکت سے محروم تھی، جو لڑکیوں کا بہت اہم اثاثہ ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں، چہرے سے قطع نظر جسمانی اعتبار سے وہ لڑکا لگتی تھی۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس بات کے ادراک کے بعد وہ اس سے دور ہو جاتا۔ بہت حسین لڑکیوں کا التفات اسے میسر تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر سیماب اس کے لئے پہلے ہی کی طرح پرکشش رہی۔ بلکہ شاید اس کی کشش اور بڑھ گئی۔

دوسری طرف عامر اور عاطر بھی سجاد کی طرح کالج میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں بھی سجاد کی سی صورت حال سے واسطہ پڑا تھا۔ لیکن ایک فرق تھا۔ انہیں جو موقع مل رہا تھا' وہ اس سے استفادہ کر رہے تھے۔ کالج میں پہنچتے ہی انہوں نے پر پرزے نکال لئے تھے۔ ان کے چکر چلتے ہی رہتے تھے۔

اور شاید ان دونوں نے بھی کالج کی لڑکیوں سے سیماب کا موازنہ کیا تھا۔ یہاں بھی وہی فرق سامنے آیا۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا' اسکے نتیجے میں ان کی سیماب میں دلچسپی ختم ہو گئی۔ سیماب سے انہیں لگاؤ تھا تو صرف اس لئے کہ اس کا تعلق صنف مخالف سے تھا۔ اور اسکول کے دنوں تک ان کے اردگرد کوئی لڑکی تھی ہی نہیں۔ مگر اب انہیں لڑکیوں کی قربت بھی میسر تھی اور التفات بھی.... اور وہ بھی حسین لڑکیوں کا۔ اس لئے لڑکا نما سیماب ان کے لئے غیر اہم ہو کر رہ گئی۔

سیماب کو اگر ان کے رویئے سے دھچکا لگا تو اس نے کسی کو اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اس کی خود اعتمادی کا اب بھی وہی عالم تھا۔ لیکن وہ واضح طور پر سجاد سے قریب تر ہو گئی۔

ایک سال گزرا اور اسکول کی موسم گرما کی چھٹیاں ہو گئیں۔ لڑکے فرسٹ ایئر میں تھے۔ ان پر پڑھائی کا بوجھ بڑھ گیا تھا کیونکہ دو ماہ بعد امتحان ہونے والے تھے۔ پھر بھی انہوں نے شروع میں ایک ماہ کی چھٹیوں میں سیماب کا خوب ساتھ دیا۔ کبھی سجاد' اختر چچا کے ہاں چلا جاتا اور کبھی وہ لوگ ان کے ہاں آ جاتے۔ خوب دھما چوکڑی مچتی۔ گانے گائے جاتے' لطیفے سنائے جاتے' کسوٹی کھیلی جاتی۔ کرکٹ اور فٹ بال کی بھی شامت آتی۔ کبھی وقت پرسکون ہوتا تو وہ لوگ کیرم یا تاش کھیلتے۔

ایک اور مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ پہلے ہمیشہ اس بات پر جھگڑا ہوتا تھا کہ سیماب کا پارٹنر کون بنے گا۔ اس سلسلے میں سجاد کے سوا کبھی کوئی لڑکا مفاہمت پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ ہاں سجاد فیصلہ سیماب پر چھوڑ کر الگ ہو جاتا تھا۔ مگر عاطر اور عامر بعض اوقات سیماب کا فیصلہ بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ کھیل ہی نہ پاتے۔ اس لحاظ سے وہ بے حد غیر متوازن چوکڑی تھی۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ تین ملاؤں میں مرغی حرام ہو رہی تھی۔

مگر لڑکوں کے کالج پہنچتے ہی یہ مسئلہ نہیں رہا۔ اب پارٹنر کے انتخاب کا مسئلہ سیماب پر چھوڑ دیا جاتا۔ عاطر اور عامر اب اس مسئلے پر کبھی نہ الجھتے۔ سیماب ہر بار سجاد کے حق میں فیصلہ کرتی اور کبھی بدمزگی نہیں ہوتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ یہ مسئلہ ہی ختم ہو گیا۔ سجاد مستقل طور پر سیماب کا پارٹنر بن گیا اور تسلیم کر لیا گیا۔ مگر سجاد نے سیماب کے چہرے پر تکدر کا سایہ دیکھ لیا تھا۔ پہلے جب اس کو پارٹنر بنانے کے لئے جھگڑے ہوتے تھے تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا ہوتا تھا۔ اسے اچھا لگتا تھا کہ وہ اس کے لئے لڑ رہے ہیں۔ لہٰذا یہ محرومی اسے بہت ناگوار لگی۔ تاہم اس کا مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا کھیل بہتر سے بہتر ہو گیا۔ وہ سچ مچ بہت اچھا کھیلنے لگی۔

سجاد کے لئے یہ سب فائدہ مند تھا۔ سیماب اب اس کی مستقل پارٹنر تھی۔۔۔۔ اور کیرم ہوتا یا تاش، زیادہ ترجیت اس کے اور سیماب ہی کے حصے میں آتی تھی۔

چھٹیوں کا ایک ماہ باقی تھا کہ ایک دن سیماب ناشپاتی کے درخت پر چڑھ کر ناشپاتیاں توڑ رہی تھی۔ اچانک وہ بہت بے ڈھنگے پن سے گری۔ اس کے بائیں پاؤں پر بہت زیادہ زور پڑا تھا اور وہ مڑ گیا تھا۔ امی نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا لیکن بالاخر اسے اسپتال لے جانا پڑا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ احتیاط اور تصدیق ضروری ہے۔ کہیں فریکچر نہ ہو۔ بہرحال ایکسرے سے یہ معلوم ہو گیا کہ ہڈی نہیں ٹوٹی ہے لیکن موچ بہت شدید تھی۔ ڈاکٹر نے دوائیں دیں۔ لیکن واضح طور پر خبردار کیا کہ احتیاط اور آرام بہت ضروری ہے۔ ورنہ چوٹ بہت تکلیف دہ ثابت ہو گی۔

اختر چچا اور چچی سیماب کی عیادت کے لئے آئے۔ انہوں نے گھر چلنے کو اصرار کیا لیکن سیماب نے منع کر دیا کہ ڈاکٹر نے نقل و حرکت کو سختی سے منع کیا ہے۔ چنانچہ وہ بادل نخواستہ اسے وہاں چھوڑنے پر رضامند ہو گئے۔ یوں سیماب اسکول کی باقی چھٹیوں تک وہیں رہی۔

سجاد سیماب کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن خود اس نے وہ وقت بہت اچھا گزارا۔ وہ اس کے لئے یادگار دن تھے۔ سیماب بلا شرکت غیرے اس کی تھی۔ وہ تمام وقت اس کا سایہ بنا رہا۔ حالانکہ امتحان سر پر آ گئے تھے۔ مگر یہ بھی تھا کہ فرسٹ ایئر اتنا اہم نہیں ہوتا۔ اگلے سال ہر کمی کی تلافی کی جا سکتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ سجاد نے سیماب کی بہت خدمت کی۔ وہ ہر وقت اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا۔ وہ نہ ہوتا تو سیماب دوسرے ہی دن سے چلنا شروع کر دیتی اور اس کا نتیجہ یقیناً خراب نکلتا۔ ہر بار وہ اسے کسی کھیل میں الجھا لیتا۔ یا وی سی آر پر کوئی فلم لگا دیتا۔

اس عرصے میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے سیماب کو بہت قریب سے دیکھا اور اسے سمجھا۔ یہ اندازہ تو اسے تھا کہ وہ بہت دشوار لڑکی ہے۔ لیکن مسلسل اتنا عرصہ قریب رہنے کے بعد اس نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ وہ مشکل.... بہت ہی مشکل لڑکی ہے۔ ابتدا میں اسے حیرت بھی ہوئی اور تکلیف بھی۔ مگر حقیقت جان لینا بالآخر بہتر ہی ہوتا ہے۔

وہ سیماب کے پیر کی موچ کا تیسرا دن تھا۔ وہ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ اچانک سیماب نے غصے سے پتے ایک طرف پھینک دیئے۔ سجاد حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ "کیا ہوا؟ کیا تمہارے خیال میں میں بے ایمانی کر رہا ہوں؟" بالآخر اس نے سنبھل کر پوچھا۔

"جی نہیں۔ بے ایمانی کرنے دوں گی تمہیں۔" سیماب نے چیلنج کیا۔

"تو پھر؟"

"یہ کیا مصیبت ہے۔ کیا تاش کھیلنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے؟" وہ غصے سے بولی۔

"کیوں نہیں۔" سجاد نے بے حد طیمی سے کہا۔ "چلو کسوٹی کھیلتے ہیں۔"

"میں بور ہو گئی ہوں یہ سب کر کے۔" سیماب نے کہا پھر تنبیہی لہجے میں بولی "اور خبردار فلم دیکھنے کی بات بھی نہ کرنا۔ میں فلمیں دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکی ہوں۔"

سجاد حیران تھا۔ ابھی تیسرا دن ختم نہیں ہوا تھا۔ یعنی ڈھائی دن میں وہ اپنے تمام مشاغل سے اکتا چکی تھی' جن کی تعداد بہرحال کم نہیں' بلکہ اچھی خاصی تھی۔ کم از کم اسے اکتاہٹ کا بالکل احساس نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اسے یقین تھا کہ وہ ان مصروفیات میں کئی مہینے بور ہوئے بغیر گزار سکتا ہے۔ اس کے لئے تو سیماب کی قربت ہی بہت تھی۔ وہ اگر آنکھیں بند کئے لیٹی رہتی اور وہ اسے تکتا رہتا تو بھی اسے وقت گزرنے کا احساس نہ ہوتا۔ یہ سوچ کر اس کے دل پر چوٹ سی لگی کہ سیماب کے لئے اس کی اتنی

اہمیت نہیں ہے۔ ورنہ وہ بور نہیں ہو سکتی تھی۔
اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سیماب نگاہوں میں سختی لئے اسے گھور رہی تھی۔ جیسے وہی اس کی بوریت کا ذمے دار ہو۔ "تو پھر کیا کریں؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔
"سوچو.... کچھ ایسا ہو' جو ہم نے اب تک نہیں کیا ہو۔ بالکل نیا۔"
سجاد سوچنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے ایسا کچھ نہیں سوجھے گا۔ ایسا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔
"تم بہت بور آدمی ہو۔ ذرا بھی creative نہیں ہو۔ تمہاری کمپنی میں کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔" سیماب نے غصے سے کہا۔
"میں کوشش کر رہا ہوں سوچنے کی۔"
"کوئی ضرورت نہیں۔ یہ کام تمہارے بس کا نہیں۔ مجھ پر چھوڑ دو۔ اچھا چلو' باغیچے میں چل کر سوچتے ہیں۔"
"ہرگز نہیں۔ میں تمہیں اٹھنے نہیں دوں گا۔"
"اچھا.... تم کیسے روک سکتے ہو مجھے۔" سیماب کے لہجے میں حقارت تھی۔
"تمہاری ٹانگ کی ہڈی توڑ دوں گا۔ پھر تم چلنے کے قابل ہی نہیں رہو گی۔"
سیماب نے اسے تولنے والی نظروں سے دیکھا مگر اس کے انداز میں سنجیدگی دیکھ کر مسکرا دی۔ "یہ بات اچھی لگی مجھے۔ آدمی کو ایسا ہی ہونا چاہیے.... مضبوط اور زور آور۔ لیکن تم پر تو بس یہ دورہ سا پڑتا ہے کبھی کبھی۔ اس کے بعد ویسے ہی کمزور اور لجلجے ہو جاتے ہو۔"
اور سجاد فوراً ہی کمزور اور لجلجا ہو گیا۔ مسئلہ وقتی طور پر حل ہو گیا تھا۔
سیماب کچھ سوچ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ "اور یہ تم اسی طرح میرے ساتھ کھیلتے رہو گے تو فیل نہیں ہو جاؤ گے امتحان میں؟"
"ہونے دو۔ اگلے سال دیکھ لیں گے۔"
"نہیں' یہ کوئی بات نہیں۔ الزام تو مجھ پر ہی آئے گا اور یہ میں پسند نہیں کروں گی۔"
"تو پھر؟"

وہ پھر سوچنے لگی۔ "اچھا' فرض کرلو' میں چچا جان کے ہاں چلی جاؤں تو....؟"
"کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ میں وہاں بھی روز آیا کروں گا۔ اس حال میں تمہیں اکیلا تو نہیں چھوڑوں گا میں۔"

سیماب نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔ "تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ عام حالات میں تم امتحان کی تیاری کیسے کرتے۔ کیا شیڈول ہوتا تمہارا؟ دیکھو نا' کوئی بھی چوبیں گھنٹے تو نہیں پڑھ سکتا۔ پڑھے تو اس کا کچھ فائدہ بھی نہیں۔ تفریح بھی ضروری ہوتی ہے۔ اب یہ سوچ کر بتاؤ کہ میں انگلینڈ میں ہوتی تو تم کیا ٹائم ٹیبل بناتے۔"

"میں..."

"ایک منٹ۔" سیماب نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ "بتاؤ نہیں۔ لکھ کر.... ٹائم ٹیبل بنا کر دکھاؤ مجھے۔"

پانچ منٹ بعد سجاد نے کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کاغذ کا جائزہ لیا اور بڑوں کے انداز میں سر ہلا کر بولی۔ "گڈ.... ویری گڈ۔ آج سے اس پر عمل ہو گا۔"

سجاد کو غصہ آنے لگا۔ وہ امی کے انداز میں بول رہی تھی۔ اور وہ مذاق بھی نہیں تھا کیونکہ وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ "مگر تم بور ہو جاؤ گی۔" اس نے اپنے بے سود غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہوں گی۔ ہم ایک بالکل نیا کام کر رہے ہوں گے' جو ہم نے اب تک نہیں کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" سجاد حیران رہ گیا۔

"ہم مل کر پڑھیں گے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ تم مجھ سے بہت پیچھے ہو۔"

"ہوں۔ لیکن ضروری نہیں کہ رہوں بھی۔ تم جو پڑھو گے' زور سے پڑھو گے۔ میں سنوں گی۔ پھر میں وہی پڑھوں گی' تم سنو گے۔ اس کے بعد ہم اس پر ڈسکشن کریں گے۔"

سجاد کو وہ ناممکن معلوم ہو رہا تھا مگر کرنے میں کچھ حرج بھی نہیں تھا۔ سیماب کے

لیے تو وہ ایک طرح کا نیا اور انوکھا کھیل تھا۔ جب تک اس سے دل نہ بھر جاتا، وہ خوش رہتی۔ اور سجاد کا اپنا نقصان بھی نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہ امتحان پر پہلے ہی صبر کر چکا تھا۔ چنانچہ اس کے بنائے ہوئے ٹائم ٹیبل پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔

لیکن تین دن میں سجاد کو اندازہ ہو گیا کہ اس پروگرام سے اسے بہت زیادہ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ سیماب واقعی غیر معمولی لڑکی تھی۔ اس کا حافظہ غضب کا تھا اور وہ بے حد فہیم بھی تھی۔ وہ تو کسی لیکچرار کے سے اعتماد سے اسے سمجھاتی تھی۔ یوں کھیل ہی کھیل میں امتحان کی تیاری بہت اچھی طرح ہونے لگی۔

چوتھے دن سیماب پر اکتاہٹ طاری ہونے لگی۔ بنگے بندھے معمولات کے مطابق وقت گزارنا اس کے مزاج میں تھا ہی نہیں۔ لیکن وہ ٹائم ٹیبل کی اہمیت کو خوب سمجھتی تھی۔ چنانچہ اس نے اس کی ایک اور ترکیب نکال لی۔ ٹائم ٹیبل کو بے حد مرتب انداز میں بے ترتیب کیا جانے لگا۔ کیمسٹری کے وقت وہ لوڈو کھیلتے۔ لوڈو کھیلنے کے وقت میں ریاضی پڑھا جاتا اور ریاضی کے وقت میں فزکس ہوتی۔ پھر ایسا ہونے لگا کہ خود انہیں بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کب کیا ہو گا۔ سب کام ہوتے۔ تمام مضامین کی سٹڈی ہوتی۔ کھیل بھی سارے کھیلے جاتے۔ بس کسی کے بھی وقت کا تعین نہیں تھا۔

اس عرصے میں سجاد نے سیماب کو خاصی حد تک سمجھ لیا۔ یہ بھی جان لیا کہ وہ اسے پوری طرح کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے مزاج میں تلون بہت تھا۔ وہ بے حد تنوع پسند تھی۔ زندگی میں مسلسل نئے پن' انوکھے پن کی متلاشی۔ اس میں اضطراب بہت تھا۔ وہ ظاہری طور پر ہی نہیں' باطنی طور پر بھی بے حد متحرک تھی۔ عام طور پر متلون مزاج لوگ قوت ارادی کے پکے نہیں ہوتے مگر سیماب جو ٹھان لیتی وہ کر کے رہتی تھی۔

دیکھنے میں تو وہ ایسی نہیں لگتی تھی لیکن ایک دن سجاد کو پتا چلا کہ سیماب حساس بھی ہے۔ شاید اس روز وہ کوئی کمزور لمحہ تھا' جو اس پر آیا تھا۔ اس نے بے حد اداس لہجے میں بڑی دل گرفتگی سے کہا۔ "عامر اور عاطر نے کیسے مجھے چھوڑ دیا۔"

سجاد نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس وقت وہ اسے کسی زخمی پرندے کی طرح لگی۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "وہ بھی امتحان کی تیاری میں الجھے

ہوئے ہیں۔"

"نہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ انہوں نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔" سیماب کے لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔

سجاد کو حیرت ہوئی۔ اب تک سیماب نے یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیا کہ اسے اس بات کی کوئی پرواہ ہے۔ یہ تو اب اچانک پتا چلا تھا کہ اسے ان کی بے رخی کا دکھ ہے۔ اسے احساس ہوا کہ سیماب اسے بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ "تم بہت اچھے ہو..... سچے اور مخلص۔ اسی لئے میں تمہاری قدر کرتی ہوں۔"

سجاد اس کے تضادات پر حیران ہوتا۔ کبھی کبھی تو اسے واضح طور پر محسوس ہوتا کہ سیماب کے ایک وجود میں دو شخصیتیں ہیں..... اور وہ ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہیں اور یہ بھی تھا کہ ان میں سے ایک شخصیت دبی ہوئی تھی اور دوسری بہت زیادہ ابھری ہوئی تھی۔ سجاد کو ہمیشہ اس کی دبی ہوئی شخصیت نے بہت اپیل کیا' جو بس کبھی کبھار ہی ابھرتی تھی۔ اس سیماب میں نزاکت' نسوانیت اور ٹھہراؤ تھا۔ وہ شرمیلی تھی۔ وہ دوسروں کا' ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنے والی تھی۔ لیکن بولڈ اور آزاد رو سیماب اسے ابھرنے کا موقع کم ہی دیتی تھی۔

ادھر سجاد کے امتحان شروع ہوئے اور ادھر اسکولوں کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔

ایک سال گزر چکا تھا!

○

سجاد نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ گیارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ وہ پھر سیماب کی یادوں میں کھو گیا!

اس کے اور سیماب کے درمیان دو سال کا فاصلہ تھا..... عمر کا بھی اور تعلیم کا بھی۔ عمر کا فرق تو کبھی نہیں مٹتا۔ لیکن وقت نے عجیب انداز میں اس کی تعلیمی برتری کو نصف کر دیا۔ اگلے سال سیماب نے میٹرک کا امتحان دیا۔ اسے انٹر' سیکنڈ ایئر کا امتحان دینا تھا۔ لیکن عین امتحان کے دنوں میں وہ بیمار پڑ گیا۔ اسے ٹائی فائیڈ ہو گیا تھا۔

یہی وہ عرصہ تھا' جب خالہ مستقل طور پر پاکستان آ گئیں۔ سیماب چچا کے گھر سے اپنے ہاں منتقل ہو گئی۔ بیماری کے اس عرصے میں سیماب نے اس کا بہت ساتھ دیا۔ وہ

زیادہ تر انہی کے ہاں رہی۔ شاید وہ اپنی سوچ والے عرصے میں اس کی تیمارداری کا
حساب چکا رہی تھی۔

اور پھر ایک دن سجاد نے جو پوری آنکھیں کھول کر دیکھا تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔
شاید یہ فطرت کا اصول ہے کہ عرصہ بہار میں جن درختوں پہ دیر سے بہار آئی
ہے تو ایسی بہار آئی ہے کہ پورے چمن کی نظریں ان کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ یہی کچھ
سیماب کے ساتھ بھی ہوا۔ کہاں تو وہ سوکھی ٹہنی کی طرح تھی۔ کہاں ایک دم پھولوں
اور پھلوں سے لدی شاخ بن گئی۔ یہ بھی طے ہے کہ ایسی شاخوں پر بھنورے بھی بہت
کثرت سے منڈلاتے ہیں۔ اور پرانے بھنورے تو لوٹ کر آتے ہی ہیں۔

پرانے بھنورے لوٹ کر آئے تو پھر مسائل سر اٹھانے لگے۔

اب پھر سیماب کا پارٹنر بننے کے سلسلے میں جھگڑے ہونے لگے مگر ایک فرق تھا
سیماب نے خود ہی سجاد کو اس مقابلے سے باہر کر دیا۔ "بھئی سجاد کو بیچ میں مت لاؤ۔"
اس نے ابتدا ہی میں فیصلہ سنا دیا۔ "تم دونوں آپس میں فیصلہ کر لو کہ کون میرا پارٹنر
بنے گا۔"

رقابت تو بھائیوں کے دلوں میں بھی فرق ڈال دیتی ہے۔ پھر بھی بھائیوں میں اگر
محبت ہو تو وہ کوئی درمیانی راہ نکال ہی لیتے ہیں۔ دونوں خوش تھے کہ اصل کانٹا یعنی
سجاد مقابلے سے نکل گیا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ لڑنا بے وقوفی ہے۔ دونوں باری باری
سیماب کے پارٹنر بنتے رہیں گے۔

سجاد کو اس صورت حال پر بہت رنج ہوا۔ وہ عاطر اور عامر کے بدلے ہوئے
رویوں پر سیماب کی دل گرفتگی دیکھ چکا تھا۔ اس کے خیال میں تو سیماب کو ان دونوں کو
منہ ہی نہیں لگانا چاہئے تھا مگر وہ تو ان کے ساتھ پہلے جیسی ہو گئی تھی۔ اور مقابلے
سے خارج وہ ہو گیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ بے انصافی تھی۔ پھر بھی اس کا دل
سیماب سے برا نہیں ہوا۔ وہ اب بھی اس کے التفات کے لئے کوششیں کرتا تھا۔

اور یہ بات بھی کہ سیماب اس پر ملتفت نہ ہو۔ واضح طور پر اس کا جھکاؤ سجاد کی
ہی طرف تھا۔ اس سے بات کرتے وقت اس کے لہجے میں عجیب سی کھنک آ جاتی۔
اسے دیکھتے ہوئے اس کی نظروں میں وارفتگی ہوتی اور آنکھیں بھی چمکتیں۔ مگر سجاد کو

یہ سب نظر نہ آتا۔ وہ تو بس یہ سوچ کر کڑھتا کہ سیماب نے اسے کبھی پارٹنر نہ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس کی نظروں میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

اس محرومی کا ایک مثبت نتیجہ بھی نکلا۔ سجاد سیماب پر اپنی اہلیت ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ وہ اس پر ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ عاطر اور عامر کے مقابلے میں وہ اس کا پارٹنر بننے کا کہیں زیادہ مستحق ہے۔ چنانچہ اس نے کھیل پر دھیان دینا شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں اس کا کھیل نکھرتا چلا گیا۔ کیرم میں تو یہ صورت حال ہوئی کہ وہ اکیلا بھی ان تینوں کو ہرا سکتا تھا۔

اس روز عاطر اور عامر نہیں تھے۔ وہ اور سیماب سنگل میں کھیل رہے تھے۔ سیماب نے nil ہارنے کے بعد بے بسی سے کندھے جھٹکے اور بولی۔ "تم سے کیرم کھیلنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہیں کوفت ہوتی ہو گی مجھ سے کھیل کر۔ بے جوڑ مقابلے میں کہاں مزہ آتا ہے۔"

"ایسا بھی نہیں۔" سجاد نے انکساری سے کہا۔ "تمہارا کھیل بھی اچھا ہے۔"

"میں جانتی ہوں لیکن تم سے کوئی مقابلہ نہیں۔ تمہارا کھیل بہت اچھا ہے۔"

"اس کے باوجود تم مجھے اپنا پارٹنر نہیں بناتیں۔" دل کی بات اچانک زبان پر آ ہی گئی۔

سیماب نے چونک کر اسے دیکھا۔ چند لمحے وہ اسے بغور دیکھتی رہی پھر بولی۔ "تو اس لئے منہ لٹکائے رہتے ہو؟"

"تو اور کیا۔ مجھے تم نے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال دیا۔" وہ باقاعدہ شکایت پر اتر آیا۔

سیماب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" سجاد جھنجلا گیا۔

"سوچ رہی ہوں کہ بہت ذہین لوگ بھی کسی معاملے میں کتنے بے وقوف ہو جاتے ہیں۔"

سجاد اور چڑ گیا۔ "کہاں کی ہانک رہی ہو؟"

"سچ کہہ رہی ہوں۔ تمہیں تو میرا شکر گزار ہونا چاہئے تھا۔ اس پہ..."

"یہ کہ تم نے مجھے اپنا پارٹنر نہیں بنایا۔" سجاد نے اس کا جملہ پورا کر دیا "اور میں بے وقوف ہوں کہ اس عنایت پر افسردہ ہوں۔"

"ہاں' یہی بات ہے۔" سیماب نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ منطق میری سمجھ میں تو نہیں آ سکتی۔" سجاد بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں واقعی بے وقوف ہوں۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ ذہین ہونے کے باوجود اس معاملے میں تم بے وقوف ثابت ہوئے ہو۔"

"تو اے دانائے زمانہ' ذرا مجھے بھی سمجھا دو۔"

"ایسی باتیں سمجھائی نہیں جاتیں' خود سمجھنی ہوتی ہیں۔"

"مگر میں تو بے وقوف ثابت ہو چکا ہوں۔" سجاد کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اب تو تمہیں ہی سمجھانا پڑے گا۔"

سیماب چند لمحے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی پھر عجیب سے لہجے میں بولی

"تم میں لطیف باتیں سمجھنے کی اہلیت نہیں ہے۔"

"اس میں لطافت کہاں سے آ گئی۔" سجاد بھنا گیا۔

"ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی ہے۔" سیماب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اور یہ اہلیت اس لئے نہیں کہ تم جرات مند نہیں ہو' بزدل ہو۔ کسی چیز کو اپنے لئے بے حد اہم سمجھنے کے باوجود بھی تم اس کے حصول کے لئے نہیں لڑ سکتے۔ تمہارا دل جو کرنا چاہتا ہے' وہ تم کر نہیں سکتے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً تمہارا دل چاہتا ہے کہ میرا ہاتھ پکڑ لو مگر تم میں اتنی جرات نہیں ہے۔"

سجاد کا دماغ گھوما جا رہا تھا۔ "کیسی بے سروپا باتیں کر رہی ہو۔"

"تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ تمہارے معاملے میں سب کچھ مجھے ہی سوچنا اور کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔"

"تو سمجھاؤ نا۔ ابھی تک تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہے۔"

"بس اتنا سوچ لو کہ پارٹنر زیادہ قریب ہوتا ہے یا حریف۔" سیماب نے کہا اور اٹھ

کر کچن کی طرف چلی گئی۔

سجاد اس کے جملے پر غور کرتا رہا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا مگر پھر اچانک جھماکا سا ہوا اور سب کچھ روشن ہو گیا۔ واقعی.... یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ پارٹنر سامنے ضرور ہوتا ہے مگر فاصلہ بھی ہوتا ہے۔ جبکہ حریف بہت قریب ہوتا ہے۔ اتنا قریب کہ جسم بار بار چھوتے رہتے ہیں۔

پھر اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی بے وقوف ہے۔ کم از کم اس معاملے میں۔ اب اسے باتیں یاد آ رہی تھیں..... اور سمجھ میں بھی آ رہی تھیں۔ کیرم کھیلتے ہوئے سیماب کوئی گوٹ کھیلنے کے بہانے اس کی طرف جھکتی تھی بلکہ اس پر لد جاتی تھی۔ اور اب تو وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ سیماب دوسری طرف کی آسان گوٹیں چھوڑ کر اس کی طرف کی مشکل گوٹیں کھیلتی تھی۔ اس پر کبھی اس کی اپنے پارٹنر سے بحث بھی ہو جاتی تھی۔

سجاد نے تصور میں وہ منظر دیکھا..... اور اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ وہ واقعی بہت بے وقوف تھا۔ جب سیماب اس کی طرف جھکتی تو قدرتی طور پر اس کا لمس اس کے وجود میں سنسنی دوڑا دیتا تھا مگر وہ اس قربت سے محظوظ ہونے کے بجائے اس پر ہی کڑھتا رہتا کہ سیماب نے اسے پارٹنر نہیں بنایا ہے۔

اس روز سجاد نے بہت کچھ سوچا اور بہت کچھ اس کی سمجھ میں آیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ خوش بھی ہوا، مگر جھنجلایا بھی۔ ایک بات تو وہ یقینی طور پر سمجھ گیا..... یہ کہ اسے سیماب سے محبت ہے اور وہ اس کے بغیر..... اس سے دور نہیں رہ سکتا۔ اور آثار بتاتے تھے کہ اس کا جذبہ یک طرفہ نہیں۔ سیماب بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن یہ بات وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ سیماب کے مزاج میں تلون ہی اتنا تھا۔ وہ تو پل پل رنگ بدلنے والی لڑکی تھی۔ اگر یہی سب کچھ کسی اور لڑکی نے کیا ہوتا تو وہ بلاجھجک یقین کر لیتا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ مگر معاملہ سیماب کا تھا، جس کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ یہاں کوئی خوش فہمی پالنا عمر بھر کا روگ ہی ثابت ہوتا۔

پھر اسے احساس ہوا کہ سیماب کی طرح وہ بھی کچھ عجیب ہی ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ سیماب کا یہ کہنا غلط تھا کہ وہ بزدل ہے اور اس میں جرات کی کمی ہے۔ خود کو پوری طرح ٹٹولنے کے بعد وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ

خاص مغرور ہے۔ وہ جرأت مند بھی ہے۔ لیکن وہ روایتی معاشرے کی مروجہ قدروں کو سمجھتا بھی ہے اور ان کا احترام بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سب کچھ سمجھنے کے بعد اس کے اندر متضاد رویے ابھرے ہیں۔ ایک طرف اسے خوشی ہوئی مگر دوسری طرف اسے برا بھی لگا۔ اچھی لڑکیاں ایسی تو نہیں ہوتیں۔ لڑکیوں کو ایسا ہونا بھی نہیں چاہئے۔ محبت تو ایک خودکار جذبہ ہے، جس پر کسی کا اختیار نہیں۔ وہ تو بس ہو جاتی ہے، آدمی چاہے یا نہ چاہے۔ مگر لڑکیوں میں حجاب ایک ضروری وصف ہے۔

پہلی بار وہ سیماب کو ایک مارجن دینے پر مجبور تھا۔ ذہنی نشو و نما کا تمام عرصہ اس نے انگلینڈ کے آزاد ماحول میں گزارا تھا۔ اس سے بھی بڑا فرق پڑتا ہے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس بات کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ سیماب کی فطرت ہی ایسی ہے۔ کچھ لڑکیاں ہوتی ہی باغی ہیں اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سیماب کوئی بری لڑکی نہیں۔ بس وہ بہت آزاد طبیعت کی ہے اور کوئی بات نہیں۔

وہ اور بھی بہت کچھ سوچتا مگر سیماب آندھی طوفان کی طرح آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی۔ "یہ رہے جناب گرما گرم پکوڑے۔" اس نے اعلان کیا۔ "یہ سرکہ اور یہ زبردست چٹنی۔" اس نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔

سجاد حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ "یہ سب کیا ہے؟"

"پکایا تو ہے۔" وہ معصومیت سے بولی "اور پکوڑے میں نے خود بنائے ہیں۔ کھا کر دیکھو نا۔"

سجاد مزے لے لے کر پکوڑے کھانے لگا۔ "بہت مزے کے ہیں۔" اس نے سر اٹھا کر کہا۔

"تب شاید میری بات سمجھ میں آ جائے۔"

"وہ تو سمجھ میں آ چکی ہے۔" سجاد نے بے ساختہ کہا۔

"تو پھر میرا شکریہ ادا کرو۔"

"یہ ٹھیک نہیں۔ اس لئے کہ میں تم سے متفق نہیں ہوں۔"

"کس بات سے؟"

"تمہاری وکالت سے۔ تمہاری سوچ مجھے اچھی نہیں لگی۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"میرے لئے تمہارا پارٹنر بننے کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور جو تم نے عنایت کی' تو اس بارے میں میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔"

"یعنی تمہارے لئے میرا پارٹنر بننا ایک بہت بڑا اعزاز ہے؟"

سجاو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور اس قربت کی کوئی اہمیت نہیں' جو تمہیں مل رہی ہے؟"

سجاو نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"جانتے ہو' عاطر اور عامر مجھے چھونے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں اور میں انہیں موقع نہیں دیتی۔"

"یہ ان کا مزاج ہے۔ میں ایسا نہیں ہوں۔" سجاو نے خشک لہجے میں کہا۔

"میں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تم میں لطیف باتوں کو سمجھنے کی اہلیت نہیں ہے۔" وہ غصے سے بولی۔

"میرے نزدیک یہ لطافت نہیں' کثافت ہے۔"

"ہاؤ اسٹوپڈ۔ اچھا یہ بتاؤ' پارٹنر بننا اتنی بڑی بات کیوں لگتا ہے تمہیں۔"

"اس میں معنویت اور گہرائی ہے۔ یہ دیرپا اور باضابطہ ہوتا ہے۔"

سیماب نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ "او مائی گاڈ..... تم بہت فرسودہ آدمی ہو۔"

"مجھ سے کچھ کہا تم نے؟" سجاو نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ تم پکوڑے کھاتے رہو۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر سیماب ہی نے اس خاموشی کو توڑا۔ "میں جانتی تھی کہ تم ایسے ہی ہو۔ پھر بھی....."

سجاو نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آج ذرا مجھے صاف صاف بتا دو کہ میں کیسا ہوں..... اور تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔"

"ضرور بتاؤں گی۔" سیماب نے غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔ "تم بیک ورڈ' شائی' تھرڈ ریٹ اور بزدل ہو۔"

نہ کرنے کو بزدلی سمجھتی ہوں۔ جو جی میں آئے وہ کر گزرنے کی قائل ہوں میں۔ تمہیں اچھی نہیں لگتی تو نہ سہی۔ میں بدلنے والی نہیں۔"

"ہم دونوں بالکل مختلف ہیں ایک دوسرے سے..... بلکہ ضد ہیں۔" سجاد نے آہ بھر کر کہا پھر جل کر بولا۔ "کاش تم یہاں آئی ہی نہ ہوتیں۔"

"اب تو کچھ ہو نہیں سکتا۔ اور یہ بھی سن لو کہ تم مجھے بہت برے لگتے ہو....." وہ کہتے کہتے رکی پھر اضافہ کیا۔ "کبھی کبھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ تم مجھے بہت اچھے بھی لگتے ہو۔" اس کے لہجے میں الجھن تھی اور وہ بے بسی سے ہاتھ مل رہی تھی۔

"ادھر بھی یہی حال ہے۔" سجاد نے کہا۔

"مگر ایک بات بتا دوں۔ ہمیشہ یاد رکھنا۔ ہر جگہ تمہارے پیچھے آؤں گی میں۔ تمہارا کبھی پیچھا نہیں چھوٹے گا مجھ سے۔"

"میں پیچھا چھڑانا بھی نہیں چاہتا۔" سجاد نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"جب چاہو گے، تب بھی نہیں چھوڑوں گی۔"

○

اس وقت تو سجاد کو خیال بھی نہیں تھا مگر اب وہ جانتا تھا کہ وہ بڑا سچا لمحہ تھا..... اور سیماب نے زندگی کا سب سے بڑا سچ بولا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ سیماب نے کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ مگر وہ خود بھی سچا ثابت ہوا۔ اس نے بھی کبھی سیماب سے پیچھا نہیں چھڑانا چاہا۔ وہ آج بھی اس کے دل و دماغ پر اسی طرح قابض تھی۔ اسی لئے تو آج وہ اس سے ملنے کے انتظار میں ایک ایک لمحہ شمار کر رہا تھا۔

اس پر اس نے چونک کر گھڑی میں وقت دیکھا مگر وقت تو جیسے ٹھہر گیا تھا..... گزر ہی نہیں رہا تھا۔ گیارہ بج کر بائیس منٹ!

اور وہ صرف بیتے ہوئے لمحوں کے دامن میں ہی پناہ لے سکتا تھا!

○

کالج کے معاملے میں سیماب نے بڑی رازداری سے کام لیا اور اسے پتا ہی نہیں چلنے دیا کہ وہ کہاں داخلہ لے رہی ہے۔

اس روز ایک خالی پیریڈ تھا۔ سجاد کامن روم جانے کی غرض سے کلاس سے نکلا تو فرسٹ ایئر کے کلاس روم سے سیماب کو نکلتے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ سیماب نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' سیماب بول پڑی۔ "ارے.... تم یہاں

وہاٹ اے سرپرائز۔"

"یہ تو مجھے کہنا چاہیے۔"

"پھر میں کہہ رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تم اس کالج میں پڑھتے ہو۔"

"جھوٹ مت بولو۔ سیکڑوں بار تمہیں اپنی کالج کا نام بتا چکا ہوں میں۔"

"ضرور بتایا ہو گا۔ مگر اسکول اور کالج کا نام دھیان سے کون سنتا ہے۔ بہرحال مجھے خوشی ہوئی اس اتفاق پر۔"

سجاد کا خون کھولنے لگا۔ وہ کتنی ڈھٹائی سے اسے اتفاق کہہ رہی تھی۔ "کیوں؟" اس نے ترشی سے پوچھا۔

"فرسٹ ایئر فول بننا ہے تو کسی اپنے ہی کے ہاتھوں بن لوں۔"

"تمہیں کون فول بنا سکتا ہے۔" سجاد نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا "ارے مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ الٹا میں پریشان ہو گیا ہوں۔"

"کیوں بھئی؟"

"میری چھٹی حس مجھے بتا رہی ہے کہ تمہاری یہاں آمد مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔" سجاد نے کہا۔ اس وقت اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس نے کس قدر سچی بات کہی ہے۔ آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں پریشانی ہوئی۔" سیماب نے کہا۔

"چلو' کوئی بات نہیں۔ ایک سال ہی کی تو بات ہے۔" سجاد بے پروائی سے بولا۔

"وہ کیسے؟" سیماب نے بھنویں اچکائیں۔

"میں ایک سال بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم یہاں رہ جاؤ گی۔"

سیماب نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "تم ایک بات بھول رہے ہو۔"

"وہ کیا؟"

"میں نے کہا تھا کہ میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔"

"چلو... دیکھیں گے۔"

"اچھا... چھوڑو اس بات کو۔ لڑ کر کیوں وقت ضائع کرتے ہو۔ اس وقت کہاں جا رہے تھے؟"

"خالی پیریڈ ہے۔ میں نے سوچا..."

"کہ مجھے چائے پلا دو۔ ہے نا؟" سیماب نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا "دیکھو نا' آج کالج میں میرا پہلا دن ہے۔"

"جی نہیں۔ میں کامن روم جا رہا ہوں۔"

"چائے پلا دو نا۔" سیماب ٹھنکی۔

"میں نے کہا نا' میں کامن روم جا رہا ہوں۔"

"تو چلو۔ میں بھی چلتی ہوں۔"

"ضرور چلو۔" سجاد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ اس وقت اسے خیال بھی نہیں آیا کہ چائے پلا دینے ہی میں عافیت ہے۔

گرلز کامن روم اور بوائز کامن روم برابر برابر ہی تھے۔ وہاں پہنچ کر سجاد نے سیماب سے کہا۔ "اب میری جان چھوڑ دو۔ یہ رہا گرلز کامن روم۔"

"میں تو گرلز اور بوائز کامن روم کی تفریق کو نہیں مانتی۔ کامن روم تو بس کامن روم ہوتا ہے۔ جس میں میرا جی چاہے گا' جاؤں گی۔"

سجاد کا چہرہ فق ہو گیا۔ یہ افتاد تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ "دیکھو' یہاں من مانی نہیں چلے گی۔ یہ کالج کے ڈسپلن کا معاملہ ہے۔ پرنسپل صاحب بہت سخت آدمی ہیں۔"

"کچھ بھی ہو۔ میں تو تمہارے ساتھ چلوں گی۔" سیماب اڑ گئی۔ "چلو ایسا کرو کہ تم گرلز کامن روم میں چلے چلو۔"

"یہ... یہ کیسے ممکن ہے۔" سجاد اور گڑبڑا گیا۔

"بس تو پھر میں تمہارے ساتھ بوائز کامن روم میں چلتی ہوں۔ جواب دہی میں خود کر لوں گی۔"

سجاد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کچھ بھی سہی' سیماب اس کی کزن تھی۔ عتاب اس پر بھی آتا۔ وہ گھبرا کر فرار کی راہ سوچنے لگا۔ "واقعی..... میں بڑا بے مروت ہوں۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "تمہارا پہلا دن ہے کالج میں۔ چلو، تمہیں چائے پلواؤں۔"

"اب تو میں کامن روم میں ضرور جاؤں گی۔"

"پلیز سیماب....." وہ گھگیانے لگا۔

سیماب چند لمحے سوچتی رہی۔ "اچھا.... اگر چائے پلوانے کا پکا وعدہ کرتے ہو تو میرا بھی وعدہ ہے کہ ٹیبل ٹینس کا صرف ایک گیم کھیلوں گی۔"

سجاد چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ضد پوری کئے بغیر نہیں مانے گی۔ "اچھا.... چلو۔" اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

وہ دونوں کامن روم میں داخل ہوئے۔ وہاں دس بارہ لڑکے پہلے سے موجود تھے۔ دو شطرنج کھیل رہے تھے۔ چار کیرم بورڈ پر مصروف تھے۔ ٹیبل ٹینس کی دونوں میزیں گھری ہوئی تھیں۔ کسی کو ان دونوں کی آمد کا پتہ بھی نہیں چلا۔

"ایکسکیوز می حضرات!" سیماب نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

کامن روم میں نسوانی آواز بم کا دھماکا ثابت ہوئی۔ سب لڑکوں نے چونک کر دیکھا۔ سیماب کو دیکھ کر ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کھیل ایک دم موقوف ہو گیا۔

"پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میں سیماب ہوں.... فرسٹ ایئر فول۔"

سجاد سناٹے کے عالم میں کھڑا تھا۔ لڑکوں کی بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی۔

سیماب چند لمحے کسی ردعمل کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ سامنے نہیں آیا۔ "کیا آپ لوگ مجھے خوش آمدید نہیں کہیں گے؟"

اس پر لڑکوں کا جمود ٹوٹا۔ قمر نے جو سجاد کا دوست تھا' بلند آواز میں کہا۔ "ویل کم مس سیماب۔"

پھر سب لڑکے اپنی اپنی بولی بولنے لگے۔ اچھی خاصی دوستانہ فضا بن گئی۔

"تو میں کھیل سکتی ہوں؟"

اس سوال پر پھر خاموشی ہو گئی۔ "پرنسپل صاحب کو یہاں آپ کی موجودگی کا بھی

پڑ چل گیا تو آپ مصیبت میں پھنس جائیں گی۔" قمر بولا۔

"لیکن پرنسپل صاحب کو پتا چلے گا کیسے؟" سیماب نے معصومیت سے پوچھا۔ سب لڑکے چہرے پر الجھن لیے سوالیہ نظروں سے اسے تکتے رہے۔

"میرا مطلب ہے، آپ لوگ نہیں بتائیں گے تو کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔" کچھ سر اثبات میں ہلے مگر کچھ چہروں پر پریشانی بھی ابھری۔ "اس صورت میں ہم سب بھی پھنس جائیں گے۔" قمر نے کہا۔

"پتا چلے گا ہی نہیں۔" سیماب نے زور دے کر کہا۔

"یہ بہت بڑا رسک ہے مس سیماب۔" ایک اور لڑکا بولا۔

"آپ لوگ میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتے؟" سیماب دل آویز انداز میں مسکرائی۔

"کیوں نہیں.... کیوں نہیں...." کئی آوازیں ابھریں۔

لیکن قمر اب بھی مخالفت کر رہا تھا۔ اس نے کہا "ہم سب کالج سے نکالے بھی جا سکتے ہیں۔"

"میں صرف ایک گیم کھیلوں گی۔" سیماب نے بے حد لجاجت سے کہا۔

سجاد خاموش کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ سب سیماب کی طرف اس طرح متوجہ تھے کہ انہیں اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

"چلیں.... ٹھیک ہے۔" قمر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد رضامندی میں سر ہلایا۔ اس کے ساتھ ہی امیدواری کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سب اپنی اپنی کہنے لگے۔

"آپ مجھ سے کھیل لیں۔"

"تم شطرنج کھیل رہے تھے۔ کھیلتے رہو.... اور ہاں، تم کیرم میں لگے رہو۔"

"کیرم کھیلنے کا یہ مطلب نہیں کہ میں ٹیبل ٹینس نہیں کھیل سکتا۔"

"بات سنیں، ڈبلز میں کیوں نہ کھیلیں۔" ایک لڑکے نے امکانات بڑھانے کی کوشش کی۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" سیماب نے شاہانہ انداز میں کہا۔

"بس تو آپ میری پارٹنر بن جائیں۔ میں بہت اچھا کھیلتا ہوں۔"

اس پر پارٹنر بننے کے امیدواروں میں بحث شروع ہو گئی۔ اور جتنے موجود تھے، سب ہی امیدوار تھے۔ سجاد سیماب کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ سیماب بہت خوش تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ایسی ہی فضا میں تو وہ خوش رہتی تھی۔

امیدواروں کی بحث کسی نتیجے پر پہنچنے والی نہیں تھی۔ بالآخر سیماب کو مداخلت کرنا پڑی۔ "ایکسکیوز می۔" اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

سب خاموش ہو کر اسے تکنے لگے۔

"آپ خوامخواہ لڑ رہے ہیں۔" سیماب نے کہا۔ "میرا پارٹنر تو موجود ہے۔ اور ہمارے خلاف کھیلنے کے لئے بھی لڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں روز ایک گیم کھیلا کروں گی۔ سب کی باری آ جائے گی۔"

"مگر آپ کا پارٹنر کون ہے؟"

"میٹ مائی کزن، سجاد حمید۔" سیماب نے سجاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔

سب لڑکوں نے پہلی بار سجاد کو دیکھا۔ "یہ.... یہ.... آپ کے کزن" قمر ہکلایا۔

"جی ہاں۔ میں ان کے ساتھ کھیلوں گی۔"

سجاد کو تماشا بننے کا احساس ہونے لگا۔ "میں نہیں کھیلنا چاہتا۔" اس نے آہستہ سے سیماب سے کہا۔

"میں کسی اور کو پارٹنر بنا لوں تو برا مت ماننا۔" سیماب نے سرگوشی میں دھمکی دی۔

سجاد نے خاموشی سے ایک لڑکے سے ریکٹ لے لیا۔

یوں گیم شروع ہوا۔ مخالف ٹیم کے سلسلے میں بحث نہیں ہوئی۔ شاید لڑکوں نے سمجھ لیا تھا کہ دیکھنے میں زیادہ لطف آئے گا۔

گیم سیماب اور سجاد نے بہ آسانی جیت لیا۔ مخالفین سے کھیلا ہی نہیں گیا۔ حالانکہ وہ بہت اچھے کھلاڑی تھے۔

"تھینکس فار آل آف یو۔" سیماب نے کامن روم سے نکلتے ہوئے کہا۔ "پھر ملیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں کالج کی کینٹین میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سجاد سوچ رہا تھا کہ اب اس کالج میں زندگی آسان نہیں رہے گی۔ کتنی دشوار ہو جائے گی' اس کا وہ اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ "کوئی بات نہیں۔ ایک سال ہی کی تو بات ہے۔" اس نے خود کلامی کی۔

"کیا کہا؟" سیماب نے چونک کر پوچھا۔

"کہا تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو بس سوچ رہا ہوں۔"

"ٹھیک سوچ رہے ہو۔" سیماب مسکرائی۔ "ہم بس ایک سال کے لئے دور ہوں گے۔ اس کے بعد پھر مل جائیں گے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا....."

"میں جانتی ہوں۔" سیماب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مگر تم بھول رہے ہو۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کہا ہے کہ تمہاری جان کبھی نہیں چھوڑوں گی۔"

سجاد کے ہونٹوں پر دھ گزر کرنے والی مسکراہٹ ابھری۔ "کوئی بات نہیں یہی۔ دیکھا جائے گا۔"

○

کالج میں ایک قمر ہی ایسا تھا' جس سے سجاد کی گہری دوستی اور بے تکلفی تھی ورنہ عام طور پر وہ بہت لئے دیئے رہنے کا قائل تھا۔ مگر اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ پورے کالج کے لڑکے اس سے بے تکلف ہو گئے ہیں۔ وہ بھی' جنہیں وہ جانتا تک نہیں تھا' اس سے سلام دعا کرنے لگے۔

"یہ سب کمالات ہیں تمہاری کزن کے۔" قمر نے کینٹین میں چائے پیتے ہوئے تبصرہ کیا۔ "اگر کالج کی یونین کا انتخاب لڑو تو تمہیں کوئی نہیں ہرا سکتا۔"

"کہاں کی ہانک رہے ہو۔" سجاد نے بدمزگی سے کہا۔

"سچ کہہ رہا ہوں۔ تم کالج کی مشہور ترین شخصیت بن چکے ہو۔ سب تمہیں جانتے ہیں۔ سب تم سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔"

"مگر کیوں؟"

"کزن کے کمالات۔" قمر نے گہری سانس لے کر کہا۔ "سیماب ہر ایک سے یہی

سمجھتی ہے کہ اپنے کزن کی مرضی کے بغیر وہ کسی سے بات بھی نہیں کر سکتی۔ ساتھ ہی یہ بھی جتاتی ہے کہ سجاد اور اس کا کوئی ایسا ویسا تعلق بھی نہیں۔ وہ یہیں جتا رہی ہے کہ دراصل وہ سیٹ ابھی خالی ہے۔ مرضی بدلی جا سکتی ہے۔ مگر کزن سجاد کی تائید ضروری ہے۔"

سجاد نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "کاش یہ سال جلدی ختم ہو جائے۔"

"ویسے تمہاری کزن ہے بہت زوردار چیز۔" قمر نے کہا۔

سجاد نے سر اٹھا کر اسے بے حد کڑی نظروں سے دیکھا۔ "تم تمیز سے بات نہیں کر سکتے؟" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا۔" قمر نے جلدی سے معذرت پیش کی۔ "دراصل تمہاری کزن کے معاملے میں کسی کو بھی صحیح لفظ نہیں سوجھتے۔ زوردار چیز سے میرا وہ روایتی مطلب نہیں تھا۔ حالانکہ وہ اس پر بھی پوری اترتی ہے..."

اس پر سجاد نے پھر اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔

"میرا مطلب تھا کہ آنسہ سیماب بہت زبردست لڑکی ہیں۔" قمر نے تیزی سے کہا۔ "وہ جو سوچتی ہیں، اسے پورا بھی کرتی ہیں۔ اپنی بات پر کسی سے بھی عمل کروانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی حیثیت کالج کی ملکہ کی سی ہو گئی ہے۔ یہ کہنا چاہتا تھا میں... اور منہ سے زوردار چیز نکل گیا... ارر ہپ۔"

"میں تو تنگ آ گیا ہوں یار۔" سجاد نے جھلا کر کہا۔

"تم ہی نہیں، کالج کے تمام لڑکے بھی تم سے تنگ آ چکے ہیں۔"

"چھوڑ یار، چائے تو سکون سے پینے دے۔"

○

گیارہ بج کر پینتیس منٹ!

اس روز سجاد کو پتا چلا کہ سیماب بار بار چیلنج کس بنیاد پر کرتی ہے کہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

وہ پریکٹس کر کے گھر آیا تو خالہ اور خالو آئے ہوئے تھے۔ وہ انہیں سلام کر کے وہیں بیٹھ گیا۔

"ارے بھئی سجاد! تم نے بھی بتلایا نہیں کہ آگے تمہارا کیا کرنے کا پروگرام ہے؟" خالہ نے اس سے کہا۔

"میٹرک کے بعد انشاء اللہ آئی بی اے میں ایڈمیشن لوں گا۔ پہلے بی بی اے پھر ایم بی اے کروں گا۔" اس نے جواب دیا۔

خالہ اچھل ہی پڑیں۔ "اچھا... تم بھی ایم بی اے کرو گے؟"

"کیا کوئی اور بھی کر رہا ہے خالہ؟ فاطر یا عامر؟"

"ان کا تو مجھے نہیں پتا لیکن سیماب کا یہی ارادہ ہے۔"

سجاد کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ سیماب! لیکن کسے کیسے معلوم کہ... وہ اپنی حیرت چھوڑ کر خالہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو اب اسی سے مخاطب تھیں۔

"ان دونوں کے خیالات اور عزائم کتنے ملتے جلتے ہیں۔" خالہ کہہ رہی تھیں۔ "سجاد کا تو اب پتا چلا ہے ورنہ میں یہی سمجھتی کہ سیماب نے اس سے متاثر ہو کر ایم بی اے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن سیماب نے تو میٹرک کرتے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ایم بی اے کرے گی۔"

سجاد کو یاد آ گیا۔ سیماب ہمیشہ چیلنج کرتی تھی کہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ تو یہ بات تھی۔ لیکن اسے معلوم کیسے ہوا کہ وہ ایم بی اے کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات تو کبھی ان کے درمیان ہوئی ہی نہیں۔ وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

کمرے میں سیماب موجود تھی۔ "ارے.... تم سے کب پیچھا چھوٹے گا میرا؟" سجاد نے جان بوجھ کر یہ جملہ کہا۔ وہ اسے کریدنا چاہتا تھا۔

"کبھی نہیں۔ میں ہر جگہ تمہارا پیچھا کروں گی۔"

"مگر کیسے؟ تمہیں کیا معلوم کہ انٹر کے بعد میں کیا کروں گا۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ مگر میں ایم بی اے ضرور کروں گی۔" سیماب کے لہجے میں شوخی تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں ایم بی اے کروں گا۔" سجاد نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"میرے دل نے بتایا تھا۔ تمہاری کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی۔"
اس سے زیادہ سجاد اس سے اگلوا نہیں سکا۔ بس اتنا اس نے سمجھ لیا کہ اس سے واقعی پیچھا نہیں چھوٹے گا۔ اگلے ہی لمحے اس کا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ وہ اس سے پیچھا چھڑانا ہی کب چاہتا تھا۔ بات اتنی سی تھی کہ وہ اسے پریشان بہت کرتی تھی۔

○

گیارہ بج کر چالیس منٹ!
یہ تعلیمی سال بھی پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اختتام کے قریب پہنچ گیا مگر وہ سال تھا بڑا ہنگامہ خیز۔ اور سب ہنگاموں کا سبب ایک ہی تھا.... سیماب! اس نے صحیح معنوں میں سجاد کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ اسے پہلی بار پتا چلا کہ وہ بلیک میل کرنا بھی جانتی ہے۔ وہ واحد لڑکی تھی، جو دھڑلے سے لڑکوں کے کامن روم میں جاتی اور کھیلتی۔ سجاد اسے کسی بات سے روکنے کی کوشش کرتا تو وہ بلیک میلنگ پر اتر آتی "کاشف نے مجھے پکنک کی پیشکش کی ہے۔" وہ اسے بتاتی۔
"کہاں کا پروگرام ہے؟"
"میں نے پوچھا تھا کاشف سے۔ وہ کہنے لگا، جہاں ہم تم اکیلے ہوں، وہ جگہ ویران ہو وہ بھی ہر پکنک اسپاٹ سے خوب صورت لگے گی۔"
"کیا مطلب؟ تم دونوں۔ بس تم دونوں...."
"ہاں.... یہی تو کہہ رہا ہے وہ۔" سیماب اس کے تمتماتے ہوئے چہرے کو بغور دیکھتی۔
"تم نے منع کر دیا نا؟" وہ پرامید لہجے میں پوچھتا۔
"نہیں بھئی۔ ایسی مخلصانہ پیشکش سے انکار کیسے ممکن ہے۔ لیکن میں نے کہہ دیا کہ چلنا ہے تو کلری جھیل چلو۔"
"کلری جھیل.... اور صرف تم دونوں؟"
"کیا حرج ہے اس میں؟ میں جانتی ہوں، وہ اچھا لڑکا ہے۔"
"تنہائی میں کوئی لڑکا اچھا نہیں ہوتا۔" سجاد لرزتی آواز میں کہتا۔
"وہم ہے تمہارا۔ میں نے تو تنہائی میں کبھی کسی کو برا نہیں پایا۔"

سجاد کی سانسیں رکنے لگیں۔ "تو تم ملتی رہی ہو لڑکوں سے؟"

"بارہا۔" سیماب نے کندھے جھٹک دیئے۔

"اب تک کس کس کو یہ اعزاز عطا کر چکی ہو تم؟" سجاد اب غصے میں تھا۔

"تمہیں نہیں یاد۔ ہم تم بارہا تنہا رہے ہیں۔"

"میری اور بات ہے۔" سجاد نے سکون کی سانس لی۔

"اور عاطر عامر بھی۔" سیماب نے کہا۔ "سب اچھے ثابت ہوئے۔ بس تم خشک اور بور ہو۔ عاطر اور عامر رنگین باتیں کرتے ہیں۔"

"تعریف کا شکریہ۔" سجاد نے خشک لہجے میں کہا۔

"کاشف نے کہا ہے کہ جمعے کو چلیں گے۔ اس کے پاس بائیک ہے نا۔"

"تم ہرگز نہیں جاؤ گی۔" سجاد نے سخت لہجے میں کہا۔

"بھئی، میں بور ہو رہی ہوں بہت۔"

"میں نے کہا نا....."

"تم کیوں پابندیاں لگاتے ہو مجھ پر؟ میں نے پاپا سے اجازت لے لی ہے۔" سیماب کہتے کہتے رکی اور چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ "ارے تمہارے پاس تو گاڑی ہے۔ جمعے کو کلفٹن لے چلو مجھے۔ مجھے کاشف سے کوئی خاص دلچسپی تو نہیں۔"

"چلو، ٹھیک ہے۔" سجاد مان جاتا مگر اس بلیک میلنگ پر کڑھتا رہتا۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اب بلیک میل نہیں ہو گا۔ مگر سیماب کے سامنے اس کے فیصلے یوں ڈھیر ہو جاتے تھے، جیسے ساحل پر سر پٹکنے والی موجوں کے سامنے مٹی کے گھروندے۔

اس روز ان دونوں کا پیریڈ خالی تھا۔ سیماب نے کہا۔ "چائے تو پلواؤ یار۔"

"یہ یار وار مت کہا کرو۔" سجاد چڑ کر بولا۔

"سب لڑکیاں ایسے ہی بات کرتی ہیں۔" سیماب نے معصومیت سے کہا۔

"تم مت کیا کرو۔ سب کو چھوڑو۔"

"اچھا، تم سے نہیں کروں گی۔"

"کسی سے بھی نہیں کرو گی۔" سجاد نے درشتی سے کہا۔

"اچھی زبردستی ہے۔ چلو چھوڑو، چائے تو پلواؤ۔"

"یہ کون سی بڑی بات ہے۔ چلو کیفے
شبستان میں چلیں گے۔"
"نہیں۔" سیماب نے برا سا منہ بناتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیفے
شبستان میں چلیں گے۔"
کیفے شبستان کالج کے قریب ہی تھا۔ سجاد اکثر دوستوں کے ساتھ وہاں جاتا رہتا تھا
لیکن سیماب کے ساتھ کیفے شبستان جانے کا تصور بھی محال تھا۔ وہ بری طرح گڑبڑا گیا
"وہاں میں نے کبھی لڑکے لڑکیوں کو ایک ساتھ نہیں دیکھا۔" اس نے گھبرا کر کہا۔
سیماب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "بالکل ہی بونگے ہو یار۔ وہاں فیملی روم بھی تو
ہیں۔"
"تمہیں کیسے معلوم؟" سجاد نے اسے شک آمیز نظروں سے دیکھا۔
"ارے بھئی، کالج کی سبھی لڑکیاں وہاں کسی نہ کسی کے ساتھ جا چکی ہیں۔"
"تم بھی جا چکی ہو؟"
"نہیں۔ لیکن آج جانا چاہتی ہوں۔ مجھے ریسٹورنٹ اور ہوٹل بہت اچھے لگتے
ہیں۔ اب چلو بھی۔" سیماب نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے گھسیٹا۔
اس وقت وہ دونوں لائبریری میں تھے۔ اس طرح ہاتھ پکڑنے پر سجاد بوکھلا گیا۔
اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ "اچھا ہاتھ تو چھوڑو۔ چلتا ہوں۔"
سیماب اس کے باوجود چند لمحوں تک اس کا ہاتھ تھامے اسے عجیب سی نظروں
سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔
یوں سجاد بارہا اس کے ساتھ گھوما پھرا تھا مگر اس روز اس کی عجیب حالت تھی۔ وہ
خود کو چور محسوس کر رہا تھا۔ لگتا تھا' ہر راہ گیر اسے اور سیماب کو گھور کر دیکھ رہا ہے۔
وہ تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیماب کو اسے ٹوکنا پڑ گیا "بھاگے کیوں جا رہے ہو؟"
کیفے شبستان کے فیملی روم دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ بہت بڑا ہال تھا'
جس میں دو رویہ بڑی پشت گاہوں والی نشستیں تھیں۔ یہ گویا فیملی روم کی دو دیواریں
تھیں۔ تیسری بیچ کی دیوار تھی۔ چوتھی جانب داخلی دروازہ سمجھ لیں۔ وہاں پردہ
موجود تھا۔ جی چاہے تو پردہ کھینچ لیں۔ اور وہاں دھیمی روشنی تھی۔ بڑا رومانوی اور
خواب ناک ماحول تھا وہ۔ مگر سجاد کا وہاں دم گھٹ رہا تھا۔

ہل میں داخل ہو کر خالی نشست کی تلاش میں آگے بڑھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ تقریباً تمام میزیں بھری ہوئی ہیں۔ اور وہاں جوڑے ہی جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ بہرکیف خاصا اندر جا کر انہیں بھی ایک میز میسر آ ہی گئی۔ راستے کے دوسری طرف والی میز پر بھی ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ وہ یوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے، جیسے گرد و پیش سے ان کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ انہوں نے پردہ بھی نہیں کھینچا ہوا تھا۔ سجاد کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ جلدی سے چائے پی کر وہاں سے نکل بھاگے۔ اس خیال سے اس نے ویٹر کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن دور دور تک ویٹر کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ اٹھنے لگا تو سیماب نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کہاں بھاگے جا رہے ہو۔؟"

"ویٹر کے لئے.... آرڈر دینا ہے نا۔"

سیماب ہنسی۔ "یہاں ویٹر کے دیر سے آنے کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے ویٹر دیر سے آتے ہیں۔"

سیماب کی ہنسی کی وجہ سے دوسری طرف بیٹھے ہوئے جوڑے کو پہلی بار ان کی موجودگی کا احساس ہوا۔ لڑکے نے جلدی سے پردہ کھینچ لیا۔

"کیوں؟ میں سمجھا نہیں؟" سجاد نے سیماب سے پوچھا۔

"عجیب بے وقوف آدمی ہو۔" سیماب نے برا مانتے ہوئے کہا۔ "بھئی، یہاں بس رسماً" کچھ کھایا پیا جاتا ہے۔ لوگ یہاں تنہائی کے لئے آتے ہیں۔ اور ویٹر کو بل جتنی ٹپ دی جاتی ہے۔"

سجاد کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "لاحول ولا قوۃ...."

"کوئی غائب نہیں ہو گا لاحول سے۔ یہ سب انسان ہیں۔"

"میں ویٹر کو بلاتا ہوں۔" سجاد پھر اٹھنے لگا۔

"بیٹھے رہو آرام سے۔" سیماب نے سخت لہجے میں کہا پھر وہ مزے سے باتیں کرنے لگی۔ لیکن سجاد کچھ سن نہیں رہا تھا۔ اسے تو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد ویٹر آیا۔ اس نے اسے چائے اور کیک پیس لانے کو کہا اور سکون کی سانس لی۔ وہ جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

ویٹر کے جانے کے بعد سیماب نے سجاد سے کہا۔ "ذرا یہ پردہ کھینچ دو۔"

"کک..... کیوں؟"

"اس لئے کہ یہ یہاں اسی لئے لگایا گیا ہے۔"

"چھوڑو..... رہنے دو۔"

"میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گی۔" سیماب نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"کیا ضرورت ہے اس کی؟"

اتنی دیر میں ویٹر چائے اور کیک پیس لے آیا۔ اس کے جانے کے بعد سیماب نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ "کھانے پینے کی چیزوں کو نظر بھی لگ جاتی ہے۔ ہر آنے جانے والا گھورتے ہوئے گزرتا ہے۔ پردہ کھینچ دو۔"

سجاد نے پہلی بار سیماب کو بہت غور سے دیکھا۔ وہاں وہی ایک ایسی تھی جسے نظر لگنے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ اس لمحے وہ اسے بہت اچھی لگی۔ اس نے پردہ کھینچ کر برابر کر دیا۔ اب وہ خلوت میں تھے۔

سیماب چائے بنا رہی تھی۔ نظروں کی چبھن محسوس ہوئی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سجاد اسے والہانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تم بہت اچھی..... بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔"

"یا تو گھگھی بندھی جا رہی تھی یا پردہ کھینچتے ہی میرے حسن کی تعریفیں شروع کر دیں۔ اس کے بعد دست درازی بھی کرو گے۔"

سجاد کھسیا گیا۔ "جی نہیں۔ تم جانتی ہو' میں ایسا نہیں ہوں۔"

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ دل سیماب کو چھونے کو مچل رہا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ تنہائی کتنی فتنہ انگیز ہوتی ہے۔

سیماب نے چائے بنا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ چائے پینے کے دوران میں وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اچانک سیماب نے پوچھا۔ "سچ سچ بتاؤ۔ کیسا لگ رہا ہے تمہیں؟"

"اچھا بھی لگ رہا ہے اور برا بھی۔ ہے نا عجیب بات۔"

"تم آدمی ہی عجیب ہو۔" سیماب نے بھنا کر کہا۔ "تم جیسے لوگ کبھی خوش نہیں

وہ سکے۔

چائے کے بعد وہ ویٹر کا انتظار کرتے رہے۔ تھک آکر سجاد نے کہا۔ "چلو کاؤنٹر پر ہی بل دے دیں گے۔"

"اچھا نہیں لگتا۔" سیماب نے کہا "پردہ ہٹا دو۔"

ذرا دیر بعد ویٹر گزرا تو سجاد نے اس سے بل لانے کو کہا۔

باہر نکل کر سجاد نے سکون کی سانس لی۔ لیکن ہاتھ پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ کر اس کا منہ بن گیا۔ "میرا ایک پیریڈ نکل گیا۔" اس نے تاسف سے کہا۔

"چھوڑو یار۔ پڑھائی تو تم کرتے ہی رہتے ہو۔" سیماب بولی۔

○

"یہ تم کل آخری پیریڈ میں کہاں غائب ہو گئے تھے؟" اگلے روز قمر نے سجاد سے پوچھا۔

سجاد نے اسے کیفے شبستان کے ایڈونچر کی تفصیل سنا دی۔ وہ دلچسپی سے سنتا رہا مگر اس کی آنکھیں بھی پھیل گئی تھیں۔

سب کچھ سننے کے بعد قمر نے کہا۔ "یار سجاد، تم میرے دوست ہو نا۔ میں کچھ کہوں گا تو برا تو نہیں مانو گے؟"

"کہو نا بھائی، کیا ہے؟"

"یار، یہ تمہاری کزن بہت خطرناک لڑکی ہے۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔"

"کیا بکواس ہے؟" سجاد کو اس کی بات سچ مچ بری لگی۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ برا مت ماننا۔ تمہاری بھلائی کے خیال سے کہہ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہاتھ پاؤں بچا کر چلو۔"

"کچھ پتا بھی چلے کہ بات کیا ہے۔" سجاد نے لہجہ نرم کر لیا۔

"دیکھو یار، وہ اچھی جگہ نہیں ہے۔"

"اویں.... کالج کے لڑکے لڑکیوں سے ہی ہال بھرا ہوا تھا۔"

"تمہارا خیال ہے۔" قمر نے گہری سانس لے کر کہا۔ "وہ بدنام ریسٹورنٹ ہے۔

شہر بھر سے لوگ آتے ہیں۔ ہمارے کالج کی لڑکیاں کم ہی ہوتی ہیں..... اور وہ ہوتی ہیں' جو اچھی نہیں ہیں۔ سمجھے کچھ۔"

"مجھے تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔" سجاد نے سیماب کی صفائی پیش کرنے کی غرض سے کہا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں تو مان لو۔ اور اپنی اس کزن سے بھی ذرا دور ہی رہو۔ جانتے ہو' کالج کے کتنے لڑکے اس کی قربت کی کہانیاں سناتے ہیں۔"

"بکتے ہیں۔ وہ ایسی نہیں۔"

"چلو' نہ سہی۔ لیکن کیفے شبستان اچھی جگہ نہیں ہے۔"

"خرابی کیا ہے' یہ تو بتاؤ۔"

"دیکھو بھائی' ایسی جگہوں پر آئے دن پولیس چھاپے مارتی رہتی ہے۔ اب ذرا سوچو' چھاپا پڑا اور سب اندر۔ اور اگلے روز اخباروں میں تصویریں۔ گھر والے ضمانت کراتے پھرتے ہیں۔ ذرا سوچو تو یار۔" قمر نے ڈرامائی انداز میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

سجاد لرز کر رہ گیا۔ "تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"او بھائی' ایسا ہو چکا ہے کئی بار۔ اخبار میں تصویریں تم نے بھی دیکھی ہوں گی۔ ہاتھوں سے چہرہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں لوگ۔"

"یقین نہیں آتا۔" سجاد نے لرزتی آواز میں کہا۔

"میں نے سمجھا دیا۔ آگے تم جانو۔" قمر نے بے حد خفا ہو کر کہا۔

سجاد نے بے نیازی ظاہر کی مگر اندر سے وہ ہل گیا تھا۔ یہ چھاپے والا پہلو تو بہت ہی خطرناک تھا۔

چار دن بعد سیماب نے پھر چائے کی فرمائش کی لیکن اس بار سجاد نے صاف انکار کر دیا۔

"لیکن کیوں؟"

سجاد نے قمر سے جو کچھ سنا تھا' اس کی سماعت میں انڈیل دیا۔ "اب یہ خطرہ تو مول نہیں لے سکتے نا۔" اس نے آخر میں کہا۔

"کیا بکواس ہے یہ.... خرافات.... ہنہ۔" سیماب نے بے حد خفا ہو کر کہا۔

"میکواس نہیں، حقیقت ہے۔ اور پولیس والوں کو تو تم جانتی ہی نہیں۔ کسی کی جیب میں حمائل شریف ہو تو وہ خود رکھ لیتے ہیں اور چرس کی پڑیا برآمد کر کے دکھا دیتے ہیں۔ پھر اخبار میں تصویر، تصویر کے نیچے چٹپٹا کیپشن۔ تصویر اپنی ہو تو میرا خیال ہے، کیپشن چٹپٹا نہیں، زہریلا لگے گا۔"

"عجیب احمق ہو تم۔ یہ تو زبردست ایڈونچر رہے گا۔ اور اخبار میں تصویر کا مطلب مفت کی پبلسٹی۔"

سجاد بری طرح بھنا گیا۔ "تم کیسی عجیب لڑکی ہو۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں....."

"ہاں۔ شاید میں عجیب ہوں۔ سیماب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مگر یہ میری فطرت ہے۔ جو دل چاہے، ضرور کرتی ہوں..... اور سرعام کرتی ہوں۔ چھپ کر کچھ کرنا میری فطرت میں نہیں....."

"اس پر مجھے کیپشن یاد آ گیا" اس بار سجاد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اخبار میں لکھا ہوتا ہے..... سرعام بوس و کنار....."

سیماب کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "مجھے بات پوری کرنے دو۔" یہ کہتے کہتے اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ ایسی ہی پل پل رنگ بدلنے والی لڑکی تھی۔ "کسی کا ہاتھ تھامنے کو دل چاہے گا تو میں یہ کبھی نہیں سوچوں گی کہ کسی پبلک پلیس پر ایسا کرنا مناسب نہیں۔ میں زندگی کو انجوائے منٹ سمجھتی ہوں۔ مجھے مردوں کی طرح آزادی سے گھومنا اچھا لگتا ہے۔ نت نئے ہوٹلوں میں کھانا کھانا، چائے پینا میری ہابی ہے۔" اس کا لہجہ خوابناک ہو گیا تھا "شاید مجھ میں نسوانیت کی کمی ہے۔"

سجاد نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور فوراً ہی نظر جھکا بھی لی۔ "نہیں.....ایسا تو نہیں ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن شاید تم ذہنی طور پر اب بھی انگلینڈ میں ہو۔ تم نے ابھی تک یہ تسلیم نہیں کیا، یہ پاکستان ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہیں پتا ہی نہیں کہ انگریز یورپ میں سب سے زیادہ قدامت پسند قوم ہے۔"

"پاکستانی معیار سے وہ بے راہ رو ہیں دیکھو سیماب، سمجھنے کی کوشش کرو۔" سجاد نے اسے مشرقی روایات، اقدار اور ماحول کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی۔

سیماب برہم ہو گئی۔ "یار سجاد، تم بہت بیک ورڈ آدمی ہو۔ اس کے باوجود میں تمہیں پسند کرتی ہوں..... نجانے کیوں۔ خیر..... تو تم نہیں چلو گے؟"
"سوری۔ یہ میرے لئے ممکن نہیں۔" سجاد نے خشک لہجے میں کہا۔
سیماب پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد سجاد نے اسے شاہد کے ساتھ کالج سے باہر جاتے دیکھا۔ اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ سیماب ہر حال میں اپنی ضد پوری کرتی تھی۔
اگلے تین چار روز سیماب اس کے قریب بھی نہیں پھٹکی۔ اس دوران میں سجاد اسے مختلف لڑکوں کے ساتھ گھومتے دیکھتا رہا۔ بالآخر سجاد کا ضبط جواب دے گیا۔ اس نے موقع پا کر اسے کالج کے لاج میں گھیر لیا۔ وہ وہاں بیٹھی بظاہر کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ "یہ کیا کرتی پھر رہی ہو تم؟" سجاد نے بے حد خراب لہجے میں اس سے کہا۔
اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور فوراً ہی دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کے انداز میں بے نیازی تھی۔
"میں نے کچھ پوچھا ہے۔" سجاد نے غصے سے کہا۔
"کیا کرتی پھر رہی ہوں میں؟"
"یہ شاہد، آفاق اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ بے تکلفی..... میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔"
"تو مت کرو۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ میں بھلا اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں؟"
"یہ سب کچھ مت کرو۔"
"تمہیں کیا حق ہے یہ کہنے کا۔"
"میں تمہارا کزن ہوں۔"
"مگر میں روایتی پاکستانی لڑکی نہیں، جس کے جملہ حقوق از خود کزنز کے نام محفوظ ہوتے ہیں۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔
"دیکھو..... میری بہت توہین ہوتی ہے۔ مجھے ان کی چبھتی ہوئی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"
"چائے پینے کا موڈ ہو تو کیا کروں؟"

سجاد نے تیزی سے سوچا۔ سال ختم ہو رہا تھا۔ پھر اس عذاب سے نجات مل جاتی۔ اس وقت تک..... "مجھ سے کہا کرو۔ میں لے چلوں گا۔" اس نے زہر کے سے گھونٹ پی کر کہا۔

"یہ ہوئی نا بات۔ تو چلو۔" سیماب نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

لیکن سجاد جب بھی اس کے ساتھ کیفے شبستان میں گیا' اس پر چھاپے کی دہشت طاری رہی۔ تصور میں کبھی پولیس والے نظر آتے اور کبھی اخبار میں چھپی ہوئی اپنی اور سیماب کی تصویر اور نیچے کیپشن.....

○

گیارہ بج کر پچپن منٹ!

اب وہ آئی بی اے میں تھا۔ سیماب سے اس کا پیچھا چھوٹ گیا تھا لیکن وہ خوش نہیں تھا۔ وہ سیماب کو بہت مس کرتا تھا۔ اسے اس پر جھنجلاہٹ بھی ہوتی تھی کہ وہ اس کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔ اور وہ ساتھ ہو تو الجھن رہتی ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس پر مختلف اوقات میں بہت متضاد کیفیات طاری ہوتی تھیں۔ ابتدا میں تو آئی بی اے میں اس کا دل ہی نہیں لگا۔ سیماب اسے بہت یاد آتی تھی۔ حالانکہ آئی بی اے میں بھی لڑکیوں کی کمی نہیں تھی..... اور چند ایک تو اس پر ملتفت بھی تھیں مگر اس کا ان میں سے کسی سے راہ و رسم بڑھانے کو جی نہیں چاہا۔ وہ تو اکثر سیماب ہی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ گزرا تو اس کی سمجھ میں اپنی بے چینی کی وجہ بھی آ گئی۔ اور اسے شاک لگا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ اسے سیماب پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ کالج چھوڑنے کے بعد لاشعوری طور پر پریشان رہا کہ سیماب نجانے کتنے لڑکوں کے ساتھ چکر چلا رہی ہو گی۔ پھر یہ پریشانی تاریکی سے روشنی میں..... یعنی لاشعور سے شعور میں آ گئی۔ اس کی پریشانی اور ذہنی خلفشار کم ہو گیا۔ لیکن اس پر غصہ آنے لگا کہ وہ کتنے گھٹیا انداز میں سوچتا ہے۔ جبکہ وہ جانتا ہے کہ سیماب کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں۔ لیکن لڑکوں میں تو کوئی ایسا ویسا ہو سکتا ہے۔ اس کے اندر کسی خدشے نے چلا کر کہا۔ صرف اپنے اچھے ہونے سے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔

دن عجیب انداز سے گزر رہے تھے۔ یہاں پڑھائی کا بوجھ بہت زیادہ تھا۔ فرصت کم

بھی ملی تھی۔ خالہ کے گھر جانے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ اور سیماب نے تو آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اسے اس بات پر بھی غصہ آتا تھا۔ وہ اگر مصروف ہو گیا ہے تو سیماب تو اتنی مصروف نہیں ہے۔

لیکن آدمی کتنا ہی مصروف ہو' اس کی پریشانیاں تو پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اور پھر پریشانی کا تعلق دل سے ہو تو کیا کہنا۔ وہ ہر وقت سیماب کے متعلق سوچنے لگا۔ وہ اس وقت کیا کر رہی ہو گی۔ ہواز کا سن روم..... کیفے شبستان کا فیملی کیبن..... یہ دو جگہیں اس کے تصور میں خاص طور پر ابھرتیں۔ وہ سیماب کو ہمیشہ کسی نہ کسی لڑکے کے ساتھ دیکھتا۔ پھر اسے کیفے شبستان پر چھاپا پڑتا دکھائی دیتا۔ وہ بہت کرب ناک تصور ہوتا تھا۔ اگلے روز وہ صبح کا اخبار کھنگالتا کہ کہیں چھاپے کی خبر تو نہیں چھپی۔

بڑی بات یہ تھی کہ اس سب کے باوجود اس کی پڑھائی ٹھیک چل رہی تھی۔ کالج کی طرح آئی بی اے میں بھی وہ بہت اچھے طلبہ میں شامل ہو چکا تھا۔ سیماب کی پریشانی نہ ہوتی تو شاید پہلی ٹرم میں ہی وہ سب سے اچھا طالب علم شمار ہونے لگتا۔

کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ فون کر کے ہی سیماب کی خیریت معلوم کر لے لیکن خالہ کے گھر جانا ہی کون سی بڑی بات تھی۔ بس خود داری اسے روکتی تھی۔ اگر سیماب کو اس کا خیال نہیں ہے تو اسے بھی اس کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے۔ سیماب تو اتنی مصروف نہیں تھی۔ وہ آ سکتی تھی، مگر نہیں آئی۔ اس نے کبھی فون بھی نہیں کیا۔ تو وہ اس کے پیچھے کیوں بھاگے۔ یک طرفہ تعلق کبھی طویل اور دیرپا نہیں ہوتا۔

اس عرصے میں یہ ضرور ہوا کہ اس نے اپنے اور سیماب کے تعلق کو سمجھ لیا۔ وہ سیماب سے محبت کرتا تھا۔ عجیب محبت تھی وہ۔ سیماب کی آزادی پر وہ جلتا کڑھتا رہتا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اس کی قربت سے گھبراتا تھا۔ لیکن اس سے دور رہنا اور زیادہ تکلیف دہ تھا۔ کبھی اسے خیال آتا کہ اتنے مختلف مزاج کی لڑکی سے محبت تو جنجال ہے۔ اچھا ہے کہ یہ تعلق آپ ہی ختم ہو رہا ہے۔ مگر یہ سوچتے سوچتے دل سے ٹیسیں بھی اٹھنے لگتیں۔

اسی طرح چار مہینے گزر گئے!

وہ چھٹی کا دن تھا۔ ہفتے بھر کا تھکا ہوا' اس دن وہ بہت [illegible] تک سوتا تھا۔ اور سو

کر اٹھتے ہی پڑھائی کی فکر سوار ہو جاتی۔ آئی بی اے کے مسابقتی ماحول میں آرام کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ طلبہ پڑھائی کے دوران میں ہی آرام اور تفریح کے چھوٹے چھوٹے مواقع نکال لیتے تھے۔ گھر پر ریلیکس کرنے کا مطلب تھا کہ آپ مقابلے سے آؤٹ۔

اس روز وہ جاگا تو پڑھائی کی فکر کے ساتھ نہیں۔ وہ ایک مختلف دن تھا۔ وہ سیماب کے خیال کے ساتھ جاگا تھا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے بہت طویل خواب دیکھا ہے.... اور پورے خواب پر سیماب چھائی ہوئی تھی۔ مگر اسے خواب بالکل یاد نہیں تھا۔ جاگنے کے بعد پانچ منٹ تک وہ بستر پر بیٹھا رہا۔ وہ بے اختیار سیماب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

وہ بستر سے اس وقت اٹھا' جب اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج خالہ کے گھر ضرور جائے گا۔ ایک دن ریلیکس کرنے سے پڑھائی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا۔ الٹا فائدہ ہو گا۔ سیماب سے مل کر وہ تازہ دم اور یکسو ہو جائے گا اور پڑھائی پر زیادہ توجہ دے سکے گا۔

لیکن وہ باتھ روم سے نکلا بھی نہیں تھا کہ سیماب خود آگئی۔ وہ باتھ روم سے نکلا تو وہ کمرے میں موجود تھی۔ "اوہ' تم کب آئیں؟" اس نے حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میں اس سے پوچھا۔

"دس منٹ ہوئے ہیں۔" سیماب نے خشک لہجے میں کہا۔

سجاد پریشان ہو گیا۔ وہ ناراض لگ رہی تھی۔ "مجھ سے خفا ہو؟"

"کیا نہیں ہونا چاہیے؟" سیماب نے الٹا سوال کر ڈالا۔ "سوچتی تھی' شاید تم بہت مصروف ہو۔ آئی تو پتا چل گیا کہ تمہیں بارہ بجے تک سونے کی مصروفیت لاحق ہو گئی ہے۔"

"تم نہیں جانتیں....."

"پہلے نہیں جانتی تھی....." سیماب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مگر اب جان گئی ہوں۔"

"میری بات سنو....."

مگر ایک لمحے میں سیماب بدل گئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھرکی اور اسکا چہرہ روشن ہونے لگا۔ "چھوڑو ان باتوں کو۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔ "ان پر کر کے وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔"

سجاد جھنجلانے لگا۔ عجیب لڑکی تھی..... چھا جانے والی۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق آتے ہی شروع ہو گئی۔ اور اسے شکایت کا موقع بھی نہیں دیا۔

"اب چلو بھی۔"

"کہاں؟" سجاد نے گھبرا کر پوچھا۔

"کہیں بھی..... گارڈن میں۔"

"مگر میں نے ناشتا بھی نہیں کیا ہے۔"

"میں نے بھی ناشتا نہیں کیا ہے۔ تمہارے ساتھ ہی کروں گی۔ پھر خوب باتیں کریں گے۔"

سجاد کی جھنجلاہٹ غصے میں تبدیل ہو گئی۔ "تم نے ناشتا کیوں نہیں کیا ہے؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"دیر سے اٹھی تھی۔ بغیر ناشتے کے یہاں آ گئی۔" وہ مسکرائی۔ "میں بھی دیر تک سونے لگی ہوں۔"

"جواب دہی سے بچنے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔ آتے ہی تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

سیماب کے ہونٹوں پر تاؤ دلانے والی مسکراہٹ ابھری۔ "Best defence is to attack"

"مگر میں چھوڑوں گا نہیں....."

"پہلے ناشتا۔" سیماب نے اس کی بات کاٹ دی۔

ناشتے کے دوران میں سجاد پریشان کن سوچوں میں الجھا رہا۔ وہ بار بار سیماب کو دیکھتا۔ وہ اسے پہلے سے کمزور اور کچھ مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اور اس نے کہا تھا کہ وہ بھی دیر تک سونے لگی ہے۔ کیوں؟ وہ خود تو پڑھائی کی وجہ سے پورے ہفتے نیند پوری نہیں کر پاتا ہے۔ اس لئے چھٹی کے دن دیر تک سوتا ہے۔ اور سیماب نے جر

انداز میں کہا تھا' اس سے ایک دن دیر تک سونے کا تاثر نہیں ملتا تھا۔ لگتا تھا' وہ روز دیر سے اٹھتی ہے۔ کیوں؟ کالج کی مصروفیات.....؟ غیر نصابی مصروفیات! وہ اس بارے میں سوچتا رہا اور اس کی بھوک ختم ہو گئی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ کیرم کھیلنے بیٹھے تو سجاد نے سیماب سے پوچھا۔ "کالج کا کیا حال ہے؟" اس نے کوشش کی تھی کہ سوال سرسری انداز میں کرے۔ پھر بھی ایسے لگتا تھا کہ سیماب اس کے لہجے سے اصل بات پکڑ لے گی۔

"پہلے جیسا..... سب کچھ پہلے جیسا ہے۔ کسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بس تمہارا دوست قمر بہت بجھا بجھا رہنے لگا ہے۔"

سجاد پوچھنا چاہتا تھا..... اور تم؟ مگر ہمت نہیں ہوئی۔ پھر بھی اس نے پوچھا "تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟"

"میں تو کالج لائف کو خوب انجوائے کر رہی ہوں۔" وہ چہک کر بولی۔ "تمہارے کالج سے جانے کے بعد مصروفیات بھی بڑھ گئی ہیں۔ آزاد جو ہو گئی ہوں۔"

اب سجاد سے رہا نہیں گیا۔ "کیفے شبستان جاتی ہو؟" اس نے لہجہ سرسری رکھنے کی کوشش کی۔

"روز۔ مگر چھاپا آج تک نہیں پڑا۔" سیماب کا لہجہ مضحکہ اڑانے والا تھا۔

سجاد کا دل بجھ گیا۔ گویا اس کا اندازہ درست تھا۔ "تمہیں میں یاد نہیں آتا؟"

"آتے ہو۔ اور ہر بار غصہ آتا ہے۔ تم نے تو مجھے چھوڑ ہی دیا۔"

"مصروفیت ہی اتنی ہے۔ تمام مضامین نئے ہیں۔ بہت توجہ دینی پڑتی ہے مگر تم آ سکتی تھیں۔" سجاد نے شکایت کی۔

"میں بھی بہت مصروف ہو گئی ہوں۔ کالج سے بھی دیر سے ہی آتی ہوں....."

اب سجاد میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ کالج سے دیر سے آنے کا سبب پوچھتا۔

"اور شام کی بھی ایک مصروفیت لگا لی ہے۔" سیماب کہتی رہی۔ "کچھ میں یوں بھی نہیں آئی کہ جب تم نے چھوڑ دیا تو مجھے کیا۔ اور اتنی مصروفیات میں کسی کو یاد رکھنا آسان نہیں ہوتا۔"

"تو پھر اب کیوں آ گئیں؟" سجاد نے تلخی سے کہا۔

"میں نہیں چاہتی کہ جیسے میں تمہیں بھول گئی' تم بھی مجھے بھول جاؤ۔"

اس پر سجاد مارے غصے کے گنگ ہو گیا۔۔۔

اس کے کوئی ایک ماہ بعد خالہ ان کے ہاں آئیں۔ اکیلی تھیں۔ "افسر بھائی کیوں نہیں آئے؟" امی نے پوچھا "بہت عرصہ ہو گیا انہیں ہمارے ہاں آئے۔"

"مصروف ہی رہتے ہیں۔ کاروبار بڑھنے کے مرحلے میں ہے۔ ان دنوں کچھ پریشان بھی ہیں۔" خالہ نے کہا

"تو سیماب کو تو لے آتیں۔"

"وہ تھکی ہوئی تھی۔ بہت کہا' لیکن نہیں مانی۔"

"وہ بہت کمزور ہو رہی ہے آج کل۔" امی نے تشویش سے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

سجاد سر جھکائے بیٹھا تھا لیکن کان خالہ کی طرف لگے تھے۔

"ہر وقت پڑھائی میں لگی رہتی ہے۔ فرسٹ ایئر میں پرسنٹیج کم تھی۔ کہتی ہے' اس کی تلافی کرنی ہے۔ پھر آئی بی اے میں داخلے کی بھی اسے بڑی فکر ہے۔ اس کی تیاری الگ کرتی ہے۔ کہتی ہے' داخلے کا ٹیسٹ بہت مشکل ہوتا ہے۔ نیند تک پوری نہیں ہوتی بے چاری کی۔"

سجاد کو خالہ پر ترس آیا اور سیماب کی مکاری پر غصہ آیا شہرت پڑھائی کی۔۔۔ اور تفریح کرتی پھرتی ہے۔ زندگی کو انجوائے کرنا ضروری ہے۔۔۔۔ وہ بھی من چاہے انداز میں۔۔۔

ان دنوں سجاد' سیماب کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچنے اور کڑھنے لگا تھا۔ کبھی کبھی تو پڑھائی میں بھی دل نہ لگتا۔ وہ سوچتا' کاش یہ روگ نہ لگا ہوتا۔ تب وہ سکون اور یکسوئی سے پڑھائی کر سکتا تھا۔

تیسری ٹرم ختم ہوئی اور چھٹیاں ہوئیں تو ذرا فرصت ہوئی۔ وہ پورا دن گزارنے کی غرض سے خالہ کے گھر چلا گیا۔ وہ اپنے حساب سے کالج کی چھٹی سے پہلے گیا تھا تاکہ یہ تاثر نہ قائم ہو کہ وہ صرف سیماب کی وجہ سے آیا ہے۔ سوچا تھا' خالہ سے خوب باتیں کرے گا۔

وہ خالہ کے پاس بیٹھا' چائے پی اور ان سے باتیں کرتا رہا۔ پھر خالہ نے کہا "

سیماب سے نہیں ملو گے؟"

"وہ تو کالج گئی ہوئی ہو گی۔"

"نہیں۔ آج ہی سے چھٹیاں شروع ہوئی ہیں۔ اسی مہینے امتحان ہے نا۔ وہ اپنے کمرے میں ہے۔"

سجاد اوپر چلا گیا۔ سیماب پڑھائی میں یوں منہمک تھی کہ اسے دروازہ کھلنے اور سجاد کے اندر آنے کا بھی پتا نہیں چلا۔ بالاخر سجاد کو کھنکھار کر اپنی آمد کا اعلان کرنا پڑا۔

سیماب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "ارے تم! کب آئے؟"

"دیر ہو گئی۔ پانچ منٹ سے تو اس کمرے میں ہی ہوں۔"

"مجھے پتا ہی نہیں چلا۔"

"کوئی بہت دلچسپ ناول پڑھ رہی ہو؟"

وہ جھینپ گئی۔ "نہیں۔ کورس کی کتاب ہے۔"

"تو اتنا انہماک!"

"پورے سال پڑھائی نہیں کی ہے۔ اب امتحان سر پر آ گئے ہیں تو تیاری تو کرنی ہے۔" سیماب کے لہجے میں معذرت تھی۔

"آئی بی اے میں یوں تو ایڈمشن نہیں ملے گا۔"

"تو نہ ملے۔" سیماب نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے بہت پڑھ کر کرنا بھی کیا ہے۔ بس ڈگری میں دلچسپی ہے مجھے۔ ایم بی اے نہ سہی' ایم اے کر لوں گی۔ ایک بی ہی کا تو فرق ہے۔"

سجاد کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ کتنی بدل گئی تھی۔ "میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیوں؟ اتنی سی دیر کے لئے آئے تھے؟"

"نہیں' آیا تو دن بھر کے لئے تھا مگر تمہاری پڑھائی میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔"

"ارے چھوڑو پڑھائی کو..... ہو جائے گی۔" سیماب نے کتاب ایک طرف پٹخی اور اٹھ گئی۔ "تفریح بھی ضروری ہے پڑھائی کے لئے۔"

وہ پورا دن ان دونوں نے ساتھ گزارا۔ سیماب نے پڑھائی کا نام بھی نہیں لیا۔

انہی چھٹیوں میں ایک دن سجاد کو قمر سے ملنے کا خیال آ گیا۔ وہ ماننا نہیں چاہتا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ صرف سیماب کی وجہ سے اس سے ملنے جا رہا تھا۔

قمر اسے دیکھ کر خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ "تمہاری یاد کیسے آ گئی۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا "تم تو ہمیں یوں بھول گئے جیسے ہم کچھ ہیں ہی نہیں۔"

"یہ بات نہیں یار۔ بس فرصت ہی نہیں ملتی۔"

دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ کالج کی باتیں بھی ہوئیں پھر قمر چونکا۔ "ارے یاد۔ وہ تمہاری کزن ہے نا۔ سیماب....."

سجاد کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ "کیا ہوا اسے؟"

"ہوا تو کچھ نہیں مگر وہ بڑی باکمال نکلی۔ اس نے تو حیران کر دیا مجھے۔"

'اور اب میں حیران ہونے والا ہوں۔' سجاد نے تلخی سے سوچا۔ پھر جلدی سے بولا۔ "نام بتانے کی ضرورت نہیں۔ صرف تعداد بتاؤ؟"

"وہ کس کی؟" قمر نے حیرت سے پوچھا۔

"سیماب کے بوائے فرینڈز کی۔"

"ایسی بات ہوتی تو حیرانی کسے ہوتی۔ یار' معاملہ برعکس ہے۔"

سجاد سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس سال وہ بالکل بدل گئی۔ تم جانتے ہو کہ کالج کے تمام قابل ذکر لڑکے اس کے لئے آہیں بھرتے ہیں۔ پہلے وہ سب سے بات بھی کر لیتی تھی۔ ان کے ساتھ چائے پینے بھی چلی جاتی تھی مگر اب تو وہ کسی سے بات بھی نہیں کرتی۔ بوائز کامن روم کیا' گرلز کامن روم کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ لائبریری اس کا سب سے پسندیدہ ٹھکانہ ہے۔ خالی پیریڈ میں وہ لائبریری میں بیٹھ کر پڑھتی ہے۔ چھٹی کے بعد بھی دیر تک لائبریری میں رہتی ہے۔ وہ تو بالکل بدل گئی بھائی....."

سجاد منہ کھولے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ "لیکن وہ تو کہہ رہی تھی....."

"وہ بس یار۔ آدمی کبھی کبھی تبدیل ہو جاتا ہے اچانک۔ لیکن میں جو دیکھ چکا ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس ایک لڑکی میں کم از کم دو لڑکیاں موجود ہیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ چار ہوں۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔"

"مجھے بھی یقین نہیں آتا تھا مگر کرنا پڑا۔ اور یہ بھی سن لو کہ وہ کم از کم کالج میں ٹاپ ضرور کرے گی۔"

"حیرت ہے۔"

سجاد کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر چلا آیا۔ قمر کے پاس وہ ڈرتے ڈرتے اپنے بدترین اندیشوں کی تصدیق کے لئے گیا تھا لیکن وہاں اس کی تمام الجھنیں اور پریشانیاں دور ہو گئیں۔ اور یہ نتیجہ تو وہ پہلے ہی اخذ کر چکا تھا کہ سیماب دہری شخصیت کی مالک ہے۔

اس کے باوجود سیماب نے انٹر کے امتحان میں پورے بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی تو اسے حیرت ہوئی۔ ہاں' آئی بی اے کے ٹیسٹ میں سیماب نے ٹاپ کیا تو اسے حیرت نہیں ہوئی۔ اس وقت تک وہ اس بات پر یقین کر چکا تھا کہ سیماب جو چاہے' کر سکتی ہے۔

آئی بی اے میں داخلے کے بعد وہ پھر اس کے قریب آ گئی۔ پھر وہی متضاد کیفیات' وہی مسائل.....!

○

سجاد نے چونک کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ بارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں تیزی آ گئی۔ وصل یار کی ساعت قریب آ پہنچی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب تیاری شروع کر دے گا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ابھی اس کے پاس دس منٹ کی مہلت اور ہے۔ اور ماضی کو دہرانے میں اسے جو لطف آ رہا تھا' وہ اس سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

مگر اب اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ ہاں' وہ چھوٹے چھوٹے' لیکن اہم واقعات دہرا سکتا تھا۔

وہ پھر یادوں میں کھو گیا۔ چھوٹے چھوٹے منظر اس کی آنکھوں میں پھرنے لگے!

○

کالج کے مقابلے میں آئی بی اے کا ماحول بے حد آزاد تھا۔ وہاں لڑکے لڑکیاں

ساتھ گھومتے اور کسی کو پرواہ بھی نہیں ہوتی۔ فارغ وقت میں لان میں ہمیشہ کئی جوڑے بیٹھے نظر آتے تھے۔ سجاد کو تو کبھی اس سے غرض ہی نہیں رہی تھی۔ لیکن سیماب کو تو وہ ماحول نعمت کی طرح لگا۔ مچھلی کو خوش رنگ، شفاف پانی کا خوب صورت تالاب مل گیا تھا۔

پہلے روز وہ اسے آئی بی اے میں ملی تو بہت خوش تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ خود سجاد بھی بہت خوش تھا۔ اسے قمر کی بات یاد تھی، جس نے بتایا تھا کہ سیماب بالکل بدل گئی ہے۔ اور اس کا ثبوت بھی مل گیا تھا۔ وہ اپنی محنت اور یکسوئی کے زور پر تعلیم کے میدان میں بہت آگے نکل گئی تھی۔

"کیسا لگا تمہیں؟" سجاد نے پوچھا۔

"بہت اچھا۔ کالج سے بہت مختلف۔"

"کلاس کے طلبہ سے ملیں؟"

"ملی.... اور تین دوست بھی بنا لیے۔"

سجاد کی یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ لڑکے ہیں یا لڑکیاں۔ سیماب کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔

"مگر سچ یہ ہے کہ اپنی کلاس کے لڑکے مجھے اپیل نہیں کرتے۔ ان سے دوستی کرنے میں لطف آتا ہے، جو ہم سے آگے ہوں۔"

شاید اس کا اشارہ سجاد کی طرف تھا۔ سجاد کا چہرہ تمتما اٹھا مگر اگلے ہی لمحے اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔

"تم اپنی کلاس کے کچھ اچھے لڑکوں سے مجھے ملوا دو۔" سیماب نے فرمائش کی۔

چند لمحے تو سجاد سے بولا ہی نہیں گیا پھر اس نے کہا۔ "میری تو اپنی کسی سے دوستی نہیں ہے۔"

"تم عجیب آدم بیزار آدمی ہو۔"

"یہاں مضامین بہت وقت طلب ہیں۔" سجاد نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ "فرصت ہی نہیں ملتی۔ یاد نہیں، تم سے بھی ملنا ختم ہو گیا تھا۔"

"مجھے تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں۔ یہاں صرف ایڈمشن دشوار ہے۔ اس

لئے تو میں نے اتنی محنت کی اور اب مجھے یقین ہے کہ میں یہاں سے ڈگری لے کر ہی نکلوں گی۔"

"میں یہاں سے نالج اور قابلیت لے کر نکلنا چاہتا ہوں۔" سجاد نے خشک لہجے میں کہا۔

"وہ خود بہ خود مل جاتی ہے۔" سیماب نے بے پرواہی سے کہا۔

اس روز چھٹی کے بعد وہ ملے تو سجاد نے سیماب سے پوچھا۔ "تم آئی کیسے تھیں؟"

"پوائنٹ کی بس سے آئی تھی۔"

سجاد نے حیرت سے اسے دیکھا۔ خالو جان ایسے تو نہیں تھے۔

سیماب نے اس کی حیرت بھانپ لی۔ "پاپا تو اصرار سے گاڑی دے رہے تھے۔ میں نے خود انکار کر دیا۔"

"کیوں بھئی؟"

"ابھی میرے پاس زندگی سے لطف اٹھانے کے لئے بے فکری کے چند سال ہیں۔ انہیں کیوں ضائع کروں۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں کوئی ذمے داری اٹھانا نہیں چاہتی۔ کار کی بھی نہیں۔ میں نے پاپا سے کہہ دیا کہ سجاد مجھے لے جایا کرے گا اور اسی کے ساتھ آ جاؤں گی۔"

پہلے چند لمحوں میں تو سجاد یہ سوچتا رہا کہ یہ سجاد کون ہے اور جب بات سمجھ میں آئی تو اس نے گڑبڑا کر کہا۔ "میں.... میں تو بائیک پر آتا ہوں۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ کار کی بہ نسبت بائیک مجھے پرلطف لگتی ہے۔"

سجاد کا دل دھڑک اٹھا۔ اتنی قربت، جس کو وہ ترستا تھا۔ لیکن کہہ نہیں سکتا تھا "یور آر ویل کم۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

وہ پارکنگ کی طرف چل دیئے۔ سجاد نے کک مار کر بائیک اسٹارٹ کی اور بولا "چلو.... بیٹھ جاؤ۔"

لیکن سیماب بیٹھی تو وہ اچھل پڑا۔ اسے ایسا لگا کہ سیماب لڑکوں کے سے انداز

میں بیٹھی ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ سیماب پچھلی سیٹ پر ایک طرف ہو کر بیٹھنے کے بجائے دونوں طرف پاؤں لٹکا کر لڑکوں کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ "اس نے گھبرا کر اسے ٹوکا۔ "یہ کیسے بیٹھی ہو۔"

سیماب نے اپنا تنقیدی جائزہ لیا اور بولی۔ "ٹھیک تو بیٹھی ہوں۔"

"دونوں ٹانگیں اس طرف کر کے بیٹھو۔ جیسے لڑکیاں بیٹھتی ہیں۔"

"وہ اتنا زیادہ محتاط ہے۔ اس طرح تو میرا جسم اکڑ کر رہ جائے گا۔"

"بیوقوف بھی ہو۔ بیٹھنا تو ایسے ہی ہے۔" سجاد کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"احسان کرنے کا یہ مطلب ہے کہ تم حکم چلانے لگو۔" سیماب نے برہمی سے کہا۔

"نہ میں احسان کر رہا ہوں، نہ حکم چلا رہا ہوں۔" سجاد نے حلیمی سے کہا۔ "میں تمہیں طریقہ، قاعدہ بتا رہا ہوں۔"

سیماب پچھلی سیٹ سے اتر گئی۔ "تم پابندیاں بہت لگاتے ہو..... اور مجھے یہ بات قبول نہیں۔ تم جاؤ، میں پوائنٹ کی بس سے چلی جاؤں گی۔"

یہ ایک اور مسئلہ تھا اس کے ساتھ۔ سجاد درست ہوتا تھا۔ مگر اس کے باوجود اسے شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے کھسیا کر کہا "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟"

"میں ہر کام اپنی مرضی سے کرتی ہوں۔ یہ نہیں چلے گا کہ ایسے بیٹھو اور ایسے نہ بیٹھو۔"

"اچھا بابا، بیٹھ جاؤ اور مجھے تماشا بنوا دو۔" سجاد نے ہاتھ جوڑ لئے۔

"تمہیں تماشا بننے کی اتنی فکر کیوں رہتی ہے۔"

"اسی دنیا میں رہتا ہوں اور اسی دنیا میں رہنا ہے مجھے۔ خیر... بیٹھو۔"

اس روز سیماب کو گھر ڈراپ کرتے ہوئے وہ واپس آیا تو پورا دن اسی مسئلے پر سوچتا رہا اور کھولتا رہا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ سیماب کی اس ضد کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے گا چنانچہ اگلی صبح اس نے سیماب کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"بھئی، تمہارا میرا ساتھ چلنے والا نہیں۔" سیماب نے تیز لہجے میں کہا۔ "تم جاؤ۔ میں خود آ جاؤں گی۔"

یعنی میری بات سے۔"

"دیکھو! جن تین لڑکوں سے میری دوستی ہوئی ہے، وہ سب ایک والے ہیں۔ تم میری فکر نہ کرو۔"

سجاد گھبرا گیا۔ جانتا تھا کہ یہ خالی خولی بلیک میلنگ نہیں۔ وہ اس پر عمل بھی کرے گی۔ کالج میں اس کا تجربہ ہو چکا تھا اور وہ اسے دہرانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سو اس نے جھجکتے لہجے میں کہا۔ "چلو بیٹھ جاؤ اور جیسے جی چاہے بیٹھو۔"

"یہی کام ہنسی خوشی بھی ہو سکتا تھا۔"

"ہاں، ہو سکتا تھا۔ لیکن ہوا نہیں۔"

اس دن کے بعد یہ معمول بن گیا۔ اور سیماب صرف لڑکوں کی طرح بیٹھتی نہیں تھی۔ جب جی چاہتا، اس کی کمر تھام لیتی، کندھے پر سر لگا دیتی۔ ایسے میں سجاد کو لگتا کہ وہ بھی دہری شخصیت کا مالک ہے۔ کیونکہ ایسے میں اسے غصہ بھی آتا تھا، وہ گھبرا کر ادھر ادھر بھی دیکھتا مگر اسے خوشی بھی ہوتی تھی۔ رگ و پے میں بے خودی سے دوڑتی رہتی تھی۔

○

اب سجاد کثرت سے اپنے اور سیماب کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اب تک اسے احساس ہو چکا تھا کہ وہ سیماب سے محبت کرتا ہے۔ لیکن یہ محبت بہت دشوار اور اس کے لئے بہت بڑی آزمائش تھی۔ حالانکہ ان کی راہ میں کوئی روایتی دیوار نہیں تھی۔ خالو جان شاید اس رشتے کے حامی نہیں تھے۔ لیکن وہ روشن خیال آدمی تھے اور یہ طے تھا کہ سیماب کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کبھی نہیں کریں گے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان ایک دیوار تھی.... بلکہ دو دیواریں کہئے۔ اور وہ دیواریں وہ دونوں آپ ہی تھے۔

دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سجاد آزاد خیال ہونے کے ساتھ قدامت پرست بھی تھا۔ جبکہ سیماب ہواؤں کی طرح آزاد تھی۔ سجاد شرمیلا تھا، جبکہ سیماب بے باک تھی۔ وہ احتیاط پسند تھا اور سیماب مہم جو۔ اسے روایات عزیز تھیں اور سیماب مجسم بغاوت۔ راہ کی دیواریں گرانا سجاد کے بس کی بات نہیں تھی۔ لیکن

سیماب کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ سو اس نے کالج میں کو حسن نظر دکھایا۔ اس نے بھر دیا۔ نتیجتاً اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی اظہار محبت!

اس روز وہ دونوں لان میں بیٹھے تھے کہ رانعہ آ گئی۔ وہ سیماب کی کلاس فیلو تھی۔ اس نے آتے ہی سیماب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم یہاں بیٹھی ہو اور میں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔"

"کیا بات ہے؟ یہیں بیٹھ جاؤ۔ اس وقت اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔" سیماب نے کہا۔

"ایک بات میں کب سے کرنا چاہ رہی ہوں تم سے۔ موقع ہی نہیں ملتا مگر آج کر کے رہوں گی۔"

"تو کر لو۔"

رانعہ نے کن انکھیوں سے سجاد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اٹ از ٹو پرسنل۔"

"سجاد کی پروا نہیں کرو۔ یہ میرا کزن بھی ہے اور بچپن کا دوست بھی۔"

"تب تو اور نامناسب ہے۔ چلو نا۔" رانعہ نے اسے کھینچنے کی کوشش کی۔

سجاد بے حد مہذب اور خوش اطوار تھا۔ جانتا تھا کہ ایسے میں اسے اٹھ جانا چاہیے۔ لیکن کوئی ہنجانی حس اسے بتا رہی تھی کہ یہ کوئی بہت اہم بات ہے، جس سے اس کا تعلق بھی ہے۔ چنانچہ وہ ڈھٹائی سے بیٹھا رہا۔

"سجاد سے میں ہر طرح کی بات کر سکتی ہوں۔" سیماب نے کہا۔ "تم بے فکر ہو کر بات کرو۔"

رانعہ چند لمحے ہچکچائی پھر گھاس پر بیٹھ گئی۔ "تم جانتی ہو سیمی کہ میں پہلے ہی دن سے تمہیں پسند کرتی ہوں..... بہت زیادہ۔ جی چاہتا ہے ہمیشہ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں۔"

"جو کہ ناممکن ہے۔" سیماب نے تبصرہ کیا۔

"ایسی بات نہیں۔ سنو تو۔ تم نے میرے بھائی جان کو دیکھا ہے نا؟"

"ہاں شاید..... ابھی پرسوں ہی تمہاری سالگرہ کے دن۔"

"پرسوں انہوں نے بھی تمہیں دیکھا۔ جب سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ

شادی اسی لڑکی سے کروں گا۔"

"واہ' کوئی زبردستی ہے۔ میری مرضی کے بغیر تو نہیں کر سکتے۔" سیماب نے چیخ کر کہا۔

"ظاہر ہے۔ میں یہی تو کہہ رہی ہوں کہ تم اجازت دو تو میں امی کو تمہارے گھر بھیج دوں۔"

"اپنے دیکھے بھالے بغیر کیسے اجازت دے دوں۔"

"تم نے دیکھا تو ہے انہیں۔ اور یقین کرو' وہ بہت اچھے ہیں۔ ڈاکٹر ہیں۔"

"دیکھا تو ہے مگر ان سے ملوں' انہیں سمجھوں اور جانوں' تبھی فیصلہ کر سکتی ہوں۔ میں اندھے کنوئیں میں تو چھلانگ لگانے والی نہیں۔"

"اچھا' یہ تو بتا دو کہ گنجائش تو ہے نا۔ میں تمہاری ان سے تفصیل سے ملاقات کرا دوں گی۔"

"گنجائش تو ہے۔ اس لئے کہ میں کہیں commit نہیں ہوں۔" سیماب نے گہری سانس لے کر کہا۔

"بس تو ٹھیک ہے۔" رافعہ نے اٹھتے ہوئے کہا "میں پھر بات کروں گی۔ تم بے فکر رہو۔"

سیماب کو محسوس بھی نہیں ہوا کہ یہ سب سن کر سجاد کو چپ لگ گئی ہے۔

درحقیقت سجاد بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اسے ایسا لگا تھا کہ اس کی بے خبری میں کوئی امتحان اس کے سر پر آ گیا ہے۔ اس نے اس کے لئے تیاری بھی نہیں کی اور اب اس کے پاس وقت بھی بہت کم ہے۔ حالانکہ اس امتحان کے لئے تیاری کرنے کی اس نے کئی بار بڑے خلوص سے کوشش کی تھی۔ وہ آئینہ اسے ہر بار یہی بتاتا تھا کہ اظہار کرتے ہوئے وہ ہونق ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس نے سیماب کے سامنے اظہار کا ارادہ کیا..... کوشش بھی کی۔ لیکن آواز بند ہو جاتی تھی اور پسینے چھوٹنے لگتے تھے۔ آخر تنگ آ کر اس نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔

مگر اب اسے احساس ہوا کہ یہ ضروری ہے۔ سیماب کو commit کئے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ سیماب امی کو بھی وہی جواب دے سکتی تھی' جو اس نے رافعہ کو دیا

تھا گویا اظہار محبت لازم تھا۔ اور اس کے پاس مہلت بھی نہیں تھی۔
اس روز اس نے اظہار محبت کی فائنل ریہرسل کی۔ خوب صورت لفظ، چھتے
ابھی ملاقات کے جملے بنائے۔ اگلے روز وہ اسے اظہار محبت کرتا تھا۔
وہ سیماب کو لے کر لان میں جا بیٹھا۔ "سیماب..... سنو۔" اس نے سیماب کو پکارا
"مجھے تم سے ایک بہت خاص بات کرنی ہے۔"
سیماب نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا "بہت خاص بات!"
اس سے نظریں ملتے ہی وہ سب کچھ بھول گیا۔ ہونٹ ہلتے رہے مگر کوئی آواز
نہیں نکلی۔
"بتاؤ نا۔ کیا خاص بات ہے۔"
وہ سوچتا رہا کہ اب کیا کرے۔ ذہن اس سلیٹ کی طرح صاف تھا، جس پر ڈسٹر
پھیر دیا ہو۔ یادداشت میں کوئی ایک لفظ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ تو تمہیدی الفاظ بھی بھول
چکا تھا۔
"بتاؤ نا۔ یقیناً کوئی بہت خاص بات ہے۔" سیماب بے تاب ہو رہی تھی۔
وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ "مم..... میں..... یہ کہنا چاہتا ہوں کہ....." وہ کہتے کہتے رکا
پھر اسے کچھ سوجھ ہی گیا۔ "میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں اندھا کنواں نہیں
ہوں۔"
سیماب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "تو میں نے کب کہا کہ تم اندھا کنواں ہو۔" اس
نے حیرت سے کہا۔
"نہیں..... کہا تو نہیں۔ لیکن تم ڈرتی تو ہو اندھے کنوئیں سے۔" اس کی سانسوں
کی رفتار بڑھ گئی تھی اور آواز لرز رہی تھی۔
"یہ کب کہا میں نے۔"
سجاد کی سانسوں اور دھڑکنوں کی رفتار مسلسل بڑھ رہی تھی۔ "کہا تھا۔ تمہیں یاد
نہیں؟"
"نہیں۔ تم یاد دلاؤ۔"
"وہ تت..... تم..... کک..... کل تم رافعہ سے کہہ رہی تھیں نا۔"

سیماب نے یاد کرنے کی کوشش کی پھر اس کی آنکھوں میں چمک ابھری اور وہ چیخنے لگی "میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اندھے کنوئیں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میں اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگانے والی نہیں۔"

"وہی وہی...." سجاد نے تائید میں سر ہلایا۔ "تو میں اندھا کنواں نہیں ہوں۔"

"اچھا۔ تو کنواں تو ہو نا.... اور کنوئیں میں گرنا اچھا نہیں ہوتا۔ خواہ وہ اندھا ہو یا نہ ہو۔" سیماب نے اسے چھیڑا۔

سجاد اور گڑبڑا گیا۔ "مم.... میرا.... مم.... مطلب ہے کہ تم مجھ سے ملتی رہی ہو اور جانتی سمجھتی بھی ہو۔"

"تو پھر؟" سیماب اب اس کی حالت سے لطف لے رہی تھی۔

"وہ.... در.... دراصل میں یہ کہنا.... بب.... بات یہ ہے کہ.... "

"اصل بات بتا دو مگر بے ہوش نہ ہو جانا۔"

بے ہوش ہو جانے کے طعنے نے سجاد کو بالکل ہی گڑبڑا دیا۔ "وہ.... مم.... میں.... میں.... تت.... تت.... تم سے.... مم.... مم.... محب.... محب.... بت.... تت.... تم سس.... سمجھ رہی ہو نا؟" اب وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور جسم کا ہر مسام جیسے پسینہ اگل رہا تھا۔

اس نے سجاد کا ہاتھ تھام لیا۔ "اس میں اتنا ہانپنے کی ضرورت نہیں۔ تم سچ مچ بے ہوش ہو جاؤ گے۔" وہ بولی۔ "دیکھو' محبت وحبت کا تو مجھے پتا نہیں۔ لیکن تم جانتے ہو کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔"

سجاد نے گڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہ دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا کہ وہاں رش نہیں ہے۔ کافی دور چار پانچ طلبہ اور طالبات کی ایک ٹولی بیٹھی تھی۔ وہ بھی اپنی خوش گپیوں میں مگن تھے۔ اس طرف متوجہ نہیں تھے۔ اس کے باوجود اس نے بڑی نرمی سے سیماب کی گرفت سے اپنا ہاتھ آزاد کرا لیا۔

سیماب اس کا گریز بھانپ گئی۔ "مگر سجاد' میں کسی بھی طرح کے کنوئیں میں گرنا پسند نہیں کروں گی۔" اس نے گویا اپنی بات پوری کی۔

○

دن گزرتے گئے۔ سجاد کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اس کے اظہار محبت کے بعد
سیماب کا رویہ اب بھی پہلے جیسا تھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح ملتی۔ وہ روز صبح اسے اس
کے گھر سے پک کرتا۔ پھر چھٹی کے بعد اسے گھر چھوڑتا۔ درمیان میں اسٹی ٹیوٹ میں
بھی وہ پہلے کی طرح ملتے۔ گپ شپ ہوتی۔ کبھی چائے پینے چلے جاتے۔
لیکن سیماب آخر پل پل بدلنے والی نہ ہوتی تو وہ سیماب ہی کیوں کہلاتی۔
ایک روز گھر واپس جاتے ہوئے اس نے کہا۔ "مجھے گھر نہیں جانا۔ پہلے مجھے چائے
پلاؤ۔"
"یہ کون سی بڑی بات ہے۔" سجاد نے تین سال پہلے کی طرح کہا "راستے میں
ایک بہت اچھا ریسٹورنٹ پڑتا ہے۔ وہاں فیملی روم بھی ہیں۔"
"مجھے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں چائے نہیں پینی۔" سیماب نے تیزی سے کہا۔
کیفے شبستان چلو۔"
پہلے تو سجاد کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ وہ کیفے شبستان کو بھول ہی چکا تھا مگر
جب یاد آیا تو وہ دہل گیا۔ "اتنی دور جانے کی کیا تک ہے؟" اس نے احتجاج کیا۔
"میرا دل چاہ رہا ہے۔"
"تمہیں چائے سے غرض ہے یا....."
"چائے تو صرف بہانہ ہے۔" سیماب نے اس کی بات کاٹ دی۔
"لیکن کیفے شبستان....."
"تمہی نے تو بتایا تھا کہ وہاں پولیس چھاپے بھی مارتی ہے۔"
"ہاں.... وہی تو....."
"بس تو وہ ایکسائٹ منٹ وہ تھرل کسی اور ریسٹورنٹ میں کہاں۔"
تھوڑی سی بحث ہوئی۔ اور پھر سجاد کو پہلے کی طرح ہار ماننی پڑی۔ لیکن اس نے
فیصلہ کیا کہ آئندہ اس کی یہ ضد نہیں مانے گا۔
وہ تین سال بعد کیفے شبستان گیا تھا۔ وہاں سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ ماحول وہی تھا
بس چہرے بدل گئے تھے۔ وہ وہاں اسی طرح وحشت زدہ رہا۔ اسے لگتا تھا کہ اب
پولیس آئی اور اب چھاپا پڑا۔ دوسری طرف سیماب پہلے ہی کی طرح انجوائے کر رہی

تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے گلو خلاصی نہ ہو سکی۔
پھر آنے والے دنوں میں اسے تجربہ ہوا کہ سیماب کے معاملے میں اس کے لئے فیصلہ کرنا آسان ہے۔ لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ اسے یہ بھی پتہ چلا کہ اب وہ کالج کے مقابلے میں اور کمزور ہو گیا ہے۔ اور یہ اضافی کمزوری اس کی انکسار محبت کی دی ہوئی تھی۔ محبت تو وہ سیماب سے بہت پہلے سے کرتا تھا لیکن اسے اس کی شدت کا اندازہ نہیں تھا۔ اب اظہار کرنے کے بعد اسے شدت کا پتا چل گیا تھا۔ وہ کسی قیمت پر اسے کھونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اور یہ تو اسے بالکل گوارا نہیں تھا کہ محض اس سے اپنی بات منوانے کے لئے بھی سیماب کسی اور سے راہ و رسم پیدا کرے۔ بجائے یہ کہ اس کے ساتھ گھومے پھرے۔
لہذا کیفے شبستان جانا بھی ایک معمول بن گیا۔ دن گزرتے گئے۔ تعلیم بھی تکمیل کے قریب پہنچتی گئی۔

○

ایک دن سجاد کا ضبط جواب دے ہی گیا!
اس روز یونیورسٹی سے گھر جاتے ہوئے سیماب نے کہا۔ "آج تو فلم دکھاؤ مجھے۔"
"دیر ہو جائے گی۔ آج رہنے دو۔ کل فلم دیکھ لیں گے۔ میں امی کو دیر سے آنے کا کہہ آؤں گا۔"
"تم مرد کب بنو گے۔ کبھی امی سے پوچھے بغیر بھی کچھ کر لیا کرو۔"
"یہ کام میں نے تم پر چھوڑ دیا ہے۔" سجاد نے خوش دلی سے کہا۔
"تو یہ بات ہے۔ ہمارے سسٹم الٹ گئے ہیں۔ میں مرد اور تم عورت۔ جبھی تو میچ کرتے ہیں۔"
اس پر سجاد کا دماغ الٹ گیا۔ "میں تمہیں دکھاؤں کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔"
"یہ جذبات میں چیلنج قبول کرنا بھی مردانگی نہیں' نسوانیت ہے۔"
سجاد کو بہت شدت سے غصہ آیا لیکن مردانگی کے اظہار کی خاطر وہ اس غصے کو پی گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر سیماب نے معصومیت سے پوچھا۔ "بہت غصہ آ رہا ہے؟"

"نہیں۔ موضوع بدل جایا کرتے ہیں۔"
"تو خاموش کیوں ہو؟ خفا ہو گئے؟"
"ہونا چاہئے تھا لیکن خفا ہو نہیں سکتے۔"
"تو کچھ بولو نا۔" وہ اٹھلائی۔
"یہ بتاؤ کہاں چلنا ہے۔"
"پیلس سینما چلیں گے۔ وہاں بڑی زبردست فلم چل رہی ہے۔"
سجاد کو فلموں سے دلچسپی نہیں تھی۔ نہ اسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کہاں کون سی فلم لگی ہے اور کیسی ہے۔ لیکن سیماب نے جس فلم کا نام لیا تھا' اس کے متعلق وہ بہت لوگوں سے سن چکا تھا۔ ایک تو وہ صرف بالغان کے لئے ریلیز کی گئی تھی دوسرے اس میں خطرناک حد تک گرم مناظر تھے۔ مختصر یہ کہ وہ بڑی بدنام فلم تھی۔ "تمہیں کس نے بتایا کہ وہ بڑی زبردست فلم ہے؟" اس نے پوچھا۔
"امجد نے بتایا تھا۔ اس نے تو مجھے وہ فلم دکھانے کی پیشکش بھی کی تھی۔"
سجاد نے موٹر سائیکل ایک طرف روک دی۔ "بے وقوف لڑکی' وہ بہت گندی فلم ہے۔" اس نے پلٹ کر سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "امجد کو جرات کیسی ہوئی کہ وہ تمہیں یہ فلم دکھانے کی آفر کرے۔"
"اس میں حرج ہی کیا ہے؟"
"تم نے میری بات سنی نہیں۔ وہ بہت گندی فلم ہے۔"
"تو کیا ہوا۔ ہم دونوں عاقل و بالغ ہیں۔ اور پھر میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔"
"ایسی فلم دیکھنے کے لئے کوئی عورت جائے تو میں اسے عورت ماننے سے بھی انکار کروں گا۔"
"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟ کیا وہ عورت نہیں رہے گی؟" سیماب نے جلانے والے انداز میں کہا۔
"بکواس مت کرو۔ تم حد سے گزر رہی ہو۔" سجاد آپے سے باہر ہو گیا۔
سیماب نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اتنے سخت الفاظ اور لہجے میں اس سے بات کی تھی۔ "یہ تم کس طرح بات کر رہے ہو مجھ سے۔"

"اس لئے کر رہا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔ اور شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے۔" اس کیفیت میں سجاد سب کچھ کہہ سکتا تھا۔

"شادی! ہنہ۔ یوں کہو کہ میرے پیروں میں بیڑیاں ڈالنے کا شوق ہے۔ قابض ہونا چاہتے ہو مجھ پر۔" سیماب نے غصے اور حقارت سے کہا۔ "لیکن مجھے اپنی آزادی بہت عزیز ہے۔ میں تمہیں اس کا موقع کبھی نہیں دوں گی۔"

"میری بات تو سنو۔۔۔" سجاد ٹھنڈا پڑنے لگا۔

"مجھے اندازہ ہے کہ تم سے شادی کر کے میرا کیا حشر ہو گا۔ گھٹ کے رہ جاؤں گی میں۔ میں بے وقوف نہیں ہوں۔"

"تم آزادی کو پتا نہیں کیا سمجھتی ہو۔۔۔"

"تمہیں اس کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" سیماب نے سرد لہجے میں کہا "اور سن لو، میں یہ فلم ضرور دیکھوں گی۔ کسی کے بھی ساتھ چلی جاؤں گی۔"

اب بات سجاد کی برداشت سے بالکل باہر ہو گئی تھی۔ "تو تم بھی سن لو۔" اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔ "جس دن تم یہ فلم دیکھنے سینما ہال میں داخل ہوئیں، خواہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ ہو، اس دن کے بعد میں تمہاری صورت دیکھنا، آواز سننا، حتیٰ کہ تمہارے بارے میں سوچنا بھی قبول نہیں کروں گا اور اس امجد کو تو میں کل ہی دیکھ لوں گا۔ شاید تمہاری سمجھ میں آ جائے کہ مرد کیا ہوتا ہے۔"

اس کے لہجے میں اتنی سفاکی تھی کہ سیماب لرز کر رہ گئی۔ "تمہیں امجد سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔"

"الجھنا کیا ہوتا ہے۔ میں اسے اتنا ماروں گی کہ وہ کم از کم ایک ہفتے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔" غصے سے سجاد کی آواز لرز رہی تھی۔

سیماب کا چہرہ فق ہو گیا۔ "پلیز۔۔۔ امجد سے کچھ نہ کہنا۔" اس کا لہجہ التجائیہ ہو گیا۔

"کیوں نہ کہوں۔۔۔؟"

"اس لئے کہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ مجھ سے اس فلم کی کسی نے تعریف نہیں

بس میں نے تو اشتہار میں اشتہار دیکھا تھا اس کا۔"

سجاد نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ ایسے چھوٹے بچوں کی طرح پشیمان نظر آ رہی تھی' جس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ جانتا تھا کہ سیماب تقریباً جھوٹ بولتی ہے۔ لیکن اس معاملے میں وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ "میں کیسے مان لوں۔ میں تو امجد سے ضرور بات کروں گا۔"

"پلیز... اچھا' میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہ فلم کبھی نہیں دیکھوں گی۔"

سجاد نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں امجد کو بخشے دیتا ہوں۔"

O

اس روز سجاد' قمر سے ملنے کے لئے گیا۔ اس سے ملنا کم ہی ہوتا تھا مگر ایک وہی اس کا رازدار دوست تھا۔ اسے مشورے کی ضرورت تھی اور وہ قمر کے سامنے دل کا بوجھ بھی ہلکا کر سکتا تھا۔

قمر نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔ "ایک بات طے ہے۔ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔"

"یہ میرا من پسند نتیجہ کیسے نکالا تم نے۔" سجاد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ سب کچھ وہ تمہارے ساتھ' تمہاری موجودگی میں ہی کرتی ہے۔ تم آئی بی اے میں گئے تو اس نے کالج میں اپنی روش تبدیل کر لی۔"

"اور اب پہلے سے بھی بڑھ کر ہو گئی۔"

"شاید اسے تمہاری محبت کا یقین نہیں۔ اس یقین کے حصول کے لئے ہی وہ یہ سب کچھ کرتی ہے۔"

"میں کیا کروں۔ میں نے تو ظاہر بھی کر دیا جو میرے لئے آسان نہیں تھا۔" سجاد نے بے بسی سے کہا۔

"اس کی تسلی نہیں ہوئی ہو گی۔" قمر نے پرخیال لہجے میں کہا۔ پھر خود ہی تردید بھی کی۔ "لیکن نہیں یار' اس کی فطرت ہی ایسی ہے شاید۔ تمہیں یاد ہے' میں نے پہلے کہا تھا... اور اب دہرا رہا ہوں۔ اس سے جو شادی کرے گا' اسے دو بیویاں رکھنے کا لطف آئے گا کم از کم۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ شرعی تعداد کا لطف آ جائے۔"

"ترک مت کرو یار۔ یہ مسئلہ بہت سنگین ہے۔"

قمر کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "میری مانو' کی بات یہ ہے کہ وہ لڑکی تمہارے لئے نہیں۔ تم اسے افورڈ نہیں کر سکتے۔"

"میں بھی جانتا ہوں۔ لیکن اس کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔ کوئی حل بھی ہے اس کا؟"

"ایک ہی حل ہے۔" قمر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہ سب کچھ برداشت کرنے کی عادت ڈال لو۔ اپنی فطرت بدلو کیونکہ وہ تو اپنی فطرت نہیں بدل سکتی۔ اور میں جانتا ہوں۔ تم زور زبردستی والے مرد نہیں ہو۔ ہوتے تو بھی اسے سنبھال نہیں سکتے تھے۔"

"فطرت کبھی نہیں بدلتی۔" سجاد نے جواب دیا۔ "وہ بھی مجبور ہے اور میں بھی مجبور ہوں۔ مگر میں اس سے شادی ضرور کروں گا۔ یہ بھی مجبوری ہے۔"

"سوچ لو یار۔ وہ تمہارے لئے اچھی بیوی ثابت نہیں ہو سکتی۔ خوامخواہ زندگی کو عذاب بنا ڈالو گے۔"

سجاد جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اتنی آزاد خیال اور جارح لڑکی سے اس کا نباہ ناممکن تھا۔ لیکن وہ محبت کے ہاتھوں مجبور تھا۔ وہ مہم جو لڑکی' جو خطرات سے کھیلنا پسند کرتی تھی۔ شادی کے بعد وہ کیا کچھ.... اس سے آگے اس نے سوچا ہی نہیں گیا۔ عقل کے باب سے شادی کے حق میں اسے ایک بھی دلیل نہیں ملتی تھی۔

مگر وہ اس سلسلے میں سوچتا رہا۔ وہ اس سے دستبردار بھی نہیں ہو سکتا تھا!

○

اگلی صبح وہ یونیورسٹی جاتے ہوئے سیماب کو پک کرنے کے لئے اس کے گھر پہنچا۔ معمول کے مطابق وہ آئی اور بائیک کی پچھلی سیٹ پر آ بیٹھی۔ اس ایک معمول کو چھوڑ کر باقی سب کچھ خلاف معمول تھا۔ روز وہ مسلسل بولتی تھی لیکن اس روز خاموش تھی۔ سجاد نے دو بار بات کرنے کی کوشش کی۔ دونوں بار سیماب نے ایک ہی بات کہی۔ وہ "میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔"

ایک معمول یہ تھا کہ خالی پیریڈ کے دوران میں وہ ملتے تھے۔ کبھی لان میں بیٹھ کر

باتیں کرتے۔ کبھی کینٹین میں چائے پیتے۔ لیکن اس روز سیماب اس کے قریب بھی نہیں پھٹکی۔ سجاد تمام وقت بے چین رہا۔ اس کا دماغ اڑا اڑا رہا۔ دل کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ چھٹی کے وقت تک اسے یقین ہو گیا کہ وہ آج اس کی بائیک پر نہیں جائے گی۔ بلکہ اپنے کسی کلاس فیلو سے گھر ڈراپ کرنے کو کہے گی۔

لیکن وہ پارکنگ میں کھڑی اپنی موٹر سائیکل تک پہنچا تو وہ پہلے ہی سے وہاں موجود تھی۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ تم آؤ گی۔" اس نے سکون کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

سیماب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منہ بنائے کھڑی رہی۔

سجاد نے سوچا کہ اس معاملے کو یہیں رفع دفع کر لے۔ "دیکھو سیماب...."

سیماب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں صبح ہی تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتی۔ میں نے اپنے کسی کلاس فیلو سے پک اینڈ ڈراپ کے لئے صرف اس لئے بات نہیں کی کہ میں تمہیں تکلیف دینا' جلانا نہیں چاہتی۔ پلیز' مجھے اس پر مجبور نہ کرو۔"

اس کے لہجے کی رکھائی اور بے تعلقی نے سجاد کو احساس دلایا کہ معاملہ سنگین ہے۔ اتنے برسوں میں وہ یہ سمجھ چکا تھا کہ فی الحال یہ معاملات ٹھیک نہیں کئے جا سکتے۔ اس وقت اسے سمجھانے کی کوشش کرے گا تو بات خراب ہی ہو گی۔ یہ بھی غیر معمول بات تھی کہ وہ behave کر رہی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ سیماب اسے جلانے کے لئے اپنے کلاس فیلوز کی خدمات حاصل کرے۔ چنانچہ اس نے خاموشی سے بائیک اسٹارٹ کی اور سیماب کے بیٹھنے کے بعد آگے بڑھا دی۔

گھر پہنچ کر سیماب اتری اور اسے خدا حافظ کہے بغیر گھر میں داخل ہو گئی۔

اب یہ معمولات شروع ہو گئے۔ چار دن بعد سجاد نے پھر بات برابر کرنے کی کوشش کی لیکن اس معاملے میں سیماب تلون مزاجی کے بجائے استقلال کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ سجاد کو پھر پسپائی اختیار کرنی پڑی۔

وہ دن سجاد کے لئے بے حد اذیت ناک تھے۔ اس کا دھیان پڑھائی میں بھی نہیں رہا تھا۔ یہ خیال ہی اس کے لئے سوہان روح تھا کہ سیماب اس سے اتنی ناراض ہے کہ کسی طور صلح کرنے پر آمادہ نہیں۔

اس طرح دس دن گزر گئے۔ اس روز وہ لان میں سر جھکائے بیٹھا اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ سیماب کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"
سجاد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "بیٹھو نا۔ تم نہیں جانتیں....."
"میں یہاں تجدید تعلق کے لئے نہیں آئی ہوں۔" سیماب نے سرد لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہیں ایک اطلاع دینی ہے۔"
اس کا لہجہ ایسا تھا کہ سجاد کا دل ڈوبنے لگا۔ "بتاؤ.... کیا بات ہے؟"
"پرسوں شام چچا اور چچی ہمارے ہاں آ رہے ہیں.... عاطر کے لئے میرا ہاتھ مانگنے۔ اور تم جانتے ہو کہ پاپا اس رشتے کے حق میں ہیں۔"
سجاد کے لئے وہ دھماکا تھا' اس نے اسے شل کر کے رکھ دیا۔ اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔
"اب تو خوش ہو۔ مجھ سے تمہاری جان چھوٹ رہی ہے۔"
"کیسی بات کر رہی ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔" سجاد پھٹ پڑا۔
"معلوم ہے' یہ بات مجھے بتاتے ہوئے تم تقریباً بے ہوش ہو گئے تھے۔ لیکن میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ واضح اور دو ٹوک انداز میں کہہ رہی ہوں کہ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔"
سجاد کے دل میں امید کی کرن پھوٹی۔ "تم انکار کر دو گی نا۔"
"میری مرضی کے بغیر پاپا کبھی ہاں نہیں کریں گے۔ اور میں نے سوچا تھا کہ میں پاپا کو بتا دوں گی کہ میں صرف تم سے شادی کر سکتی ہوں۔ لیکن اس روز کے واقعے کے بعد یہ ممکن نہیں رہا۔"
"تم سمجھتی کیوں نہیں۔ میں تمہیں کسی بات پر روکتا ٹوکتا ہوں تو تمہاری اور اپنی..... دونوں کی بہتری کے لئے۔"
"نہیں سجاد' یہ بات نہیں۔" سیماب کے لہجے میں سنگینی تھی۔ "سچ یہ ہے کہ تم بیک ورڈ بھی ہو اور تنگ نظر بھی۔ مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ میری روشن خیالی' بے باکی اور آزادی پر تم نے بدکرداری کا گمان کیا۔ اس بار میں نے جان لیا کہ محبت کے

باوجود تم میرا احترام نہیں کر سکتے۔ مجھے بھی عزت نہیں ملے گی تم سے۔ اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں نے کبھی تمہیں برا نہیں سمجھا۔ سمجھتا تو تم سے محبت کر سکتا تھا؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تم نے شروع ہی سے مجھے آوارہ اور بدکردار سمجھا۔ بعد میں تمہیں شک کا فائدہ دیتے رہے۔ لیکن اس بار بات واضح ہو گئی۔"

سجاد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھائے۔ "سیماب' تم سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ ہر معاشرے کی اپنی روایات اور اقدار ہوتی ہیں۔ عزت اور شرافت کے کچھ معیار ہوتے ہیں۔ ان کا خیال نہ رکھے تو آدمی حقیر ہو جاتا ہے۔ میں تمہیں بہت بلند دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اور میں بس زندگی کے ایک ایک لمحے سے محظوظ ہونا چاہتی ہوں۔ اپنی مرضی کے مطابق جینا چاہتی ہوں۔ مجھے ایڈونچر پسند ہے۔ خطرات مجھے اپیل کرتے ہیں۔ میں روایت شکن ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ شادی کے بعد کی میری زندگی کا ہر لمحہ رومان سے بھرپور ہو۔ تم تو شادی سے پہلے بھی مجھ سے رومانس نہیں کر سکے۔ الٹا مجھے برا سمجھتے رہے۔"

"تم سمجھتی ہی نہیں کہ شادی ذمے داریوں کا نام ہے۔"

"میں عاطر سے بات کر چکی ہوں۔ وہ مجھے مکمل آزادی دے گا۔ وہ شادی کے بعد مجھ سے اور زیادہ محبت کرے گا۔"

"لیکن میں....."

"یہ بات بن نہیں سکتی سجاد۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ شادی کے بعد تم مجھے کس طرح رکھنا چاہو گے...... میرا کیا حشر کرنے کی کوشش کرو گے۔ اور میں ایسی ہوں نہیں کہ قیدیوں کی سی زندگی گزاروں۔ کوئی جبر مجھے مجبور نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ کہ خرابی ہو گی۔ میرا تو کچھ نہیں۔ لیکن تم زیادہ دکھی ہو گے۔ تو جو بعد میں ہونا ہے' وہ ابھی کر لیا جائے۔ تکلیف بھی کم ہو گی۔"

"تم بہت غلط فیصلہ کر رہی ہو۔"

میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ لیکن میں تمہیں کبھی بھلا بھی نہیں سکوں گی۔ جو میں نے عاطر سے بھی چھپائی ہے۔ ممکن ہے شادی کے بعد ہم تم مل سکیں۔ اس وقت..... اس صورت میں تمہیں میری باغی فطرت بھی ... وہ اٹھ کھڑی ہوئی "اب میں تمہیں یہاں لانے اور گھر لے جانے کی بھی آزاد کر رہی ہوں۔ خدا حافظ۔"

کہ کر وہ چلی گئی۔

جاور گم بیٹھا رہا۔ دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ خاصی دیر میں سکون ہوا۔ اسے سیماب کی آخری بات یاد آئی۔ وہ حوصلہ افزا بھی تھی۔ سیماب لفظوں میں کہا تھا کہ وہ عاطر سے شادی کے بعد اس سے مل سکتی ہے۔ یہ خوش آئند تو تھا۔ لیکن سیماب کی یہ بات آپ اس کے اچھے کردار کی نفی کرتی آزادی اور بے راہ روی میں کوئی زیادہ فاصلہ تو نہیں ہوتا۔

یہ سوچ کر اسے صبر آگیا۔ واقعی..... محبت کی مجبوری اپنی جگہ۔ لیکن وہ اس آزاد اور بے راہ رو لڑکی کو بیوی بنانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

وہ اپنی سوچ کو وقتی اور دماغ کا بہلاوا سمجھتا تھا۔ لیکن چند روز گزرے تو.....

سجاد نے اچانک گھڑی کی طرف دیکھا اور بری طرح چونکا۔ یادوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بارہ بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے اور وہ جانتا تھا کہ سیماب کو انتظار کرنا بالکل پسند نہیں۔

○

اب وہ کسی ٹین ایجر کی طرح بے قرار تھا۔ دل کی دھڑکنیں موسیقیت سے لبریز تھیں۔ وصل کی ساعت آ پہنچی تھی۔ ابھی اسے تیاری بھی کرنی تھی۔ اور پہلے ہی رابطے میں وہ پانچ منٹ لیٹ ہو چکا تھا۔

وہ حرکت میں آگیا۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔ وہ شیلف کے سامنے جا کھڑا ہوا اس نے ایک خفیہ بٹن دبایا۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ شیلف اپنی جگہ سے کھسک گیا اور شیلف کے نیچے سے ایک وارڈ روب نمودار ہو گئی۔ وہاں کپڑے بڑے سلیقے سے رکھے تھے۔ ایک طرف ٹائیاں تھیں۔ نچلے حصے میں جوتے اور جرابیں۔

اس نے جلدی جلدی لباس منتخب کیا اور اسے لے کر شیلف دوبارہ اپنی جگہ سرکائے بغیر باتھ روم میں چلا گیا۔ لباس تبدیل کر کے اس نے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا۔ اس کی عمر کم از کم پانچ برس کم لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا' سچ ہے' بے وفائی مرد کی عمر کم کر دیتی ہے۔ اور اس کی خود اعتمادی میں اتنا ہی اضافہ کر دیتی ہے۔

کپڑے بدلنے کے بعد اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس نے جوتے پہنے۔ پھر وہ وارڈ روب کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے ایک دراز کھولی۔ اس میں پرفیوم کی بے شمار شیشیاں تھیں۔ اس نے ایک پرفیوم منتخب کر کے اسپرے کیا۔ پرفیوم کی دھیمی' بھینی خوشبو کمرے میں پھیلنے لگی۔ اس نے بٹن دبایا۔ شیلف نے وارڈ روب کو چھپا لیا۔

ہر طرح سے تیار ہو کر اس نے گھڑی دیکھی۔ بارہ بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے جیب سے پرس نکال کر چیک کیا۔ پرس میں تمام ضروری چیزیں موجود تھیں۔ سیماب سے ملنے جاتے ہوئے وہ اس پرس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ بھاری رقم ساتھ رکھنا بے حد ضروری تھا۔

وہ کمرے سے نکلا۔ بیرونی کمرے میں لوسی کوئی فائل دیکھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ باس آج قیامت لگ رہا تھا۔

سجاد کو اس کی وہ مفتون ہو جانے والی نظریں بہت بری لگتی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ لوسی اسے پسند کرتی ہے اور اس کے ایک اشارے پر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ لیکن وہ تو سیماب کا اسیر تھا۔ "میں جا رہا ہوں مس لوسی۔" اس نے کہا۔ "میری وائف کا فون آئے تو انہیں بتا دینا کہ میں ایک کام سے گیا ہوں۔"

اب کے لوسی کی آنکھوں میں اور طرح کی چمک ابھری۔ وہ چمک کہتی محسوس ہو رہی تھی.... میں سب کچھ جانتی ہوں۔ سجاد چڑ گیا۔ لوسی کی یہ نظریں اسے اور زیادہ بری لگتی تھیں۔ مگر وہ اس سلسلے میں بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"او۔کے سر۔ وش یو آل دی بیسٹ" لوسی کا لہجہ بھی معنی خیز تھا۔

سجاد باہر نکل آیا۔ اسے احساس تھا کہ سر جھکائے کام میں مصروف دفتر کے تمام ملازم چھپکر اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے آگے بڑھتے ہی وہ ایک دوسرے کو معنی

پر لڑکوں سے دیکھیں گے اور اس کے باہر نکلنے کے بعد کھل کر تبصرے کریں گے مگر
سے کوئی پروا نہیں تھی۔ اس وقت اسے یماب کے سوا کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

○

اس ڈر سے کہ لیٹ نہ ہو جائے' اس نے گاڑی معمول سے زیادہ رفتار سے
چلائی۔ وہ سبحانی چوک پہنچا تو ایک بجنے میں تین منٹ کم تھے۔ یماب کبھی وقت سے
پہلے نہیں آتی تھی۔ پھر بھی اس نے اس کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن
وہ نہیں آئی تھی۔ اس نے گاڑی ایک طرف پارک کی اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے گرد و
پیش کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت چوک میں کافی چہل پہل تھی۔ بس اسٹاپ پر اسکول اور
کالج کے طلبہ اور طالبات کا خاصا ہجوم تھا۔ اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔
ذرا دیر بعد اس نے گھڑی دیکھی۔ ایک بج کر تین منٹ ہوئے تھے۔ اسے
گھبراہٹ ہونے لگی۔ یماب لیٹ کبھی نہیں ہوتی تھی۔ اور آج کے بلانے پر اس نے
پہلے منع کیا تھا۔ کیا پتا' کسی مجبوری نے آنے سے روک لیا ہو اسے۔ یہ سوچ کر وہ
پریشان ہونے لگا۔ اگر یماب نہ آئی تو وہ کیا کرے گا۔ بڑی کوفت ہو گی۔
اسی وقت ذرا فاصلے پر ایک ٹیکسی آ کر رکی۔ یماب نے اتر کر ٹیکسی ڈرائیور کو
ادائیگی کی پھر وہ اس کی گاڑی کی طرف چلی آئی۔ سجاد نے اگلا دروازہ کھولا اور وہ اس
کے برابر بیٹھ گئی۔ سجاد نے ادھر ادھر دیکھا۔ بس اسٹاپ پر موجود لوگ اب ان کی طرف
متوجہ تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ کچھ اوباش قسم کے لڑکوں کی
نگاہیں تو باقاعدہ گندگی اچھال رہی تھیں۔ لیکن سجاد کے خیال میں وہ حق بہ جانب تھے۔
ایک خوب صورت لڑکی کا ٹیکسی میں بیٹھ کر آنا اور ٹیکسی سے اترتے ہی ایک کار میں
بیٹھ جانا۔ اس بات کے دو معنی تو ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ لوگ غلط تو نہیں سوچ
رہے تھے۔
یہ بھی یماب کی ضد تھی کہ وہ اسے سبحانی چوک سے پک کر لے۔ ورنہ وہ اسے
اس کے گھر سے بھی پک کر سکتا تھا۔ اور وہ خود ٹیکسی میں براہ راست ہوٹل بھی پہنچ
سکتی تھی۔ لیکن ایکسائٹ منٹ اور تھرل تو اس کی کمزوری تھی۔ اس چوک پر لوگوں کی
نگاہوں کا سامنا کرنا بھی تو سنسنی خیز تھا۔

ہمیشہ کی طرح لوگوں کی نظریں دیکھ کر اس روز بھی خفت اور شرم سے سجاد کی کنپٹیاں گرم ہو گئیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

سیماب اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ "تم اب بھی ویسے ہی ہو۔" اس نے کہا۔

"فطرت کبھی نہیں بدلتی۔"

"تو پھر بلاتے کیوں ہو مجھے؟"

"محبت سے بڑی مجبوری نہیں ہوتی۔"

وہ چڑ گئی "تمہیں لوگوں کی اتنی پروا کیوں ہے؟"

"معاشرتی جانور جو ٹھہرا۔" سجاد نے کہا پھر جلدی سے اضافہ کیا۔ "اور پرواہ تم بھی کرتی ہو ورنہ چھپ کر کیوں ملتیں مجھ سے۔ کھلے عام بھی مل سکتی تھیں۔ ڈرنے والی تو تم کسی سے ہو نہیں۔"

سیماب جھینپ سی گئی۔ "چھپ کر ملنے کا لطف ہی اور ہے۔" اس نے کہا پھر کچھ سوچ کر گلابی ہو گئی۔ "کہاں چلیں گے؟"

"نگار ہوٹل۔" سجاد بولا۔ "میں نے فون پر کمرا ریزرو کرا لیا ہے۔"

سیماب کے رخساروں کی رنگت اور گہری ہو گئی۔ "اب تو ہوٹلوں کے بارے میں تمہاری معلومات بہت بڑھ گئی ہیں۔" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"تمہاری محبت کا کرم ہے۔ اس کے لئے کوشش محبت تو تلاش کرنا ہی پڑتا ہے۔ پھر تمہاری شرط کہ فائیو یا فور اسٹار ہوٹل نہ ہو۔"

"فائیو اور فور اسٹار کے تحفظ میں تھرل تو نہیں ہو سکتا نا۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ مگر تمہارا تھرل مجھے خوف زدہ کر دیتا ہے۔"

"میں تو سمجھی تھی کہ تمہارا ڈر نکل چکا ہے۔"

"نکلے نہیں تو ڈر اندر کہیں بہت گہرائی میں بیٹھ جاتا ہے۔ لو، ہم پہنچ گئے۔" سجاد کی آواز سنسنانے لگی۔ اس نے گاڑی نگار ہوٹل کے گیٹ سے گزاری اور پارکنگ لاٹ کی طرف لے گیا۔ اب اسے دربان سے لے کر ہوٹل کے دوسرے اسٹاف کی

وں کا سامنا کرنا تھا۔

○

اب وہ تھے اور ہوٹل کے کمرے کی حسین تنہائی۔ ان کے انداز میں کئی دنوں کے
پیاسوں کی سی بے تابی تھی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ ٹوٹ کر ملتے تھے۔ اور پیاس پھر
بھی نہیں بجھتی تھی۔ وہ تو بعد میں ایک دوسرے میں یوں گم ہوتے کہ جدا ہونے کو جی
ہی نہیں چاہتا۔
اس وقت بھی وہی کیفیت تھی۔ صحرا سیراب ہو کر بھی پیاسے کے پیاسے تھے۔
"ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتاؤ گے؟" اچانک سیماب نے پوچھا۔
"تم جانتی ہو کہ میں جھوٹ بولتا ہی نہیں ہوں۔"
"مجھ سے تعلق ہے تو جھوٹ بولنے سے بچ ہی نہیں سکتے۔" وہ کھل کھلا کر ہنسی۔
"وہ تو دوسروں سے بولنا پڑتا ہے۔ تم سے تو جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی نہیں۔
پوچھو تو۔"
"تم خوش تو ہو؟"
"دیکھ نہیں رہی ہو۔ میں بہت خوش ہوں۔" اس نے والہانہ انداز میں سیماب کو
چھوا۔
سیماب کسمائی۔ "میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تمہاری ازدواجی زندگی کے بارے
میں پوچھ رہی ہوں۔ تم اس سے پوری طرح مطمئن ہو؟"
سجاد کو اس کے لہجے میں فکر مندی محسوس ہوئی۔ اس نے غور سے اسے دیکھا۔
اس کے چہرے پر بھی فکر مندی کا تاثر تھا۔ "میں اپنی ازدواجی زندگی سے پوری طرح
مطمئن ہوں سیماب.... میں اتنا خوش و خرم کبھی نہیں رہا۔"
"یہاں آنا، مجھ سے ملنا، یہ مطمئن ہونے کا ثبوت تو نہیں۔ اس سے تو تمہارے
بیان کی تردید ہوتی ہے۔"
سجاد نے چونک کر اسے دیکھا مگر فوراً ہی مطمئن ہو گیا۔ وہ طنز نہیں کر رہی تھی۔
اس کے چہرے پر اب بھی فکر مندی کا تاثر تھا۔ "تم میری ازدواجی زندگی کے عدم
اطمینان کی علامت نہیں ہو سیماب۔ تم تو میری مجبوری ہو۔ وہ واحد سمجھوتا ہو، جو میں

نے کیا ہے۔ اور یہ ناگزیر تھا۔ یقین کرو' میری زندگی میں طمانیت ہی طمانیت ہے۔"

"تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"قدسیہ بہت اچھی بیوی' بہت ہی اچھی ماں ہے۔ وہ مثالی عورت ثابت ہوئی ہے۔ میں اس کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اس کا کہا ٹال ہی نہیں سکتا میں۔"

"مگر اس سے بے وفائی بھی کر رہے ہو۔"

سجاد کچھ بد مزہ ہوا۔ گفتگو عجیب رخ پر جا رہی تھی۔ "اس بات کو درست تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرو۔ یہ قدسیہ سے بے وفائی نہیں' تم سے وفا نباہنا ہے۔ تمہاری محبت کا قرض چکانا ہے۔ تمہارا تعلق قدسیہ سے بہت پہلے کا ہے۔ کچھ چیزیں کبھی ختم نہیں ہوتیں.... ختم کی ہی نہیں جا سکتیں۔"

"عجیب منطق ہے۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتی۔ قدسیہ کو سمجھاؤ گے تو وہ بھی نہیں سمجھے گی۔" سیماب نے پرخیال لہجے میں کہا۔

"تو میں سمجھانے کی کوشش بھی نہیں کروں گا۔" سجاد نے جھنجلا کر کہا۔ "ان رنگین لمحوں میں یہ کیا لے بیٹھیں تم۔"

"حقائق پر بھی غور کرتے رہنا چاہئے۔"

"اچھا.... تو اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں بتاؤ۔ تم اپنے شوہر سے خوش ہو؟"

"بالکل ہوں۔" سیماب نے بلا جھجک کہا۔

"تو پھر یہ....؟"

"یہ میری مجبوری ہے۔ میں ہمیشہ سے دوہری شخصیت والی ہوں۔ اور میری دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک دلیر ہے' دوسری ڈرپوک۔ ایک بے باک ہے تو دوسری شرمیلی۔ ایک باغی ہے تو دوسری مفاہمت پسند...."

"میں تم سے تمہاری ازدواجی زندگی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" سجاد نے اس کی بات کاٹ دی "تم نے یہ نفسیات کا باب شروع کر دیا۔"

"وہی بتا رہی ہوں۔ بات تو پوری ہونے دو۔" سیماب نے تحمل سے کہا۔ "میری دہری شخصیت میں ایک بیوی ہے تو دوسری محبوبہ۔ عاطر کی ازدواجی زندگی دیکھ کر میں کہہ سکتی ہوں کہ جو ہوا' اچھا ہی ہوا۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں۔ مجھے ان سے بہت

کبھی دکھ نہیں دیتے مجھے۔ اب یہ مجبوری ہے کہ وہ میرے اندر کی
طمانیت دے سکتے ہیں۔ لیکن میرے اندر چھپی محبوبہ کی ان سے تسلی
نہیں ہوتی۔ اب یہ تو میری نفسیاتی کمزوری ہے نا۔ ان کا کیا قصور اس میں۔ ویسے
ازدواجی زندگی ہر اعتبار سے بہت خوشگوار ہے۔"

سجاد کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ چند لمحے بعد اس نے سر اٹھایا۔ "میں یہ تو نہیں
کہتا کہ تم بہت اچھی بیوی ہو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے،
کہ اپنے بچوں کی بہت اچھی ماں ہو۔ میں جب بھی بلاؤں، تم کہتی ہو کہ بچوں کو چھوڑ کر
آنا اچھا نہیں لگتا۔"

"ہاں یہ سچ ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا مگر میں اچھی ماں ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔
میں کہتی ہوں کہ اگر میں اچھی ماں ہوں تو اس کا سبب تم ہو۔ تم سے مجھے جو
سکون، طمانیت اور تشفی ملتی ہے، اس کے نتیجے میں مجھے اچھی ماں اور اچھی بیوی بننے کا
حوصلہ ملتا ہے۔"

"یہ بھی عجیب منطق ہے۔ بے وفائی تمہیں اچھی بیوی بننے کی تلقین کرتی ہے۔"

"ہاں۔ شاید میں بہت پیچیدہ نفسیاتی کیس ہوں۔" سیماب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو....." سجاد کہتے کہتے چونکا۔ باہر راہ داری کی طرف سے بھاری
قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یا یہ اس کا وہم تھا۔ یہ آوازیں تو اسے ہمیشہ
سنائی دیتی تھیں۔

"کیا ہوا؟ کیا بات؟" سیماب نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔ وہم بہت کرتا ہوں میں۔" سجاد نے کہا لیکن وہ بہت زیادہ بے چین
تھا۔ اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

مگر چند لمحے بعد اس نے کمرے کے دروازے کے کی ہول میں چابی ڈالے جانے
کی واضح آواز سنی اور جان لیا کہ خطرہ سر پر آ پہنچا ہے۔ وہ اپنی جگہ جما رہ گیا۔ اس
سے ہلا بھی نہیں گیا۔ یہاں تک کہ اس نے دروازے کا ہینڈل گھومتے دیکھا۔

"چچا.... چچا...." اس نے گھبرا کر بمشکل کہا۔

اس لفظ کے رد عمل کے طور پر سیماب کی آنکھوں میں خوف جھلکا۔ اسی لمحے

دروازہ دھڑ سے کھلا اور دو باوردی پولیس والے اندر گھس آئے۔ سیماب کی آنکھوں میں جھلکتا خوف، دہشت میں تبدیل ہو گیا۔ اس کی چیخ نکلنے والی تھی لیکن اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر سختی سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اس نے سجاد کی طرف دیکھا مگر وہ اور برے حال میں تھا۔ لگتا تھا، بے ہوش ہو جائے گا۔ سیماب کو اتنا ہوش بہرحال تھا کہ اس نے اپنے بے ترتیب لباس کو درست کیا اور تیزی سے اپنی چادر کی طرف لپکی۔

کہتے ہیں کہ جب مصیبت سر پر آ پڑے تو کمزور سے کمزور آدمی بھی اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ سجاد نے بھی حیرت انگیز تیزی سے خود کو سنبھالا اور دونوں پولیس والوں کو دیکھا۔ ان میں ایک سب انسپکٹر تھا اور دوسرا کانسٹیبل۔ ''انسپکٹر.... اس طرح کمرے میں گھس آنا....'' اس نے کمزور لہجے میں احتجاج کیا۔

''یو آر انڈر اریسٹ.... بوتھ آف یو۔'' سب انسپکٹر نے سخت لہجے میں کہا۔

''لیکن کس جرم میں....؟''

''جو کہنا ہے، تھانے چل کر کہئے گا۔'' انسپکٹر سیماب کی طرف بڑھ رہا تھا اور کانسٹیبل سجاد کی طرف۔

سجاد نے سیماب کی طرف دیکھا اس کا چہرہ یوں زرد ہو رہا تھا، جیسے اس کے جسم سے خون کی آخری بوند بھی نچوڑ لی گئی ہے۔ آنکھوں سے دہشت جھانک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی کوئی بات نہیں تھی، جس سے لگتا کہ وہ اس ایڈونچر سے محظوظ ہو رہی ہے۔ اسے دیکھ کر سجاد کا دل کٹنے لگا۔ اندر ہی اندر وہ لرز رہا تھا۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا، اگر اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتا تو وہ دونوں ہی کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رہتے۔ اور بچوں پر کیا گزرتی.... سیماب کے بچوں پر۔ یہ تو عمر بھر نہ مٹنے والا داغ تھا۔

نجانے کہاں سے سجاد میں ہمت اور توانائی آ گئی۔ اسے کچھ کرنا تھا۔ بات کو آگے بڑھنے سے روکنا تھا اور یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ اس ملک میں چھپے ہوئے کاغذ کے پرزے ہمیشہ مشکل کشائی کرتی ہیں۔ عزت کے لئے تو آدمی ہر قیمت دے سکتا ہے۔

وہ تیزی سے اٹھا۔ ''انسپکٹر پلیز....'' اس نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ ذرا الگ آ کر میری بات تو سنیں۔''

سب انسپکٹر کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ "ضرور۔ آیئے۔"
راہداری میں سجاد نے اپنی جیب سے پرس نکالا تو سب انسپکٹر کی آنکھوں میں چمک اور بڑھ گئی۔

بات واقعی کچھ دشوار نہیں تھی۔ پانچ منٹ بعد سجاد سیماب کو لے کر لابی سے گزر رہا تھا۔ لیکن سیماب اپنی شخصیت کا سحر گنوا چکی تھی۔ وہ بہت ویران اور اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔ لابی میں اس وقت پریس کے کچھ فوٹوگرافر پکڑے جانے والے مردوں اور عورتوں کی تصویریں بنانے کا عذاب جھگت رہے تھے۔ عذاب اس لئے کہ عورتوں نے اپنے چہرے اپنے ہاتھوں سے چھپائے ہوئے تھے اور فوٹوگرافر بڑے تحمل سے ان کے ہاتھ ہٹنے کے منتظر تھے۔

وہ دونوں اس منظر سے نظریں چرا کر باہر آ گئے۔ ان کے جسموں کی لرزش دور سے بھی دکھائی دے سکتی تھی۔ خاص طور پر سیماب تو پوری جان سے کانپ رہی تھی۔ سجاد پارکنگ کی طرف چلا تو سیماب نے اسے روک لیا۔ "مجھے ٹیکسی میں بٹھا دو پلیز۔" اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔

سجاد اسے لے کر ہوٹل کے گیٹ کی طرف چل دیا۔ "بے کار پریشان ہو رہی ہو۔" اس نے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ "دیکھو نا' کچھ بھی تو نہیں ہوا۔"
لیکن سیماب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سجاد نے گزرتی ہوئی خالی ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔

○

گاڑی میں بیٹھ کر دفتر آتے آتے سجاد میں اتنی بڑی تبدیلی آئی' جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہاں یہ کہ نہ صرف اس کا جسم' بلکہ وجود تک اندر سے اپنی بنیادوں میں لرز رہا تھا کہ وہ تجربہ تھا ہی اتنا بھیانک۔ اور کہاں یہ کہ وہ بتدریج پرسکون.... بلکہ.... پراعتماد ہو گیا تھا۔ اس تجربے کی خوفناکی کا نقش بہت تیزی سے ماند پڑتے پڑتے یکسر مٹ گیا۔ اپنا خوف اسے بے سبب اور مضحکہ خیز لگنے لگا۔ یہاں تک کہ اپنے دفتر میں لباس تبدیل کرتے ہوئے وہ اپنے خوف کو یاد کر کے ہنس دیا۔ آدمی کتنا احمق ہوتا ہے۔ خوف پالتا ہے تو اس کے بارے میں کچھ سوچنا سمجھتا نہیں ہے۔

لباس تبدیل کر کے وہ ڈیلی کرسی پر آ بیٹھا اور اسی بارے میں سوچنے لگا۔ تو یہ تھا وہ عجیب شے میں لپٹا ہوا ہیبت ناک بھوت جس نے برسوں سے اسے خوف زدہ کر رکھا تھا۔ اس نے سوچا۔ برسوں میں یہ خوف اپنے اندر پالتا رہا تھا۔ اور یہ آج جب وہ حقیقت بن کر سامنے آیا تو کتنا چھوٹا اور بے وقعت لگا۔ بلکہ اب تو اس تجربے کو یاد کر کے اس کے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ تھرل اور ایکسائٹمنٹ کا مفہوم تو اس کی سمجھ میں پہلی بار آیا تھا۔۔۔ اور یہ اس تجربے کی عنایت تھی۔

اسے احساس ہوا کہ ایسا پراعتماد وہ کبھی نہیں رہا' جیسا اس وقت ہے۔ اس پولیس انسپکٹر کو اس نے کتنی آسانی سے اور کتنی اچھی طرح ہینڈل کیا تھا۔ پہلی بار اسے پتہ چلا تھا کہ بہت پھیلا ہوا اور مزید پھیلتا ہوا منفعت بخش کاروبار' کسی بہت محبت سے پالے ہوئے دبے جیسا موٹا تازہ بینک اکاؤنٹ اور جیب میں پھولا ہوا پرس معاشرے میں اعلیٰ پوزیشن کا غماز ہوتا ہے۔ اور جن کی معاشرے میں کوئی پوزیشن' مقام اور مرتبہ ہو' پولیس ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ پولیس کا منہ اس سے بھی زیادہ آسانی سے بند کر سکتے ہیں۔ خود اس نے کتنی آسانی سے اس بار انسپکٹر کو بھگتایا تھا۔ خود اعتمادی تو بڑھنی ہی تھی۔

اس کا سارا ڈر اور خوف نکل گیا۔ اب وہ ایک بدلا ہوا آدمی تھا۔

چار بجے اس نے اپنے گھر کا نمبر ملایا۔ فون قدسیہ نے ریسیو کیا۔ "قدسیہ' میں ساڑھے پانچ بجے گھر پہنچ جاؤں گا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" قدسیہ کی پرسکون شیریں آواز سنائی دی۔

"تم بچوں سمیت تیار رہنا۔" وہ بولا۔

"کیوں بھئی۔ خیریت تو ہے؟"

"کب سے بچے کہیں باہر نہیں گئے۔ آج سند باد چلیں گے۔ پھر میں ایک بہت اچھے ریسٹورنٹ میں تمہیں ڈنر کراؤں گا۔"

"آج رہنے دیں۔ یہ پروگرام کل پر رکھیں۔"

"کیوں؟"

"آج میں کوفتے بنا رہی ہوں۔"

"پڑھنے دو۔ کو فتنے کل پکا لینگ۔ آج کا پروگرام اٹل ہے۔"

"لیکن۔" قدسیہ کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

"کچھ نہیں۔ تیار ملنا۔ یہ میرا حکم ہے۔"

"بہت بہتر جناب۔" ہمیشہ کی طرح قدسیہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔

اس رات تفریح کر کے، کھانا کھا کے گھر واپس آئے تو بچے بہت تھکے ہوئے تھے۔ وہ جلد ہی سو گئے۔ تنہائی میں قدسیہ نے سجاد کے سینے پر سر رکھ دیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بہت محبت سے بولی۔ "آپ میرے اور بچوں کے لئے کتنے کتنا خیال رکھتے ہیں.... کتنی محبت کرتے ہیں۔ میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ اچھے ہیں"

سجاد نے چونک کر اسے غور سے دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ بیویاں شوہر سے بے خبر کبھی نہیں رہتیں۔ شوہر کے پاس سے بے وفائی کی بو انہیں فوراً آ جاتی ہے۔ اسی کو نسوانی وجدان کہتے ہیں۔ قدسیہ کی بات سن کر اسے شک ہوا کہ کہیں وہ اس پر طنز تو نہیں کر رہی ہے۔ لیکن قدسیہ کی آنکھوں میں محبت ہی محبت تھی۔

"تم بھی میرے لئے اللہ کا بہت بڑا تحفہ ہو۔" اس نے بے حد سچائی سے کہا۔ "ذرا قریب تو آؤ نا...."

یہ بھی کیسی عجیب بات تھی کہ بے وفائی ہمیشہ قدسیہ کو اس کے لئے بہت زیادہ کشش انگیز بنا دیتی تھی۔ ایسے میں اس کی قربت اسے یوں بھڑکاتی تھی کہ وہ شوہر سے عاشق بن جاتا تھا۔

○

صبح سجاد، راشد کو اسکول پہنچا کر واپس آیا تو قدسیہ بڑے انہماک سے اخبار دیکھ رہی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ کیونکہ قدسیہ دو منٹ میں اخبار کی تمام شہ سرخیاں پڑھ کر اسے فارغ کر دیتی تھی۔ اور اس وقت اخبار پڑھتے ہوئے اس کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ اسے اس کی آمد کا بھی پتہ نہیں چلا۔

"کسی ایٹمی دھماکے کی خبر ہی، جو اتنی توجہ سے اخبار پڑھ رہی ہو۔" سجاد نے اسے

بولا۔

"مجھے تو ایسی دھماکا ہی لگا ہے۔ آپ بھی پڑھ لیں۔"
پھر ناشتا کرتے دیکھ کر۔ ناشتا کرتے ہوئے اس نے قدسیہ کا بڑھایا ہوا اخبار دیکھا۔ اس کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ وہ نگار ہوٹل پر پولیس کے چھاپے کی خبر تھی۔ چھاپے میں پکڑے جانے والوں کی تصویریں بھی چھپی تھیں۔ اور خبر میں ان کے مع ولدیت نام بھی تھے۔

"ایسے دھماکا کر رہی تھیں تم؟" اس نے قدسیہ سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ مجھے تو دھماکا ہی لگا۔ حیرت ہوئی کہ دنیا میں یہ کچھ بھی ہوتا ہے۔"

"یہ سب کچھ دنیا میں ہی ہو سکتا ہے۔ جنت یا دوزخ، حیات بعد الموت میں تو یہ ممکن نہیں ہے۔" سجاد نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

قدسیہ اب بھی اچنبھے میں تھی۔ "ان میں شادی شدہ لوگ بھی ہوں گے۔"

"یہ شادی شدہ لوگوں ہی کے شوق ہیں۔"

قدسیہ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ "آپ کو بھی ہیں ایسے شوق؟"

"بالکل ہیں۔ لیکن میں انہیں ڈھنگ سے.... سلیقے سے پورا کرتا ہوں۔ میں بہت محتاط رہتا ہوں۔"

قدسیہ ہنسنے لگی۔ "جھوٹ۔ شوقین ہوتے تو میرے سامنے اس سے انکار کرتے۔ بے وقوف بناتے ہیں مجھے۔"

"ہاں۔ تمہیں بے وقوف بناتا ہوں مگر کبھی کبھی۔ ہمیشہ نہیں۔" سجاد نے سنجیدگی سے کہا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا.... اب میں کپڑے بدل لوں۔"

کپڑے بدلتے ہوئے وہ گنگناتا رہا۔ نیند ایسی ہے جو اڑا لے جائے۔ رنگ اس کے ہیں جو چرا لے جائے....

○

لوسی سجاد کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں اپائنٹ منٹ ڈائری، نوٹس لینے والا پیڈ اور پنسل تھی۔ سجاد نے نرم لہجے میں کہا۔ "سٹ ڈاؤن مس لوسی۔"

"تھینک یو سر۔"

"میں یہ چاہتا ہوں مس لوسی۔۔۔"

وہ پہلے ہی تمام علامات دیکھ چکی تھی۔ باس مضطرب تھا اور بے چینی حرکات و سکنات سے بیزار لگ رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ پیپر ویٹ کو دونوں ہاتھوں سے گھما رہا تھا۔ "یس سر۔" لوسی نے جلدی سے کہا۔ "میں آپ کے آج کے تمام اپائنٹ منٹس کینسل کر رہی ہوں۔ ویسے کوئی خاص اور امپورٹنٹ اپائنٹ منٹ بھی نہیں۔"

سجاد نے چونک کر اسے دیکھا۔ "میں نے یہ تو نہیں کہا۔"

"سوری سر، میں سمجھی کہ۔۔۔"

"تم ٹھیک سمجھی ہو مس لوسی۔" سجاد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آج کی تمام اپائنٹ منٹس کینسل کر دو۔"

"یس سر۔ اور سر، آج آپ ڈکٹیشن بھی نہیں دیں گے۔ ممکن ہے، مشین پر جواب ریکارڈ کر دیں۔ نہیں تو کل سہی۔"

"ایگزیکٹلی مس لوسی۔"

"اور سر، آپ کوئی کال بھی ریسیو نہیں کریں گے۔"

"کریکٹ۔ تم خطرناک حد تک سمجھ دار ہو گئی ہو مس لوسی۔" سجاد نے سرد لہجے میں کہا۔

"خطرناک؟ نو سر۔۔۔ نیور۔ صرف سمجھ دار۔"

"او کے۔ تم جا سکتی ہو۔"

لوسی کے جانے کے بعد سجاد مضطربانہ انداز میں پیپر ویٹ سے کھیلتا رہا۔ بار بار اس کا ہاتھ ڈائریکٹ لائن والے ٹیلی فون کی طرف بڑھتا مگر وہ اسے واپس کھینچ لیتا۔ جلد بازی مناسب نہیں تھی۔ اس نے ایک فائل کھولی مگر اس وقت وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ رگ و پے میں ایسا ہیجان دوڑ رہا تھا، جو شدت کے اعتبار سے اس کے لئے نیا تھا۔ شاید یہ پچھلی بار کے تجربے کی عنایت تھی۔

وہ بار بار گھڑی دیکھتا رہا۔ وقت کی رفتار بیزار کن حد تک سست تھی۔ بڑی مشکل سے دس بجے۔ دس بجتے ہی اس نے ڈائریکٹ لائن والا ٹیلی فون اپنی طرف کھینچا، ریسیور اٹھایا اور وہ نمبر ڈائل کرنے لگا، جو اس کے دل پر نقش تھا۔ رابطہ ملنے پر اس نے

سکون کی سانس لی۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔ اس کی دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔

پھر دل کو قرار آ گیا۔ دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔ "ہیلو؟" جانی پہچانی مترنم آواز سنائی دی لیکن آج اس میں ہمیشہ جیسی کھنک نہیں تھی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے وہ دلکش سراپا لہرا گیا۔ پھولوں سے لدی ہوئی وہ نرم و نازک شاخ "سیماب!" اس نے چھلکتی ہوئی آواز میں پکارا۔ یہ نام وہ جب بھی پکارتا' نوک زبان پر ہر بار ایک نیا ذائقہ محسوس ہوتا۔ ہر بار سانسوں میں ایک نئی خوشبو ہلکورے لینے لگتی۔ اور آج تو سب کچھ اور سوا ہو گیا تھا.... اسکے ہیجان سمیت۔ "میں سجاد بول رہا ہوں۔" کچھ توقف کے بعد اس نے مزید کہا۔

"جیسے میں آپ کی آواز پہچانتی نہیں۔" بات وہی تھی' جو ہمیشہ وہ کہتی تھی۔ البتہ لہجہ بدلا ہوا تھا اور ترنم کی جگہ آپ نے لے لی تھی۔

"آج آ رہی ہو نا؟" سجاد کے لہجے میں بے کلی تھی.... آرزو تھی۔

"نہ آج.... نہ آئندہ کبھی۔ اب میں آپ سے اس طرح کبھی نہیں ملوں گی۔"

"پچھلی بار جو ہوا' اس سے ڈر گئیں؟"

"جی ہاں۔ کیا نہیں ڈرنا چاہئے تھا۔"

"عجیب سی بات ہے۔ میرا تو ڈر نکل گیا۔" سجاد نے کہا۔ "حالانکہ ڈرتا میں تھا۔ تم تو ڈرتی ہی نہیں تھیں۔ تمہیں تو خطرات سے کھیلنے میں لطف آتا تھا۔ ایڈونچر کا کوئی موقع تم ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں۔ تمہیں کیا ہو گیا۔"

"بچوں کا خیال آ گیا۔" لائن پر سیماب کی لرزتی آواز ابھری۔ پھر اچانک وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ "سجاد.... اگر اس روز ہماری تصویریں چھپ جاتیں تو میں اپنے بچوں کا سامنا کیسے کرتی۔ کیسے سمجھاتی انہیں۔ میں تو کہیں کی بھی نہیں رہتی۔"

"لیکن ایسا ہوا تو نہیں سیماب۔"

"ہم باز نہ آئے تو کسی دن ایسا بھی ہو جائے گا۔ لیکن اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

"تم بلا وجہ ڈر رہی ہو سیماب۔" سجاد جھنجلا گیا۔ "آج میں پہلی بار تمہیں یقین

...ہوں کہ ایسا بھی نہیں ہو گا۔ تم نے دیکھا نہیں، میں نے اس پولیس انسپکٹر کو دو منٹ میں رام کر لیا تھا۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا سیماب۔ اب تو مجھے احساس ہوا ہے کہ آپ...۔"

"لیکن میری خاطر آپ کو بے اصولی بھی تو کرنی پڑی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ رشوت کے کتنے خلاف ہیں۔ میری خاطر اس دن آپ کو یہ بھی کرنا پڑا۔"

"ارے نہیں۔ رشوت دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" سجاد نے پرزور لہجے میں کہا۔

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ شاید سیماب کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ "پلیز..... جھوٹ نہ بولیں۔" بالآخر لائن پر اس کی آواز ابھری۔ "میں نے خود آپ کو جیب سے پرس نکالتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے رشوت نہیں دی۔"

"تو پھر؟"

سجاد مسکرایا۔ "بھئی ڈرپوک آدمی احتیاطی تدابیر تو پوری کرتا ہے نا۔ میرے پرس میں میرا اور تمہارا شناختی کارڈ بھی تھا اور ہمارا نکاح نامہ بھی۔ وہ میں نے نکال کر انسپکٹر کو دکھایا۔ وہ پھر بھی اڑا رہا۔ اس پر میں نے دھمکی دی اسے۔ میں نے کہا..... ٹھیک ہے، تم ہمیں تھانے لے چلو۔ لیکن میرا وعدہ ہے کہ میں ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کروں گا تم پر..... اور ایک کروڑ روپے وصول کر کے رہوں گا۔ چاہو تو شرط لگا لو اس پر۔ بس پھر وہ ایک دم سیدھا ہو گیا۔"

دوسری طرف سیماب نے ایک گہری سانس لی۔ لائن پر خاموشی چھا گئی۔ سجاد تصور میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ کتنی مطمئن ہے۔

"پھر کیا خیال ہے۔ آ رہی ہو نا؟"

"میں نے کہا نا، اب یہ سلسلہ ختم۔ آج اخبار میں تصویریں بھی دیکھی ہیں میں نے..... اور خبر میں نام بھی پڑھے ہیں۔"

"پلیز سیماب۔ دیکھو، ہفتہ دس دن میں چند گھنٹے کا یہ ایڈونچر معمولات میں جکڑی

زندگی کی ساری تھکن اتر جاتی ہے۔ میں بھاری ہو گیا ہوں اس کے۔"

"سوری سجاد۔ اب یہ ممکن نہیں۔"

"پلیز۔"

"سوری اور آپ کو میری قسم' اب اس سلسلے میں اصرار نہ کیجئے گا۔"

"اچھا۔ یہ آپ جناب کیا لگا رکھی ہے تم نے۔" سجاد نے اسے ڈانٹا "اس وقت میں اپنی بیوی سے نہیں' محبوبہ سے بات کر رہا ہوں۔"

"اب وہ دونوں ایک ہو گئی ہیں۔" دوسری طرف سے قدرے سیماب نے شرمیلے لہجے میں کہا "اچھا۔ خدا حافظ۔"

ریسیور بے جان ہو گیا تھا۔ سجاد نے اسے کریڈل پر ڈال دیا اور کرسی کی پشت گاہ پر سر ٹکاتے ہوئے ٹانگیں پھیلا لیں۔ وہ اب بھی سیماب ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے تصور میں اس کی زندگی کے سب سے اہم دن کی تصویر ابھر آئی....

○

وہ مستقل اداس رہنے لگا تھا۔ لیکن بڑی بات یہ تھی کہ اسے صبر آ گیا تھا۔ اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ سیماب اس کی کیا' کسی کی بھی اچھی بیوی نہیں بن سکتی۔ اس میں یہ خوبی ہی نہیں اور عمر بھر کے روگ سے چند دن کا سوگ کہیں بہتر ہے۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ دنوں... یا زیادہ سے زیادہ مہینوں میں وہ سیماب کو... ان تمام باتوں کو بھول جائے گا۔ بس ہلکی سی ایک کسک رہ جائے گی۔ وقت ہر زخم کا مرہم ہے۔

سیماب سے آخری بار بات ہوئے دو ہفتے ہونے والے تھے۔ اس دن کے بعد سے وہ سیماب کو پک کرنے کے لئے اس کے گھر بھی نہیں گیا تھا۔ جانتا تھا کہ وہ اسے دھتکار دے گی اور سیماب یونیورسٹی میں بھی اس کے قریب نہیں آتی تھی۔ اسے تجسس تھا کہ سیماب کس کے ساتھ آتی اور جاتی ہے۔ لیکن اس نے کبھی سیماب کو کسی اور کی موٹر سائیکل پر یا گاڑی میں جاتے نہیں دیکھا۔ ایک دن اس نے چیک کیا تو پتا چلا کہ وہ پوائنٹ کی بس سے آتی جاتی ہے۔ نجانے کیوں' اسے یہ بات اچھی لگی۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ اس روز اسے دیر تک سونا تھا لیکن کسی نے جھنجوڑ جھنجوڑ کر اسے اٹھا دیا۔ یہ الگ بات کہ اس سے ٹھیک طور پر آنکھیں بھی نہیں کھولی جا رہی

نیم وا... کھلی آنکھوں سے اچانک سیماب کا چہرہ نظر آیا تو اس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ پوری طرح سے کھلی ہوئی آنکھوں سے بھی سیماب نظر آئی تو وہ آنکھیں مل کر دیکھنے لگا۔

"تم خواب نہیں دیکھ رہے ہو۔ یہ میں ہی ہوں۔" سیماب کے لہجے میں سوگواری تھی۔

اس کے لہجے نے اسے غور سے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ حیران رہ گیا۔ اس نے سیماب کو اس حال میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔ کمزور بھی۔ اس کی متورم آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ ٹھیک سے سو نہیں سکی ہے۔ یا جاگنے کے بعد دیر تک روتی رہی ہے۔

"کیا بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہو؟" سجاد نے گھبرا کر پوچھا۔

سیماب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس سے بولا نہیں گیا۔ بس اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ہوا کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بس مجھے پتا چل گیا کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

سجاد کا ذہن پوری طرح جاگا نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ "اس لئے تم نے یہ حال بنا لیا۔"

"یہ تو خود بخود ہو گیا۔"

"لیکن عاطر...؟"

"رشتہ آیا تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں نے پاپا سے کہہ دیا کہ میں تمہارے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گی۔"

"پھر؟"

"پاپا نے کہا... جو تم چاہو گی' وہی ہو گا۔"

"تو پھر یہ حال کیوں ہے تمہارا۔ تمہیں پریشانی کیا ہے؟" سجاد جھنجلا گیا۔

"پریشانی یہ ہے کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔" سیماب نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سجاد نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا۔ "یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ تم میرے قابل نہیں ہو۔"

"شاید میں نارمل نہیں ہوں.... ہے نا؟" سیماب نے اسے تائید طلب نظروں سے دیکھا۔ "میں بہت مشکل لڑکی ہوں۔ اور تم بہت اچھے.... بہت سیدھے ہو۔"

"محبت ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔" سجاد نے کہا۔

"لیکن میرے اندر کی آزاد' بے باک اور باغی سیماب کا تم کیا کرو گے؟"

"اس کا بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم شادی کے بعد زندگی کیسے گزارنا چاہتی ہو۔ اپنے شوہر سے کیا توقع رکھتی ہو۔"

سیماب کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ وہ گھر میں مطلق العنان، مگر محبت کرنے والا مہربان شوہر بن کر رہے۔ اور میں خدمت گزار بیوی بنوں۔ اس کی ہر بات مانوں' اس کا گھر سنواروں' سجاؤں۔ وہ ایک مکمل مرد ہو.... اپنی بات منوانے والا۔ مگر...." وہ کہتے کہتے رکی۔ "اب جو میں کہوں گی' اسے سن کر تم خفا ہو جاؤ گے مجھ سے۔"

"نہیں ہوں گا۔ میں بہت محبت کرتا ہوں تم سے۔ تمہارے مرض کو بھی سمجھتا ہوں۔ اس کے لئے دوا سوچنے کی کوشش بھی کروں گا۔ تم کھل کر بتاؤ.... صاف اور واضح۔"

سیماب ہچکچائی۔ چند لمحوں بعد اس نے کہا۔ "اور میں چاہتی ہوں کہ شادی کے بعد وہ گھر سے باہر چھپ چھپ کر مجھ سے ملے.... محبت کرنے والوں کی طرح..... وہ مجھے گھٹیا ہوٹلوں میں لے کر جائے۔ مجھ سے اور طرح کی محبت کرے.... شوہر کی محبت سے مختلف۔ ہم یوں ساتھ گھومیں' جیسے آوارگی کر رہے ہوں۔"

سجاد سوچتا رہا پھر اس نے سر اٹھایا۔ "شادی سے پہلے تو یہ کام بے شک مشکل ہے لیکن شادی کے بعد ایسا دشوار بھی نہیں۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

"دیکھو نا.... شادی تو بہت بڑی مضبوطی ہوتی ہے۔"

اس کی بات سے سیماب کا حوصلہ بڑھا۔ "ابھی تم نے کہا تھا کہ محبت ہر مشکل کو

بیان کر دیتی ہے۔ یہ سچ ہے۔ تم جان ہی نہیں سکتے' سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ اس محبت کے زور پر میں بھی قسم کھاتی ہوں کہ اپنے اندر کی آزاد' بے باک اور باغی سیماب کو بے لگام نہیں ہونے دوں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمہیں مثالی بیوی بن کر دکھاؤں گی۔ اطاعت شعار' خدمت گزار بیوی۔ لیکن میں اپنے اندر کی دوسری شخصیت کو بالکل ختم نہیں کر سکتی۔"

"یہ سب تمہارے نام کا قصور ہے سیماب۔" سجاد نے کہا۔ "سیماب ہو تو قرار اور سکون کہاں۔"

ٹھہراؤ کہاں۔ سیماب کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "میرا ایک نام اور بھی ہے۔"

"ایک اور نام!" سجاد نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں۔ دادی نے عقیقے کے موقع پر میرا نام قدسیہ رکھا تھا۔ پاپا کو سیماب پسند تھا۔ سیماب سب کی زبان پر چڑھ گیا لیکن اسکول' کالج میں میرا نام قدسیہ سیماب ہی لکھوایا گیا۔"

"بہت پیارا نام ہے... قدسیہ۔" سجاد نے پرخیال لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے اس کا؟"

"پاکیزہ۔"

"تمہیں اچھا لگا؟"

"بہت زیادہ۔"

"بس تو میں اپنے نام سے سیماب خارج کر دوں گی اور صرف قدسیہ بن کر رہوں گی۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ تم اپنی اس سیماب شخصیت کو ختم نہیں کر سکتیں تو نام کو ختم کرنے کا فائدہ۔"

"تو پھر کیا کروں؟"

"میں نے کہا نا کہ محبت ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔" سجاد کی آنکھیں چمکنے لگیں "قدسیہ میری بیوی بن کر میرے گھر میں رہے گی۔ اور سیماب سے میں محبت کروں گا۔ گھر سے باہر چھپ چھپ کر ملوں گا۔ اسے آزادی کا احساس دلاتا رہوں گا۔"

"ہاں ..... تم پیار کر سکتے ہو؟"

"ہر روز تو نہیں۔ ہفتے میں ایک بار تو کر ہی سکتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ گھر میں تم صرف قدسیہ ہو گی، بھلی وہ لیکن قدسیہ ہے۔"

"خدا کی قسم، میں ہفتہ تمہاری اسی طرح رہوں گی۔ تمہیں کبھی شکایت نہیں ہو گی مجھ سے۔"

اسی وقت سجاد کی نظر گھڑی پر پڑی۔ اس کی آنکھیں پھیلتی گئیں۔ سوا آٹھ بجے تھے۔ "سوری ..... تم نے اتنی جلدی جگا دیا مجھے۔ یہ تو ظلم ہے۔"

"لیکن....."

"کچھ نہیں۔ بس اب تم جانے دو مجھے آفس سے۔ ہونے دو۔ شام کو امی اور ابو تمہارے گھر آئیں گے۔ میرے لئے تمہیں مانگنے۔ ٹھیک ہے؟"

"او سو سویٹ آف یو۔" وہ دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی۔

○

سجاد نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے دس بجے تھے۔ ابھی اسے ڈھائی گھنٹے اور..... وہ چونکا اسے خیال ہی نہیں رہا کہ اب انتظار کی ضرورت نہیں۔ اس کا اہم ترین اور من پسند اپائنٹ منٹ کینسل ہو چکا ہے۔ سیماب اس سے ملنے کبھی نہیں آئے گی۔

وہ پھر سوچوں میں کھو گیا۔

یہ حقیقت تھی کہ قدسیہ نے مثالی بیوی بن کر دکھایا۔ اس نے گھر کو جنت بنا دیا۔ اس نے گھر میں بچوں کو بھی کبھی وہ کچھ نہیں کرنے دیا، جو اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ بہت اطاعت شعار اور ذمے دار بیوی ثابت ہوئی۔ گھر میں اس کا حکم چلتا تھا۔ قدسیہ نے کبھی اس سے بحث نہیں کی..... اختلاف نہیں کیا۔ وہ ایسی مشرقی بیوی بن کر رہی، جو مشرق میں بھی کم ہی ہوتی ہیں۔

اور سیماب! سیماب نے بھی اسے ہمیشہ خوشی اور طمانیت دی۔ اس کے اعصاب کو پر سکون کیا۔ اس کی تھکن دھو ڈالی۔ اس سے مل کر ہر بار وہ زندگی کی دوڑ میں پھر سے حصہ لینے کے لئے تازہ دم ہو جاتا تھا۔

کیا تھا۔ اور سیماب دونوں نے اس پر انکشافات کئے۔ اور وہ یہ سمجھتا رہا کہ
مشکل کر رہا ہے۔ اب وہ سیماب سے محروم ہوا ہے تو پتہ چلا ہے کہ۔۔۔ وہ
سمجھ رہا تھا۔ "محرومی کیسی۔ یہ تو تجاہل کہلائے گی۔ میں تو ڈرتا تھا اس لئے
مجبور تھا۔" وہ بڑبڑایا۔

اس کے اندر کوئی مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنسا۔ "کسی بچے کی طرح
کر بدل چلاتے ہو۔ شوق تو یہ تمہارا بھی تھا۔" اندر سے کوئی بولا۔

"نہیں۔ یہ تو بس ایک سمجھوتا تھا۔"

"ابتدا میں سمجھوتا ہو گا مگر بعد میں شوق بن گیا۔ ایسا نہ ہوتا تو محرومی کا احساس
نہیں ہوتا۔"

اس نے خود کو ٹٹولا۔ وہ آگہی کا لمحہ تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ "وہ" وہ بزدل بھی
تھا اور شرمیلا بھی۔ یہ درست ہے کہ سیماب نے اسے راستہ دکھایا۔ لیکن اس کے
بعد اس نے ہمیشہ اس ملاقات اور سیماب کی قربت سے لطف اٹھایا۔ اسی لئے اب
محرومی کا احساس ہو رہا ہے۔

اس نے خود کو مزید ٹٹولا.... اور بہت کچھ جان لیا۔ وہ بہت محتاط طبیعت کا مالک
تھا۔ یہ سب کچھ اس طرح نہ کرتا۔ اس کا اپنا انداز اور ہوتا۔ وہ کوئی رسک نہ لیتا۔ اور
وہ شرمیلا تھا۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ لوگوں کی گندگی اچھالتی نگاہوں سے بچتا۔ وہ
یہ سب کچھ عزت سے کرتا۔

مگر کیسے؟ یہ ایک بہت بڑا اور اہم سوال تھا۔

اور اس کا جواب اس کے تصور نے اسے دکھا دیا۔ وہ اس تصور میں کھو گیا، جو
حقیقت کا روپ کبھی نہیں دھار سکتا تھا۔

اس نے تصور میں خود کو اسی دفتر میں بیٹھے دیکھا۔ وہ سیماب کے بارے میں سوچ
رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اگلے روز سیماب سے ملنا ہے مگر اسے سب کچھ خود ہی ارینج
کرنا تھا۔ سیماب کا اس پر کوئی دباؤ نہیں تھا۔

بجائی چوک کا تصور کرتے ہوئے اس پر ہول چڑھنے لگا۔ سیماب کو وہاں سے پک
کرنا اچھا خاصا تماشا تھا.... نہیں.... خود کو تماشا بنانے کے مترادف تھا۔ جو بھی وہاں انہیں

دیکھے گا یہی کہے گا کہ ایک عیاش آدمی کسی خراب عورت کو اپنی مطلب برآری کے لئے لئے جا رہا ہے۔ کیسی خراب بات ہے۔ جبکہ اس کی ضرورت نہیں۔

پھر ملنے کے لئے اپنے کسی ہوٹل کا رخ کرنا' جو اس معاملے میں بدنام ہو' بہت بڑی حماقت تھی۔ تھرل اور ایکسائٹ منٹ تو چھپ کر ملنے میں ہے' نہ کہ رسوائی کا خطرہ مول لینے میں۔ فائیو اسٹار ہوٹل مکمل طور پر محفوظ ہوتے ہیں۔ وہاں ملنے میں ایکسائٹ منٹ' تھرل اور انجوائے منٹ سبھی کچھ ہو گا۔ کیونکہ بے عزتی اور رسوائی کا خطرہ نہیں ہو گا۔ جہاں یہ خطرہ ہو' وہاں کم از کم اس کا ایکسائٹ منٹ تو کم ہو جائے گا۔

اس نے تصور میں شیرٹن ہوٹل کا نمبر ملایا۔ "مجھے ایک کمرا چاہئے۔" اس نے اپنے کریڈٹ کارڈ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

"یوز آر ویل کم سر۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "آپ کب تشریف لائیں گے؟"

"پانچ بجے۔"

"آپ کا نام۔"

"سجاد حمید۔" اس نے بلا جھجک جواب دیا۔

"آپ کے لئے روم نمبر 715 ریزرو کیا جا رہا ہے۔ جب تشریف لائیں' ریسپشن سے چابی لے لیں۔ تھینک یو۔"

اگلے مرحلے میں اس نے گھر فون کیا۔ "قدسیہ.... آج مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ مائنڈ تو نہیں کرو گی۔"

"نہیں۔ مگر یہ بتائیں کہ کب تک آئیں گے؟"

"زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک۔ کھانا گھر پر ہی کھاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے سجاد۔"

اس کے بعد وہ پانچ بجے دفتر سے اٹھا۔ شیرٹن پہنچنے میں پانچ منٹ لگے۔ ریسپشن سے اسے چابی مل گئی۔ اس کے پاس صرف ایک بریف کیس تھا' جس میں چلتے وقت اس نے دفتر کی وارڈ روب سے دو جوڑے کپڑے نکال کر رکھ لئے تھے۔

پورٹر اس کا بریف کیس لئے اس کو کمرے تک پہنچانے آیا۔ اس نے اسے معقول

چھوڑ کر کمرے میں نہا دھو کر فریش ہونے کے بعد اس نے روم سروس کو فون کر کے کافی طلب کی۔ ویٹر کو بھی اس نے تگڑی ٹپ سے نوازا۔

سات بجے وہ ہوٹل سے نکل آیا۔ یہ جو دو گھنٹے اس نے وہاں گزارے تھے، وہ اضافی احتیاط تھی۔ ورنہ وہ اگلے روز سیماب کو لے کر آتا اور کمرا لیتا تو بھی کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ بس یہ ہو سکتا تھا کہ اس کے اور سیماب کے بارے میں خراب تاثر مرتب ہوتا۔ حالانکہ یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ بڑے ہوٹلوں میں کسٹمر صرف معزز کسٹمر ہوتا ہے، کچھ اور نہیں۔ لیکن وہ ایک ایسی ویسی نظر کا خطرہ بھی مول نہیں لے رہا تھا۔

پھر تصور میں اگلا دن آ گیا۔ اپائنٹ منٹ کینسل کرنے کا مسئلہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے ایک ہفتے پہلے اس دن کے بارے میں فیصلہ کیا تھا۔ لہٰذا سکریٹری کو بتا دیا تھا کہ اس دن کے لئے کوئی اپائنٹ منٹ نہ دے۔ "اس من ڈے کو میری ایک پارٹی سے میٹنگ طے ہے۔" اس نے سکریٹری سے کہا۔ "ساڑھے بارہ بجے سے ساڑھے چار بجے تک میں دفتر میں نہیں ہوں گا۔"

اس احتیاط کے نتیجے میں دفتر کے لوگوں کی معنی خیز نظروں، مسکراہٹوں اور فقروں کا اس نے گلا گھونٹ دیا۔ دوسرے اسے دفتر سے تیار ہو کر بھی نہیں جانا تھا کہ دفتر کے لوگوں کو شبہ ہوتا۔ بریف کیس میں کپڑے لے جا کر وہ ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ اب اسے اسی لباس میں پارٹی سے میٹنگ کے لئے نکل جانا تھا۔

اس نے سیماب کو فون کیا۔ ملاقات کا وقت طے کرنے کے بعد اس نے سیماب سے کہا "شیرٹن کے کمرا نمبر 715 میں آ جانا۔"

وہ ساڑھے بارہ بجے ہوٹل کے لئے نکل لیا۔ وہاں اس نے کپڑے بدلے اور سیماب کا انتظار کرنے لگا۔ ایک بجے سیماب آ گئی۔ چار بجے سیماب رخصت ہوئی۔ سوا چار بجے اس نے چیک آؤٹ کیا۔ ساڑھے چار بجے وہ دفتر پہنچ گیا۔

اس پورے معاملے میں کہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یہ تھا ایک عزت دار آدمی کا رویہ۔

تصور کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ واقعی..... یہ تو بالکل محفوظ طریق کار ہے۔ اس نے خوش ہو کر سوچا۔ کاش میں نے سیماب سے اس پر اصرار کیا ہوتا۔ بلا ارادہ اس کی نظر گھڑی

کی طرف اٹھی۔ پونے گیارہ بجے تھے۔ یعنی ابھی اسے مزید ڈیڑھ گھنٹا گزارنا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ عادتاً حساب لگا رہا ہے۔ ورنہ آج اسے کہیں نہیں جانا ہے۔

"وہ چوری چوری کی ملاقاتیں ختم میاں۔" اس نے خود سے کہا۔ "اب اپائمنٹ منٹ تو کینسل ہو چکے مگر اپنی میز کا کام اور ڈاک تو نمٹاؤ۔"

اس نے ڈاک اپنی طرف کھسیٹی مگر اس سے پہلا خط بھی نہیں پڑھا گیا۔ ایک عجیب سی مایوسی اس کے ذہن کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ اس کی کیفیت اس بچے کی سی تھی، جس کا من پسند کھلونا ٹوٹ گیا ہو۔

کام تو کیا ہونا تھا، اگلے پندرہ منٹوں میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ملاقات نہ ہوئی تو شاید اب وہ کبھی دفتر کے کام پر..... اپنے کاروبار پر..... دفتری معاملات پر پہلے جیسی توجہ نہیں کر سکے گا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ ملاقات، وہ تھوڑی سی بے وفائی اس کے سسٹم کا حصہ بن چکی ہے۔ وہ اس کے وجود کی بیٹری کو چارج کرتی تھی۔ اس کی توانائیوں کو نیا کرنٹ فراہم کرتی تھی۔ وہ تازہ دم ہو جاتا تھا۔ اور اب اس سے محرومی پر جو پژمردگی اس پر طاری ہو رہی ہے، یہ ہر روز بڑھتی رہے گی اور وہ زندگی کے شعلے سے محروم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ خون کی گردش تیز کرنے والے ہیجان کی جگہ خون کو سرد کرنے والی مایوسی نے لے لی ہے۔

اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

○

لوسی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی اور بور ہو رہی تھی۔ اس کے پاس کوئی کام ہی نہیں تھا۔ باس کے بلاوے والا بزر چلایا تو وہ حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ پہلا موقع تھا کہ باس نے۔ "ڈونٹ ڈسٹرب" کا حکم سنانے کے بعد اسے طلب کیا تھا۔ بلکہ اسے تو یقین تھا کہ باس نے بے خیالی میں بزر دبایا ہے۔ چنانچہ وہ بیٹھی رہی۔

لیکن بزر دوبارہ چلایا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے جلدی سے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بنایا اور ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر باس کے کمرے میں چلی گئی۔ باس کا چہرہ دیکھ کر اسے کچھ ہونے لگا۔ وہ مضطرب اور نروس نہیں، پریشان اور وحشت زدہ لگ رہا تھا۔

"آپ نے مجھے بلایا سر؟"

"میں اور کس لئے بزر دوں گا۔" باس نے جھنجلا کر کہا۔

"مگر آپ نے کہا تھا، آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا ہے۔"

"بہت ضروری بات ہے مس لوسی۔ پلیز سٹ ڈاؤن۔"

"تھینک یو سر۔" لوسی بیٹھ گئی۔

"مس لوسی، "You are fired" باس نے کہا۔

لوسی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ کوئی یونہی کسی وجہ کے بغیر کسی کو ملازمت سے نکال سکتا ہے۔

"I beg your pardon' sir"

"میں تمہیں ملازمت سے نکال رہا ہوں۔ تمہیں فوری طور پر دفتر چھوڑ دینا ہے۔ کل کسی وقت آ کر اکاؤنٹنٹ سے حساب صاف کرا لینا۔"

لوسی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "لیکن سر، میرا قصور....."

"میں ابھی بتاتا ہوں۔ لیکن پلیز، تم رونا نہیں۔" باس نے گڑبڑا کر کہا۔ "دیکھو لوسی، تمہیں یاد ہے، تم نے کہا تھا، تمہیں کسی سے پیار ہو گیا ہے۔"

لوسی کی نم آنکھوں میں حیرت جھلکی۔ "لیکن سر، یہ سزا...."

"اور تم نے کہا تھا کہ تم اس کے لئے ہاف وائف بھی بن سکتی ہو۔"

"یس سر۔" لوسی نے اور زیادہ حیران ہو کر کہا۔ "لیکن اس کی اتنی بڑی سزا..."

"تم میری بات سنو۔" باس نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں سکریٹری کو ہاف وائف سمجھنے کا قائل نہیں ہوں۔"

"لیکن سر...."

"اور مجھے ایک ہاف وائف کی ضرورت ہے۔"

"لیکن سر، میری جاب....."

"اب میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ ڈو یو لو می؟"

لوسی کا دل ایک لمحے کو دھڑکنا بھول گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ "آف کورس سر۔"

"Then I accept it with gratitude."

"تھینک یو سر۔" لوسی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "لیکن میری جاب۔۔"

"میں تمہیں ایک اور جاب دے رہا ہوں تم نے کہا تھا کہ تم محبت کی خاطر ہاف وائف بن سکتی ہو۔"

"یس سر!"

"تو اب تمہاری دفتر سے چھٹی۔ تنخواہ میں ایک ہزار روپے کے اضافے کے ساتھ اب تم میری ہاف وائف ہو۔"

لوسی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یوں بیٹھے بٹھائے من کی مراد مل رہی تھی۔ اسے ڈر ہوا کہ باس کہیں اسے tease تو نہیں کر رہا ہے۔ "آر یو سیریس سر؟"

"آف کورس، آئی ایم۔ ورنہ ملازمت سے کیوں نکالتا تمہیں۔ اتنی اچھی سکریٹری کو کون کھونا چاہتا ہے۔"

لمحوں میں لوسی کا اعتماد کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ "تھینک یو فار دی کمپلیمنٹ، لیکن سر، مجھے کرنا کیا ہو گا۔"

"گھر بیٹھ کر ہر روز گیارہ بجے تک اسٹینڈ بائی رہنا ہو گا۔۔۔۔ میری کال کا انتظار کرنا ہو گا۔ میں کال نہ دوں تو باقی دن کے لئے آزادی۔ کال کر دوں تو تمہیں میرے بتائے ہوئے وقت پر جہاں میں بلاؤں، وہاں پہنچنا ہو گا۔ میں کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل کا روم نمبر بتاؤں گا تمہیں۔ آ سکتی ہو نا؟"

"شیور سر۔" لوسی نے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"لیکن آج ایمرجنسی ہے۔ یہ بتاؤ، سجانی چوک دیکھا ہے؟"

"یس سر۔"

"بس تو ایک بجے وہاں پہنچ جانا۔ میں تمہیں پک کر لوں گا۔ اب جاؤ۔ سوا گیارہ بج چکے ہیں۔"

"میں جاؤں سر؟" لوسی کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"میں جو کہہ رہا ہوں۔" باس نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور یاد رکھو، میں اپنی بات دہرانے کا قائل نہیں ہوں۔"

"یس سر۔"

"اور اس لمحے کے بعد مجھے سر کبھی نہ کہنا۔ میرا نام سجاد ہے۔"

"آل رائٹ سج.... جاوہ۔ میں جاتی ہوں۔ ایک بجے.... او کے؟"

لوسی کے جاتے ہی سجاد نے انٹر کام پر رحمان صاحب کا نمبر ملایا۔ "میری بات غور سے سنیں رحمان صاحب۔" اس نے انٹر کام پر کہا۔ "میں نے لوسی کو ملازمت سے نکال دیا ہے۔ آج تو میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ کل سے مجھے سکریٹری کی ضرورت ہوگی.... فی الحال آپ دفتر کی لڑکیوں میں سے کسی کو بھیج دیں۔ پھر نئی سکریٹری کے لئے اشتہار دے دیں۔"

"ٹھیک جناب۔"

انٹر کام رکھ کر اس نے سامنے رکھی فائل کھول لی۔ لیکن فائل کے کاغذات اور ان کے مندرجات اس کے لئے بے معنی تھے۔ اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے تصور میں لوسی کا چہرہ ابھر آیا۔

وہ حیران ہو گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے بیوی کے سوا کسی کا تصور کیا تھا۔ دوسری حیرت اسے اس بات پر تھی کہ لوسی اتنی حسین ہے۔ وہ غیر جانب داری سے کہہ سکتا تھا کہ لوسی کا حسن زہد شکن ہے۔ اور لوسی کو اس کے پاس تین سال ہو گئے تھے۔ لوسی اس پر ملتفت بھی تھی۔ اشاروں اور اداؤں سے وہ یہ جتا بھی چکی تھی مگر اسے اس کی خوب صورتی کا اندازہ تک نہیں تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ لوسی کے دلکش سراپا کے تصور نے اس کے وجود میں ہیجان جگا دیا تھا۔ سنسنی موج در موج جسم کی دیواروں سے سر ٹکراتی پھر رہی تھی۔ اور اسے ابھی پچپن منٹ اور گزارنے تھے۔ کاش اس نے اسے بارہ بجے بلا لیا ہوتا۔ اس نے بے تابی سے سوچا۔

"یہ بھی اچھا ہے کہ آج کا دن ضائع ہونے سے بچ گیا۔" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر وہ اٹھ کر اس شیلف تک گیا' جس کے پیچھے اس کا وارڈ روب تھا۔ اس نے بٹن کو دبا کر شیلف سرکایا اور وارڈ روب کا جائزہ لینے لگا۔ آج تو اسے خصوصی اہتمام کرنا تھا۔ وہ پہلی پہلی ملاقات جو تھی۔

کپڑوں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ گنگنا رہا تھا.... چھپتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی....

○ ○ ○

اپنے فاتح کو مفتوح بنانے کے جذبے سے مغلوب بعض سرپھروں کے کارہائے نمایاں

تحریکِ مزاحمت

علیم الحق حقی

ملکی سیاسی تاریخ کو سمجھے بے خبری اور بد عنوانی کا مرقع کہنا کچھ ایسا بے جا بھی نہیں۔ چند ایک محب وطن اور بلند کردار رہنماؤں کے مقابل ہمیشہ ذاتی مفادات اور ذاتی نظریات کے لیے کار سیاست انجام دینے والوں کی اکثریت رہی ہے۔ قوم کے یہ "نجات دہندہ" زمین کی اس کے دعوے کرتے نہیں تھکتے۔ ریگزار سیاست میں جا بجا موجود یہ ببول صفت اور بے فیض رہبر خود کو شجر سایہ دار قرار دیتے ہیں اور قوم کی رہنمائی کا حق دار بھی۔ سادہ لوح عوام کو یہ کرشمہ گر نیو دامیر کرتے ہیں کہ گویا ان کی عقل پر پتھر اور آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہوں۔ لیے رہنما کی پرستش کی اور اس کے کہے کو حرف آخر سمجھا جیسے اوتار کی رسم کا حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں رائج پرستش اور احترام کے ایسے ہی قابل شرم معیار اور رویوں کے حوالے سے لکھی گئی یہ چشم کشا داستان قوم کے سیاسی شعور کے لیے ایک للکار ہے۔ قوم کی ان تھک محنت اور بے پناہ حمایت محبت کو ہر لمحہ ایک نئے طوفان کا سامان کرنے والے ان سیاسی بازی گروں کی جاہ طلبی نے آزادی کے بعد بھی قوم کو آزاد نہ ہونے دیا۔ انگریزوں کے یہ بے دام غلام، آج انگریزوں کی عزت مآبیت کرنے، زمین کو ان کے خون سے غسل دینے اور انگریز کے عزائم کے خلاف بے نظیر مزاحمت کے اعزاز سے خود کو سرفراز کرتے ہیں۔ جاگیر اور سیاست کے ان جدی پشتی وارثوں کے بزرگوں کی "عظیم" جدوجہد کا احوال آپ بھی پڑھیے۔ کہ اپنے رہنماؤں کے خاندانی پس منظر اور ماضی سے آگہی محض فطری تجسس نہیں، قومی ضرورت بھی ہے اور ملی حق بھی!

یہ ہوس و طلب کے اس خار زار کی بھی کہانی ہے جہاں پر ہر پاؤں فگار ہے اور ہر دامن تار تار... اور نسوانی انا کی زخم خوردگی کا ماجرا بھی۔ ایسی انا سوائے انتقام کے کہاں آسودگی پا سکتی ہے

آنکھوں میں روشن مستقبل کی اُمید کے دیے جھلملا دینے والی تحریر

انتخابی سرگرمیاں شباب پر تھیں!

وہ کسی کی جاہ طلبی کی وجہ سے ہوئے ہوں یا کسی سازش کا نتیجہ ہوں، مسلسل انتخابات کا ایک فائدہ بہرحال ہوا تھا۔ عوام میں اب شعور پیدا ہو رہا تھا۔ اخبارات نے بھی اس سلسلے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ نسلوں سے محکومیت میں مبتلا لوگ اپنی طاقت سے بھی آشنا ہو رہے تھے اور سرداروں، جاگیرداروں اور وڈیروں کی حقیقت پر بھی غور کرنے لگے تھے۔ یہ بات بھی ان کی سمجھ میں آنے لگی تھی کہ انہیں اور ان کی نسلوں کو تعلیم سے محروم رکھنے کی کوشش کیوں کی جاتی رہی ہے۔ انہیں ان کے آباد اجداد نے صرف اتنا بتایا تھا کہ خدا کے بعد انہیں بس جاگیردار کا احترام کرنا ہے۔ اس سے وفاداری نبھانی ہے اور اسی کا حکم ماننا ہے۔ اس کی زیادتی بھی انعام ہے اور اس کی ٹھوکر بھی صلہ۔ سو وہ سردار، وڈیرے اور جاگیردار کے قدموں میں بیٹھنے والے اور اسے فرشی سلام کرنے والے بن گئے۔ لیکن اب ان کے بچے جو ہزار رکاوٹوں کے باوجود تعلیم کی چند کرنیں سمیٹ لائے تھے، انہیں اخبار پڑھ کر سناتے تھے۔ جو کچھ ان کے بڑے انہیں بتانے کی ہمت نہیں کرسکے تھے۔ ان کے بچے انہیں بتا رہے تھے۔ بڑی بڑی جاگیریں وطن پرستی اور مٹی سے وفاداری کے صلے میں نہیں ملی تھیں۔ وہ تو انگریز بہادر کی مہربانیاں تھیں۔ وطن سے غداری کا صلہ تھا۔ کسی کو آزادی کے مجاہدین کی مخبری کرنے پر انعام ملا تھا۔ کوئی انگریزوں کے کتے نہلانے والا تھا۔ کسی نے انگریزوں کو اعلیٰ نسل کے تربیت یافتہ گھوڑے فراہم کرنے کی خدمت انجام دی تھی۔ کسی نے جنگ عظیم کے دوران وطن کے جوانوں کو انگریز فوج میں بھرتی کرانے کا کمیشن وصول کیا تھا۔ گویا خون بچا تھا وطن کی رگوں سے۔ اب لوگوں کو معلوم ہو رہا تھا کہ جن جاگیروں کی وجہ سے اس آزاد ملک پاکستان میں جاگیرداروں کو عزت ملی ہے، درحقیقت انہی کی وجہ سے انہیں سزا اور ذلت ملنا چاہیے تھی۔ زمینیں اور جاگیریں وطن سے غداری کے کھلے ثبوت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اگر غداروں کی اولاد کو معافی بھی دی جاتی تو کم از کم زمین ان سے ہر حال میں چھین لی جاتی اور فرشی سلام کرنے والے محکوموں میں تقسیم کر دی جاتی۔ لیکن ایسا کرتا کون؟ سینتالیس سال ہونے کو آئے تھے اور ملک پر حکمرانی وہی لوگ کر رہے تھے۔ ترقی کا سرچشمہ عوام تھے اور وسائل کے حق دار خواص.... وہی سردار، وڈیرے اور جاگیردار۔

جن کی سمجھ میں بات آگئی، وہ پچھتائے کہ ووٹ کی طاقت سے مفاد پرستوں کو ایوانوں میں پہنچا کر وہ خود اپنے کچلے جانے کا سامان کرتے رہے۔ اب ان کی سمجھ میں آرہا تھا کہ جو انہیں محکوم دیکھنا چاہتے ہیں وہ انہیں ان کے قدموں پر کیسے کھڑا ہونے دیں گے۔ اب وہ سوچ رہے تھے کہ ووٹ کا استعمال سوچ سمجھ کر کریں گے اور ایسے محکوم بھی تھے، جن کی رگوں میں خون کی جگہ غلامی کا احساس گردش کر رہا تھا۔ ایسے لوگ اپنے اخبار پڑھ کر سنانے والے بچوں سے کہتے "توبہ کر بیٹا توبہ۔ یہ جھوٹی گمراہ کرنے والی باتیں ہیں۔ جاگیردار سے نمک حرامی کرے گا تو اللہ کے ہاں بھی نہیں بخشا جائے گا۔"

اور آگہی کے نشے میں سرشار بچہ جواب دیتا "کیسی نمک حرامی بابا۔ ہم تو تمہاری محنت کا کھاتے ہیں۔"

"پھر بھی یہ جاگیردار کی مہربانی ہے۔"

لیکن بچوں کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ عام حالات میں جاگیردار سلام کرنے میں سستی کرنے والے کی کھال کھنچوا دیتا ہے لیکن الیکشن کے دن ہوں تو خود عاجزی اور

انکسار سے ملتا ہے۔ یہاں تک کہ شہد ہی سلام کر لیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ووٹ بڑی طاقت ہے اور اس طاقت سے ملک کی خوش حالی سمیت سب کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

تو وہ انقلابات الفتی ہوئی اس بیداری کے احول میں ہو رہے تھے۔ انقلاب تو ابھی بہت دور تھا لیکن اس کے لئے لفظاں دی تھی۔

بڑاہ کے ایک انتخابی حلقے میں چھ امیدوار تھے۔ ایک تو وہ تھا جو گزشتہ اسمبلی میں ہو آیا تھا۔ اسے اپنا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ لوگ اب مزید بھی اس سے وعدے نہیں کر رہے تھے۔ دو مضبوط امیدواروں کا تعلق ایک ہی برادری سے تھا۔ ایک مولانا تھے جو بڑی برائی اور چھوٹی برائی کی بات کرتے اور خود کو اچھائی قرار دیتے ہوئے ووٹ طلب کرتے۔ ایک اور مولانا تھے جن کے لیڈر خود فتویٰ دیتے اور بعد میں فائدہ نظر آنے پر اس میں شرعی گنجائش نکالنے کے حلقے میں بہت بدنام ہو چکے تھے۔ اور چھٹا امیدوار ایک ایسا عام آدمی تھا جسے اپنے علاقے اور اپنے لوگوں کی خدمت کا شوق چرایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ضمانت ضبط ہو جائے گی لیکن وہ دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔

اس حلقے سے منیر خان اور منصف خان مضبوط امیدوار تھے۔ ان کا تعلق اس حلقے کی سب سے بڑی برادری سے تھا۔ دونوں کے درمیان رشتے داری بھی تھی لیکن سیاست بہرحال رشتے داری سے بڑی چیز ہوتی ہے۔ برادری کے بڑے بھی ان دونوں میں سے کسی ایک کو بٹھانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ مقابلہ کانٹے کا تھا۔ دونوں ہی دولت مند تھے۔ دونوں کے پاس بڑی زمینیں تھیں اور دونوں ہی جانتے تھے کہ یہ زمین والا پہلو اس الیکشن میں کمزوری ہے۔ لیکن دونوں کے پاس اس کا توڑ بھی تھا۔ معقول جواب موجود ہو تو کوئی کسی سوال سے نہیں ڈرتا۔

وہ بہت بڑا جلسۂ عام تھا۔ حاضرین کی تعداد دیکھ کر منیر خان کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ اس نے اپنے ایک مصاحب کے کان میں سرگوشی کی "لگتا ہے ہم الیکشن جیت گئے۔"

مصاحب نے دگنا سینہ پھلایا "خان جی۔ ہم نے کام بھی تو بہت کیا ہے۔ دن رات ایک کر دیے ہیں آپ کے لئے......"

منیر خان کے تیور بدلتے دیکھ کر اس نے اپنی خودستائی کو بریک لگایا۔ "اور پھر خان جی آپ کی عزت..... آپ کی ساکھ بھی بڑی ہے جی۔"

"خان جی۔ عوام نے تو آپ کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے" ایک اور مصاحب بولا "اب بس ۲۶ مارچ کو الیکشن کرانے والوں کے فیصلے کا انتظار ہے۔"

"ان کا فیصلہ بھی آپ کے ہی حق میں ہوگا" پہلے مصاحب نے محسوس کیا کہ خودستائی کی وجہ سے اس کے نمبر کم ہو گئے ہیں۔ اسے اس کی کوپورا کرنا تھا "اس لئے خان جی کہ آپ کا پی آر بہت اچھا ہے۔ دوسرے لوگ ایسے ہی تو سیٹ نہیں دے دیتے کسی کو۔ بھی انہیں بھی پتا ہے کہ پبلک کس کے ساتھ ہے۔"

منیر خان کے چچا خان وحید بھی یہ گفتگو سن رہے تھے۔ انہوں نے دھیمی آواز میں منیر سے کہا "او منیر یا لکے۔ یہ جو جلسے کا رش ہے نا اس سے کوئی خوش فہمی نہ پکڑ۔ آج کل لوگ جلسوں میں ضرور آتے ہیں۔ کچھ سوال کرنے کے لئے اور کچھ ہلا گلا کرنے کے لئے۔ اب کچھ دن بعد پبلک امیدوار سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ بھی مانگا کرے گی۔"

منیر خان کو چچا کی بات بری تو بہت لگی لیکن وہ بزرگوں کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اس نے ترش لہجے میں چچا سے صرف اتنا کہا "او چھوڑو نا چاچا جی۔ تم فکر مت کرو۔ وہ وقت آئے گا تب بھی ہم پیچھے نہیں ہوں گے۔ ہم تو صدر صاحب سے بھی سرٹیفکیٹ لے لیں گے۔"

"صدر کو تو خود سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہے۔ اس کو کون دے گا" چچا زیرِ لب بڑبڑایا۔

جلسہ شروع ہوا تو چچا کی بات درست ثابت ہوئی۔ جیسے ہی تقریر کے لئے منیر خان کا نام پکارا گیا، کہیں سے کسی شرپسند نے حلق کے بل چیختے ہوئے سوال اٹھایا "یہ زمینیں اور جاگیریں کس نے دی ہیں؟"

جواب میں ایک کورس گونجا "سکھوں نے..... انگریزوں نے۔"

"کس کو دیں؟" ایک اور سوال اٹھا۔

اس بار جواب مختلف سمتوں میں بکھرا ہوا تھا۔

"سید بادشاہ کے خلاف سازش کرنے والوں کو" ان کی مراد سید احمد شہید سے تھی۔

"غداروں کو۔"

"مخبروں کو۔"

"دشمنوں کے خدمت گاروں کو۔"

"انگریزوں کا اصطبل بنانے والوں کو۔"

"ایجنٹوں کو' دلالوں کو۔"

منیر خان اسٹیج تھامے خاموشی کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک اعتبار سے یہ ہنگامہ اس کے حق میں تھا۔ اسے اپنا حوصلہ مجتمع کرنے اور صورتِ حال کے لئے تیار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ بس ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ مؤثر انداز میں جواب دے دے۔ اس کے بعد صورتِ حال اس کے حق میں ہوگی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ لوگوں کا جوش و خروش سرد پڑ رہا ہے اور خاموشی ہونے والی ہے تو اس نے اپنا ہاتھ فضا میں یوں بلند کیا جیسے لوگوں کو خاموش رہنے پر سکون ہو جانے کی تلقین کر رہا ہے۔ توقع کے مطابق چند سیکنڈ میں خاموشی چھا گئی۔ اب اس کا پریس ایجنٹ اخبار والوں کو خبر دیتے ہوئے پورے وثوق سے لکھ سکتا تھا..... عوام کے محبوب لیڈر منیر خان نے خاموشی کی اپیل کرتے ہوئے ہاتھ بلند کیا تو جلسے میں ہلڑ مچانے والوں کا زور لمحوں میں ٹوٹ گیا۔

چند لمحے سکوت رہا۔ پھر جلسہ گاہ میں چاروں طرف لگے لاؤڈ اسپیکرز پر منیر خان کی آواز ابھری "بھائیو' بہنو' بزرگو' ساتھیو! السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔"

"مجھے خوشی ہوئی کہ قوم اب باشعور ہو گئی ہے" منیر خان نے آغازِ کلام کیا "آپ لوگوں کو اپنی طاقت کا علم ہو گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کے لیڈروں کو آپ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ میں ان لوگوں کا شکر گزار ہوں' جنہوں نے میرے جلسے میں وہ سوال اٹھایا اور ان حقیقتوں کا ذکر نعرے کی شکل میں کیا جن سے آج یہ پورا ملک گونج رہا ہے۔ اس کا جواب ہر سردار' ہر جاگیردار اور ہر وڈیرے کو دینا ہے۔ لیکن وہ جواب نہیں دے سکیں گے اور اس ملک کے باشعور عوام اب انہیں مسترد کر دیں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے جلسے میں میرے چاہنے والوں نے یہ سوال اٹھایا۔ اگر میں خود سے' بغیر پوچھے اس سوال کا جواب دیتا تو آپ لوگ کہتے کہ چور کی داڑھی میں تنکا والا معاملہ ہے۔"

اس پر جلسہ گاہ میں قہقہے گونجے۔ منیر خان نے اپنی بات جاری رکھی "لیکن اب میں جواب دے سکتا ہوں۔ وضاحت کر سکتا ہوں۔ بے شک میرے پاس آبائی زمین ہے اور بہت ہے لیکن وہ میرے بزرگوں کی خون پسینے کی کمائی سے خریدی ہوئی زمین ہے۔ میرے بزرگوں کو اپنی مٹی سے محبت تھی۔ اسی لئے وہ روکھی سوکھی کھاتے۔ موٹا جھوٹا پہنتے اور اپنا پیٹ کاٹ کر زمین خریدتے۔ میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں..... اس کے پاک کلام کی قسم کھا کر کہتا ہوں..... آپ مجھ سے حلف اٹھوا لیں۔ میرے بزرگوں کو زمین نہ سکھوں نے دی نہ انگریزوں نے۔ نہ انہوں نے سید بادشاہ سے بے وفائی کی نہ وطن سے غداری۔ میرے بھائیو' بزرگو! آپ اللہ پر یقین رکھتے ہیں نا؟"

مجمع سے آوازیں بلند ہوئیں "ہم مسلمان ہیں۔ ایمان والے ہیں۔"

"تو میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے بزرگ قابلِ فخر تھے۔ انہوں نے انگریزوں کی عزت ملیامیٹ کر کے رکھ دی۔ اس کی خاطر انہوں نے اپنی عزت کی بھی پروا نہیں کی۔ مجھے فخر ہے کہ میں ان کی اولاد ہوں۔ اس علاقے کو بھی ان پر فخر ہونا چاہئے۔ ہم وزیر خان کی اولاد اس زمین کی عزت کے پاسبان ہیں....."

تین دن بعد اسی مقام پر منصف خان کا جلسہ ہوا۔ وہاں بھی یہی سب کچھ ہوا۔ منصف خان نے بھی خدا اور قرآن کو گواہ بنا کر یہی کچھ کہا۔ اس نے ایک اور دعویٰ کیا "انگریزوں کی خدمت تو بہت دور کی بات ہے۔ بھائیو' بزرگو' میرے دادا سعید خان نے تو انگریزوں کے مقابلے میں ایسی شدید مزاحمت کی' جس کی تاریخ میں نظیر نہیں مل سکتی۔"

"یعنی بے نظیر مزاحمت" ایک مصاحب نے ٹکڑا لگایا۔

"ہاں..... بے نظیر مزاحمت" منصف خان نے جوش سے کہا۔ "اور یہی نہیں۔ انہوں نے اس زمین کو انگریز کے خون سے غسل بھی دیا۔"

سادہ لوح دین دار لوگ اس میں شک نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ' رسولؐ اور قرآن کو گناہ گار بھی گواہ بنالے تو اس پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن علاقے کے جوانوں کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مفاد پرست سیاست داں اپنے اقتدار کے لئے ہر جھوٹ بول سکتے ہیں۔ تسبیح بھی ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور نماز پڑھتے ہوئے وڈیو فلم بھی بنوا لیتے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ چکے تھے۔ اس لئے انہیں اعتبار نہیں تھا اور وہ یہ عہد بھی کر چکے تھے کہ اس بار ووٹ بہت سوچ سمجھ کر دیں گے۔

وہ سر جوڑ کر بیٹھے سوچتے رہے۔ آخر انہیں بابا فرقان کا خیال آ گیا۔

○☆○

بابا فرقان علاقے کا سب سے معمر شخص تھا۔ اس کی عمر سو سال سے کچھ اوپر ہی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اس عمر میں بھی چاق و چوبند تھا۔ اس کا حافظہ غضب کا تھا۔ وہ چلتی پھرتی تاریخ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسے ہر بات یاد تھی۔ اور کیونکہ وہ اپنے زمانے میں بہت سوشل اور میلانی آدمی رہا تھا لہٰذا اس کی معلومات بھی بے حد وسیع تھیں۔ وہ صحیح معنوں میں ایک دانا و فرزانہ شخص تھا۔ لوگ اپنے پیچیدہ معاملات میں اس سے مشورہ کرتے تھے۔

نوجوانوں کا وہ گروپ اس کے پاس آیا تو اسے حیرت ہوئی۔ کیونکہ نوجوان اس کی طرف کم ہی متوجہ ہوتے تھے۔ بہرحال اس نے شفقت سے انہیں بیٹھنے کو کہا اور گرما گرم قہوے سے ان کی تواضع کی۔ پھر اس نے ان سے پوچھا "کیا بات ہے میرے بچو۔ ضرور کوئی مسئلہ تمہیں یہاں لے آیا ہے۔ بولو کیا بات ہے؟"

نوجوان کھسیانے لگے "بابا' آپ کے پاس آنے کو دل تو بہت کرتا ہے" ایک لڑکے نے کہا "لیکن فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"نہیں میرے بچو" بابا فرقان نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "تم

مریض نے ڈاکٹر سے کہا "میری لکڑی کی مصنوعی ٹانگ بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر حیرت زدہ رہ گیا اور مریض کو گھورتے ہوئے بولا "کمال ہے۔ لکڑی کی مصنوعی ٹانگ تمہارے لیے کیسے تکلیف دہ ثابت ہوئی ہے؟"

"بات دراصل یہ ہے ڈاکٹر صاحب" مریض نے سر جھکا کر جواب دیا "کل میری بیوی نے لکڑی کی یہ مصنوعی ٹانگ اٹھا کر میرے سر پر دے ماری تھی۔"

لوگوں پر منافقت نہیں جچتی۔ تمہاری عمر تو سچ کہنے کی ہے۔ یہ منافقت تو بعد کی چیز ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ حتی الامکان اس سے بچتے رہنا۔ یہ بدترین لعنت ہے۔"

"لیکن بابا ہم....."

"میں جانتا ہوں کہ مجھ میں اور تم میں ایک صدی کا فاصلہ ہے" بابا فرقان نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں تم سے بہت پیچھے ہوں۔ تمہارے پاس اپنے عہد کی روشنی ہے اور میری آنکھیں اس روشنی کی عادی بھی نہیں ہو سکیں گی۔"

"لیکن آپ کے پاس دانش ہے جو صرف عمر گزارنے سے آتی ہے" ایک اور لڑکے نے کہا۔

"ہاں' یہ درست ہے۔ لیکن آج کل دانش کی جستجو کوئی نہیں کرتا۔ ضرورت تو اس کی بھی کو ہوتی ہے۔ خیر....."

"بابا' آپ کے پاس دانش ہے۔ آپ کے سینے میں تاریخ ہے اس علاقے کی۔ ہمیں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔"

"سو تو اب تم لوگوں کو کرنا ہے" بابا فرقان نے گہری سانس لے کر کہا "میں تو بس تمہیں اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں مشورہ دے سکتا ہوں۔ تم بتاؤ' مسئلہ کیا ہے؟"

"وہ بابا' آپ کو معلوم ہے' پھر الیکشن ہو رہے ہیں۔"

"ہاں' مہنگائی کے جلتے صحرا میں نیم جاں لوگوں پر گدھوں کے منڈلانے کا موسم پھر آگیا ہے۔"

"بابا' اس بار ہم دھوکا نہیں کھانا چاہتے۔"

"بہت اچھی بات ہے" بابا فرقان نے کہا "حالانکہ قوم دیکھ بھال کر بھی ٹھگنے کی عادی ہے۔"

ایک نوجوان نے امیدواروں کے متعلق تفصیل بتائی۔ پھر منیر خان اور حنیف خان کے دعووں کے متعلق بتایا "آپ تو ان لوگوں سے خوب واقف ہیں۔ آپ نے ان کے بزرگوں کو بھی دیکھا ہوگا۔ ہمیں یہ بتائیے کیا وہ سچ کہہ رہے ہیں؟"

بابا فرقان کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ دیر تک خاموشی رہی۔ بابا سوچتے رہے اور نوجوان انہیں متوقع نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر بابا نے کہا "جھوٹ کا معاملہ ہے بچو۔ میں جھوٹ اور سچ کا فیصلہ سنا کر اس عمر میں گناہگار کیوں ہوں۔ دلوں کا... نیتوں کا حال تو صرف خدا جانتا ہے۔ ہاں میں تمہیں اس مزاحمت کا' انگریزوں کی عزت ملیامیٹ کرنے کا اور اس زمین کو انگریز کے خون سے غسل دینے کا حال سنا دیتا ہوں جس کی قسمیں کھائی جا رہی ہیں۔ کچھ آنکھوں دیکھا ہے اور کچھ کانوں سنا۔ کہانی کی شکل میں سن لو۔ پھر اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق خود ہی فیصلہ کر لینا۔"

یہ کہتے کہتے بابا فرقان کی نظریں اٹھیں اور دیوار اور چھت کے جوڑ اتصال پر جم گئیں۔ ان کی نظروں میں ایسا تاثر تھا جیسے وہاں کوئی اسکرین ہو جس پر فلم چل رہی ہو۔

پھر انہوں نے جیسے کمنٹری شروع کر دی۔ نوجوان ان کی آواز کی ڈور تھام کر پیچھے... بہت پیچھے چلے گئے.....

○☆○

موسم گرما کی دھوپ میں تمازت شدید تھی۔

دونوں جوان ہم عمر تھے۔ وہ دراز قد تھے۔ ان کے جسم گٹھے ہوئے تھے۔ رنگت سرخ و سپید تھی۔ دونوں کی آنکھیں بھوری تھیں لیکن ایک کی آنکھوں میں ہلکا سا نیلا پن تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی پیشانیاں پسینے میں تر تھیں اور دھوپ سے چہرے تمتما رہے تھے۔

"بہت گرمی ہے یار!" ایک نے دوسرے سے کہا "کسی درخت کے نیچے دم لے لیں ذرا۔"

"ہوئے ناشکرے ہو وزیر خان" دوسرے نے کہا "ذرا سوچ' اس وقت لاہور میں کیا حال ہوگا۔"

"مگر لاہور میں ہم پیسہ کماتے تھے سعید خان۔ پیسہ کمانے میں تو نہیں چبھتا یار۔"

"یار' اب گھر چل کر ہی آرام کریں گے" سعید خان کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔

"نہیں یار' بیٹھنا پڑے گا۔ دھوپ بہت تیز ہے۔"

دونوں چنار کے ایک درخت کی طرف بڑھ گئے۔ وہ بہت گھنا درخت تھا۔ چھاؤں بہت ٹھنڈی تھی۔ انہوں نے اپنی اپنی گٹھری کندھے سے اتار کر نیچے رکھی اور پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے۔

درحقیقت دونوں بہت تھکے ہوئے تھے۔ وہ لاہور سے آرہے تھے۔ لاہور سے راولپنڈی اور پھر راولپنڈی سے مانسہرہ تک وہ لاری میں آئے تھے اور اب گاؤں انہیں پیدل جانا تھا۔

"ٹھنڈک پڑ گئی یارا" وزیر خان نے طمانیت بھرے لہجے میں کہا۔ اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔

"اب سو نہ جانا۔"

"تمہیں گھر پہنچنے کی بہت جلدی ہے۔"

"چار سال ہو گئے گھر دیکھے۔"

دونوں کے درمیان رشتے داری تھی۔ ایک اور رشتے کا اضافہ بھی ہونے والا تھا۔ سعید خان کی بہن ریشم وزیر خان سے منسوب تھی۔ اس کے علاوہ ان دونوں میں دوستی بھی بہت تھی۔ بلکہ انہیں ایک جان دو قالب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ گاؤں چھوڑ کر شہر جانے اور قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ وزیر خان نے کیا تھا۔ سعید خان کو اس کے ساتھ جانا ہی تھا۔ بچپن ہی سے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔

گاؤں میں کیا' اس پورے علاقے میں ہی روزگار بہت کم تھا۔ وسائل ہی نہیں تھے۔ ان کے باپ دوسروں کی زمینیں کاشت کرتے تھے۔ فصل میں حصہ مل جاتا تھا۔ ایک بھینس رکھی ہوئی تھی۔ اس سے دودھ' لسی' مکھن نکل آتا تھا۔ گزارہ ہو جاتا تھا۔ پر پیسہ ہاتھ میں کم ہی آتا تھا۔ یہ صورت حال مایوس کن تھی۔

یہی سوچ کر دونوں لڑکوں نے لاہور کا رخ کیا تھا۔ تنومند بھی تھے' محنتی اور جفاکش بھی۔ ہر کام کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس چکر میں ہر کام سیکھ بھی گئے۔ ذہین بھی تھے۔ ہر کام کے متعلق آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔ سادہ زندگی گزارنے والے تھے۔ چار سال میں اچھی بھلی رقم جمع کر لی۔ اب اپنی دانست میں وہ امیر ہو کر گھر واپس آئے تھے۔

"بھوک لگ رہی ہے" سعید خان نے کہا۔

"چلو کھانا کھا لیتے ہیں۔"

وزیر خان نے گٹھری کھول کر ایک پوٹلیا برآمد کی۔ پوٹلیا میں روٹی تھی اور گڑ تھا۔ اس نے روٹی اور گڑ سعید خان کی طرف بڑھایا اور خود بھی کھانے لگا۔ کھانے کے بعد پیاس لگی تو انہیں اٹھنا پڑا۔ کچھ آگے جا کر ایک پہاڑی چشمہ نظر آگیا۔ دونوں پانی پر ٹوٹ پڑے۔ اس طرح پانی پینے کی لذت تو وہ بھول ہی گئے تھے۔ پانی بہت ٹھنڈا میٹھا اور فرحت بخش تھا۔ ان کی روح تک خوش ہو گئی۔

سعید خان بہت بے چین تھا۔ اس کا بس چلتا تو اڑ کر گھر پہنچ جاتا۔ لیکن وزیر خان اب بھی آرام کے موڈ میں تھا "یارا' کھانا کھانے اور پانی پینے کے بعد ایک دم سفر نہیں کرنا چاہئے۔ صحت کے لئے برا ہوتا ہے" اس نے کہا "چلتے ہیں' جلدی کیا ہے۔"

سعید خان بادل ناخواستہ بیٹھ گیا۔ اتنے ساتھ کے بعد ساتھ چھوڑنا اچھا بھی تو نہیں لگتا تھا۔

ایک گھنٹے بعد دونوں نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ انہیں ایک پہاڑ اور عبور کرنا تھا۔ پھر وہ گاؤں پہنچ جاتے۔

پہاڑ پر پہنچ کر وہ رکے اور انہوں نے نیچے زمین پر دری کی طرح بچھے ہوئے گاؤں کو دیکھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا' جیسے وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ مگر ہمیشہ کا جانا پہچانا وہ منظر اتنے برسوں کے بعد انہیں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ ہنسنا شروع کیا اور ہنستے گئے۔ یہ وہ بے فکری کی ہنسی تھی جسے شہر جا کر وہ بھول ہی گئے تھے۔ دونوں ہنستے ہنستے رکے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے "ہو جائے؟" وزیر خان نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے ہو جائے" سعید خان نے جواب دیا۔

"چھوڑو' تم ہمیشہ مجھ سے ہار جاتے تھے۔"

"آج نہیں ہاروں گا۔ آزما کر دیکھ لو۔"

"یہ بات ہے تو چلو تیار ہو جاؤ۔"

"میں تیار ہوں۔ ایک... دو... تین۔"

تین کے ساتھ ہی دونوں نے ڈھلوان پر دوڑنا شروع کر دیا۔ یہ ان کا پرانا کھیل تھا اور زیادہ تر وزیر خان ہی جیتا کرتا تھا۔ لیکن اس دن وزیر خان کو بھی اندازہ ہو گیا کہ آج وہ سعید خان سے نہیں جیت سکتا۔ سعید خان تو ویسے ہی اڑ کر گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ دراصل وہ گھر والوں کو وہ چیزیں دکھانے کو بے تاب ہو رہا تھا جو وہ شہر سے لے کر آیا تھا۔ ان میں کپڑے بھی تھے اور بہن ریشم کے لئے زیور بھی تھے۔ اس کے قدم زمین پر ٹک ہی نہیں رہے تھے۔

سعید خان نیچے پہنچا تو وزیر خان سے خاصا آگے تھا۔ انہیں دیکھتے ہی گاؤں میں شور مچ گیا سعید خان وزیر خان آگئے۔

○☆○

پری رچرڈسن جاگتی آنکھوں اپنے کاٹیج کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ہر ہفتے وہ ویک اینڈ کے لئے دن گن گن کر گزارتا۔ وہ علاقہ اسے بہت پسند تھا۔ کاٹیج اس نے بڑی طبیعت سے بنوایا تھا۔ دو دن وہاں گزار کر وہ تازہ دم ہو جاتا تھا۔ ساری اعصابی کشیدگی اور تھکن دھل جاتی تھی۔

وہ کاٹیج اس نے اسٹیلا کو خوش کرنے کی خاطر بنوایا تھا۔ لیکن اسٹیلا اب بھی خوش نہیں تھی۔ ہاں کاٹیج اس کے لئے خوشی بن گیا تھا۔

اسٹیلا کا خیال آتے ہی اس پر اضمحلال طاری ہونے لگا۔ اسٹیلا کو وہ اب تک نہیں سمجھ سکا تھا۔ ان کی شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے۔ پانچ سال پہلے وہ چھٹیاں گزارنے انگلینڈ گیا تھا تو کنوارا تھا۔ اس وقت اس کا شادی کا خیال بھی نہیں تھا۔ اس کی عمر اڑتیس سال تھی۔ وہ زندگی کو خوب انجوائے کر رہا تھا۔ ہندوستان اسے بہت اچھا لگا تھا۔ وہ بارسوخ اور بااختیار شخص تھا۔ نرم مزاج آدمی تھا۔ غرور اور تکبر اس میں نہیں تھا۔ ہندوستانیوں سے اس کی خوب بنتی تھی۔ وہ ان کی نفسیات بھی سمجھ گیا تھا۔ وہ عزت کے بھوکے لوگ تھے۔ عزت سے بات کرو اور انہیں غلام بنا لو۔

مگر ان تعطیلات کی ابتدا ہی میں اس کے دوست بلی آدم نے پیش گوئی کر دی تھی کہ تعطیلات ختم ہونے تک وہ کنوارا نہیں رہ سکے گا۔

"کیوں بھئی۔ میرا تو شادی کا کوئی ارادہ نہیں" اس نے کہا تھا۔

"مولیعد ہو شادی کے ارادے کے بغیر شادی شدہ ہو جاتے ہیں" آدم نے ہنستے ہوئے کہا "تم نہیں جانتے۔ یہاں تم ہاٹ کیک کی حیثیت رکھتے ہو۔ دیکھنا آپ بھانت بھانت کی لڑکیاں تمہیں گھیرنا شروع کر دیں گی۔"

"کیوں؟"

"وجہ یہ ہے کہ تم ہندوستان کے وائسرائے ہو۔"

"وائسرائے؟ تم کسی مغالطے میں مبتلا ہو۔"

آدم ہنسنے لگا "یہاں ہر اس شخص کو وائسرائے سمجھا جاتا ہے جو ہندوستان میں تاج برطانیہ کی نمائندگی کر رہا ہو۔"

"دلچسپ۔"

لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ آدم درست کہہ رہا تھا۔ ہر پارٹی میں لڑکیاں اس پر پروانوں کی طرح منڈلاتیں۔ اسے گھیرنے کی کوشش کرتیں۔ مگر وہ ایسی لڑکیوں سے دور بھاگتا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ شادی کے جال میں نہیں پھنسے گا۔

اس کی واپسی میں تھوڑے ہی دن رہ گئے تھے کہ وہ شکار ہو گیا۔ لارڈ ایکر مین کے گھر ہونے والی پارٹی میں اسٹیلا سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اسٹیلا بہت حسین تھی۔ مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ زندگی میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی سے مل چکا تھا۔ کشش اس بات کی تھی کہ وہ بہت مختلف تھی۔

ہیری کو یہ یاد نہیں کہ انہیں متعارف کس نے کرایا تھا۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ اسٹیلا نے بڑی بے نیازی سے کہا تھا "اوہ..... تو آپ ہندوستان میں ہوتے ہیں" اور اس کے بعد اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی بلکہ وہ اسے نظر انداز کرتی رہی تھی۔ بس اس کی یہ ادا ہیری کو شکار کر گئی۔ وہ اس بات کا عادی ہو گیا تھا کہ ہندوستان کے حوالے سے تعارف ہوتے ہی لڑکیاں ریشہ خطمی ہو جاتی ہیں۔ کوشش کرتی ہیں کہ بات آگے بڑھے۔

یہاں معاملہ الٹا ہو گیا تھا۔ اسٹیلا کی بے نیازی اس کے لئے چیلنج تھی۔ دوسری لڑکیاں اسے شکار سمجھتی تھیں اور شکار کرنا چاہتی تھیں۔ جبکہ وہ شکاری تھا۔ شکاری کو شکار سمجھا جائے تو اسے توہین کا احساس ہونے لگتا ہے مگر اب مختلف معاملہ سامنے آیا تو وہ شکاری بن گیا۔ اس نے اس سلسلے میں کتنے ہی لوگوں سے بات کی۔ ہر اس پارٹی میں گیا جہاں اسٹیلا مدعو ہو۔ آہستہ آہستہ اس نے اسٹیلا کو رام کرنا شروع کیا۔ بے تکلفی بڑھی تو اس نے پرپوز بھی کر دیا۔

"لیکن تمہیں تو ہندوستان واپس جانا ہے" اسٹیلا نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہوا۔ تم میرے ساتھ ہو گی۔"

"لیکن میں ایک اجنبی ملک کیوں جاؤں۔ کیا حاصل ہو گا مجھے؟"

"میری محبت" ہیری رچرڈسن نے کہا "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اسٹیلا۔ میں تمہیں ہر خوشی دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ایک اجنبی ملک....."

"ہندوستان تو بہت پیارا ملک ہے۔ وہاں چمکیلی دھوپ ہوتی ہے۔ ہر وقت بارش اور دھند کا عذاب نہیں ہوتا۔ وہاں دنیا کی ہر نعمت ہے۔"

"پھر بھی مجھے ڈر لگتا ہے" اسٹیلا نیم رضامند معلوم ہو رہی تھی۔

آخر کار ہیری نے اپنی دانست میں اسے شکار کر ہی لیا۔ یہ احساس تو اسے اب ہو رہا تھا کہ درحقیقت اسٹیلا نے ہی اسے شکار کیا تھا۔ اسٹیلا چالاک شکاری تھی۔ اس نے شکار کی نفسیات کو سمجھا تھا۔ اس نے شاید اسٹڈی کیا تھا کہ وہ ملتفت ہونے والی لڑکیوں سے کھنچ جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے بے نیازی ظاہر کی تھی۔ وہ شکاری تھی لیکن اس نے شکار کے سامنے خود کو شکار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

ہیری اسے اپنے ساتھ ہندوستان لے آیا۔ ان دنوں وہ دہلی میں تعینات تھا۔ ابتدا میں بہت اچھی گزری۔ دونوں ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ ویسے ہیری کو یہ احساس شروع میں ہی ہو گیا تھا کہ اسٹیلا کے مزاج میں تلون بہت ہے۔ وہ پچیس سال کی تھی لیکن اس میں بچپنا بہت تھا۔ پل میں تولہ، پل میں ماشہ اور پل میں رتی۔ اس میں سنجیدگی نام کو نہیں تھی۔ اس کے برعکس ہیری رچرڈسن ایک سنجیدہ آدمی تھا۔ اپنے فرائض وہ بہت ذمے داری اور مستعدی سے ادا کرتا تھا۔ اسی لئے اسے اہمیت دی جاتی تھی۔

چھ ماہ بعد ان کی پہلی لڑائی ہوئی۔ اس صبح اسٹیلا اٹھی، اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور بولی "آج تم دفتر نہیں جاؤ گے۔"

"کیوں بھئی؟"

"موسم اتنا پیارا ہے اس لئے۔"

"یہ ناممکن ہے۔ آج مجھے ایک بہت اہم کام نمٹانا ہے۔"

بس پھر کیا تھا۔ اسٹیلا نے رونا اور لڑنا شروع کر دیا۔ ہیری دفتر گیا تو اس نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔

پھر یہ جھگڑے آئے دن ہونے لگے۔ معمولی معمولی باتوں پر جھگڑا ہوتا اور کبھی بڑی بات پر بھی کچھ نہ ہوتا۔ کبھی اسٹیلا اس کی واپسی کا انتظار کئے بغیر کلب چلی جاتی اور کبھی گھر پر روتی ہوئی ملتی کہ وہ اتنی دیر میں واپس کیوں آیا ہے۔ ایک دن وہ جو کچھ نہ کرنے پر لڑتی، دو تین دن بعد وہ کرنے پر جھگڑنا شروع کر دیتی۔

ہیری کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس سے محبت بہت کرتا تھا۔

اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ ایک دن اسٹیلا اس بات پر لڑی کہ اب ان کے درمیان جسمانی ربط میں گرم جوشی نہیں رہی ہے۔ ہیری محسوس کرتا تھا کہ یہ بات درست ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ عمر بھر ہنی مون نہیں رہتا۔ آدمی پر کام کی ذمے داری بھی ہوتی ہے

اور پھر انگریز ویسے بھی سرد مزاج ہوتے ہیں۔ ان میں گرم جوشی کا فقدان ہوتا ہے۔

ایک صبح اسٹیلا نے اٹھتے ہی سامان پیک کرنا شروع کر دیا "یہ کیا ہو رہا ہے؟" بیری نے پوچھا۔

"میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ وطن واپس جا رہی ہوں۔"

بیری کے لئے اس کو سنبھالنا مشکل ہوا۔ آخر اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنا تبادلہ کرا لے گا۔

اس کے بعد وہ لاہور چلے آئے۔ کچھ عرصہ خیریت سے گزرا۔ اس بار اسٹیلا کچھ سوشل بھی ہو گئی تھی۔ کچھ فیملیز سے تعلقات ہو گئے تھے۔ کبھی وہ لوگ ان کے ہاں جاتے کبھی انہیں اپنے ہاں مدعو کرتے مگر جلد ہی پھر جھگڑے شروع ہو گئے۔

"یہاں گندگی بہت ہے" اسٹیلا نے شکایت کی۔

"ارے واہ۔ اتنا خوب صورت شہر......"

"تمہیں لگتا ہو گا خوب صورت۔ یہی تو مسئلہ ہے" تم میں ذوقِ حسن ہے نہ جمالیاتی حس۔"

"میں نے تم سے شادی کی ہے۔ اس لئے کہہ رہی ہو یہ بات" اس بار بیری کو بھی طرارہ آ گیا۔

خوب لڑائی ہوئی۔ مگر پھر بات ٹل گئی۔

موسم گرما میں ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا "تم نے مجھ سے جھوٹ بول کر شادی کی" اسٹیلا نے چیخ کر کہا۔

بیری کو حیرت ہوئی۔ لڑائی کا یہ زاویہ نیا تھا "کیا جھوٹ بولا میں نے تم سے؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"تم نے کہا تھا ہندوستان میں چمکیلی دھوپ نکلتی ہے۔"

"تو یہ تو سچ ہے۔ باہر جھانک کر دیکھو۔"

"اسے چمکیلی دھوپ کہتے ہیں۔ چمکیلی دھوپ تو خوب صورت ہوتی ہے۔ یہ تو ایسی دھوپ ہے کہ جسم کا گوشت بھی پگھلتا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں میری آنکھیں مستقل طور پر دکھتی ہیں۔ رنگ بھی جھلسا جا رہا ہے۔ بھوک تک مر گئی ہے۔"

"بڑی ناشکری ہو۔ وہاں اچھی تھیں جہاں سال میں آٹھ مہینے دھند کی وجہ سے دن میں بھی اندھیرا رہتا تھا۔ سارا سال بارش ہوتی تھی۔ کبھی دھوپ نکلتی تو جسم پر لوشن لگا کر لیٹ جاتی تھیں کہ جسم جھلس جائے۔ تم کسی حال میں خوش نہیں رہ سکتیں۔"

"میں وہاں وطن میں خوش تھی" اسٹیلا نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

"تو ٹھیک ہے۔ تم واپس چلی جاؤ۔"

اسٹیلا گنگ ہو کر رہ گئی۔ اس کورے جواب کی اسے توقع نہیں تھی "تمہیں چھوڑ کر؟" ذرا دیر بعد اس نے سنبھل کر کہا۔

"اور کیا ہو سکتا ہے۔ تم بھی رومن کیتھولک ہو اور میں بھی۔ طلاق تو ہو نہیں سکتی۔"

یہ سن کر تو اسٹیلا کی ہنسی گم ہو گئی "میں تم سے محبت کرتی ہوں

امجد صاحب شہر کے ایک فیشن ایبل ہیئر کٹنگ سیلون میں پہنچے۔ کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے بڑی سنجیدگی سے باربر سے کہا "ذرا اور کرم بال کاٹنے سے پہلے میری چند ہدایات توجہ سے سن لو۔ سر کے دائیں حصے میں تمہیں بے دریغ اور انتہائی حد تک قینچی چلانی ہے۔ اس حصے کو تقریباً گنجا ہی کر دینا ہے۔ سر کے بائیں طرف تمہیں قینچی کا استعمال برائے نام کرنا ہے۔ وہاں کے بال لمبے ہی رہنے دینا تاکہ میرے کان تک آ جائیں۔ سر کے وسط میں ایک روپے کے برابر بال صاف کر دینا۔ پیشانی سے ذرا اوپر بالوں کی ایک لٹ چھوڑ دینا تاکہ وہ ناک سے ہوتی ہوئی میری ٹھوڑی کو چھو سکے۔"

"لیکن جناب" باربر نے پریشان ہو کر کہا "میں اس طرح تو آپ کے بال نہیں کاٹ سکتا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیوں نہیں کاٹ سکتے" امجد صاحب نے چلا کر کہا "دو ماہ پہلے تو تم نے میرے بال اسی طرح کاٹے تھے۔"

بیری۔ لیکن یہ گرمی میں برداشت نہیں کر سکتی۔"

بیری کا دل اس کے لئے دکھنے لگا "اچھا کچھ دن برداشت کر لو۔ میں اپنا تبادلہ کسی ٹھنڈے علاقے میں کرانے کی کوشش کروں گا۔ ایک ایسی جگہ ہے میری نظر میں۔ حسین بھی بہت ہے، موسم بھی بہت اچھا ہے۔ وہاں گزارا نہ ہوا تو پھر تمہیں انگلینڈ ہی جانا پڑے گا۔"

یوں وہ ایبٹ آباد آ گئے۔ یہاں اسٹیلا گرمیوں میں بہت خوش رہی۔ مگر پھر اسے سردی سے شکایت ہوئی۔ سوشل لائف کی ویرانی سے شکوہ ہوا۔ مگر بات بھی بہت آگے نہیں بڑھی۔ اسٹیلا خود بھی جانتی تھی کہ اس کی کوئی شکایت بھی جائز نہیں ہے اور پھر بیری اسے لاہور میں ہی وارننگ دے چکا تھا۔

ایک دن اسٹیلا یونہی گھومنے کے لئے باہر نکل گئی۔ نواحی علاقے اسے بہت اچھے لگے۔ اس رات اس نے بیری سے کہا "یہ جگہ تو بہت خوب صورت ہے۔"

"شکر ہے، تمہیں کچھ اچھا تو لگا۔"

"تم کسی خوب صورت علاقے میں زمین لے کر الگ تھلگ

کالج نہیں جا سکتے؟"

بیری نے اِدھر اُدھر بات کی۔ ایک مقامی نے کہا "صاب زمین تو ہے' علاقہ بھی سرسبز ہے۔ پر زمین بہت مہنگی ہے۔ آدمی ضرورت مند ہے اس لئے بیچ رہا ہے۔"

"کتنی زمین ہے اور قیمت کتنی ہے؟" بیری نے پوچھا۔

"پچیس کنال تو ہوگی۔ ڈیڑھ سو روپے کی لے گی۔"

"یہ کنال ابھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

مقامی حساب لگاتا رہا۔ پھر بولا "تین ایکڑ سے زیادہ ہی ہے صاب۔"

"مجھے دکھاؤ۔"

یوں اس نے بٹ گرام کے قریب وہ زمین لی۔ اِدھر اُدھر گاؤں تھے۔ مگر کافی فاصلے پر۔ جگہ خوب صورت تھی۔ بیری نے وہاں بہت خوب صورت کاٹیج بنوایا۔ باغ لگانے کا سامان بھی کیا۔ باغیچہ بھی بنایا۔ یہ سب کچھ اس نے اسٹیلا کے لئے کیا تھا۔ لیکن اسے خود اس جگہ سے عشق ہوگیا۔

اسٹیلا کو کچھ عرصے بعد کاٹیج سے بھی شکایتیں ہوگئیں "کیسی اجاڑ جگہ ہے۔ آدم نہ آدم زاد۔ مجھے یہاں رہتا ڈر لگتا ہے۔"

لیکن اب بیری رچرڈسن کو کوئی پروا نہیں تھی۔

○☆○

سردی اگست میں ہی شروع ہو جاتی تھی۔ کم از کم اسٹیلا رچرڈسن کو تو ایسا ہی لگتا تھا اور کاٹیج تو اسے بہت ہی برا لگتا تھا۔ حالانکہ فرمائش اسی کی تھی۔ اب وہ جگہ اسے ویران اور بے زار کن لگتی تھی۔ کبھی کبھی وہ بیٹھ کر اپنے بارے میں سوچتی۔ اسے خیال آتا کہ بیری غلط تو نہیں کہتا۔ وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ خوش رہنا ہی نہیں چاہتی۔ لیکن کیوں؟ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان انگلینڈ سے بہت اچھا ہے۔ یہاں موسم بھی بہت اچھا ہے۔ یہاں لوشن جسم پر لگا کر دھوپ میں لیٹ کر آگ کو اپنے اندر اتارنے کی... خود کو جلانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ طاقت اور اختیار بھی یہاں زیادہ ہے۔ وہ تصور کرنے کی کوشش کرتی کہ بیری وطن میں ہوتا تو کیا ہوتا۔ یہ تصور کرنا بہت مشکل تھا۔ لیکن یہ طے تھا کہ وہ وہاں اتنا طاقتور اور بااختیار ہرگز نہ ہوتا۔ اور وہ خود کیا ہوتی؟ یہ خیال ہی بے حد تکلیف دہ تھا۔

تو پھر مسئلہ کیا ہے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ بس وہ اتنا جانتی تھی کہ وہ زندگی سے خوش اور مطمئن نہیں۔ زندگی پھیکی اور بے رنگ ہے۔ اس میں کوئی تھرل' کوئی سنسنی خیزی نہیں۔ بیری کے لئے وہ ایک بیوی ہے' محبوبہ نہیں۔ اور بیری بہت مصروف آدمی ہے۔ اس کی عمر بھی زیادہ ہے۔ وہ جوش' امنگ اور ولولے سے محروم ہو چکا ہے۔ اس کی قربت میں بس فرض شناسی ہوتی ہے۔ وہ سرد مہر' سرد مزاج ہے۔ ہاں وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کے لئے سب کچھ کر سکتا ہے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی تسلی تو نہیں ہوتی۔ زندگی میں کوئی ہنگامہ' کوئی تلاطم بھی تو ہو۔ نہیں ہے تو بیری سے لڑ کر ہی کوئی ہنگامہ کیا جائے۔

کچھ یوں بھی تھا کہ کاٹیج اس کے لئے رقیب بن گیا تھا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ بیری اس سے زیادہ کاٹیج میں دلچسپی لیتا ہے۔ بلکہ دلچسپی کیا' وہ تو کاٹیج سے عشق کرتا تھا۔ جمعے کی شام وہ کہتا "چلو کاٹیج چلیں۔ عیش ہوگئے۔ بھئی میری تو ساری تھکن دھل جاتی ہے۔"

ڈھائی سال ہوگئے تھے اسے یہ جملے سنتے۔ اور اسے کاٹیج کا تذکرہ بھی برا لگنے لگا تھا۔ اور اکثر بیری رچرڈسن کہتا "او گاڈ... سوچتا ہوں' کاٹیج نہ ہوتا تو میرا کیا بنتا۔"

اسٹیلا کو جمعے کی شام کی وہ ڈرائیو ہی بری لگتی تھی "وہاں ایسا کیا ہے آخر؟" وہ جھلا کر کہتی۔

"وہاں فطرت کا حسن ہے۔ زندگی اپنے سادہ اور سچے روپ میں ملتی ہے۔ نہ فون ہے' نہ ریڈیو۔ نہ ہی کسی بھی قسم کا کوئی مسئلہ۔ نہ کوئی رقابت' نہ مقابلے بازی' نہ تنگ کرنے والے ایڈمنسٹریٹ... بس تم' میں' آسمان' نظارے اور مائی گاڈ..... ہوا ایسی نتھری ہوئی' شفاف ہوا کہ نشہ ہونے لگے۔"

اسٹیلا کو بیری کی اس قصیدہ خوانی کرتی ہوئی آواز سے بھی نفرت محسوس ہونے لگی۔ جمعے کی ہر شام جیپ میں بیٹھے ہوئے اسے معلوم ہوتا کہ کاٹیج پر پہلی نظر پڑتے ہی بیری کیا کہے گا "آہ... تازہ ہوا!" ایک تو بیری ویسے ہی بالکل فربہی تھا۔ گہری سانس کھینچنے کے عمل میں وہ اور موٹا اور بھدا لگنے لگتا۔ گہری سانس بھر کر وہ اپنا پیٹ اپنے ہاتھ سے بجاتا' اس بن مانس کی طرح جو کسی چیز پر اپنے حق کا اعلان کر رہا ہو۔ پھر وہ کہتا "بائی گاڈ! اس ہوا میں کیسے کیسے ذائقے' کیسی کیسی خوشبوئیں ہیں۔"

موسم گرما ہو یا سرما' اسٹیلا کو ہمیشہ وہاں کی ہوا برف جیسی لگتی۔ سردی آہستہ آہستہ اس کے بدن کو جکڑنے لگتی۔ اور ہمیشہ کاٹیج پہنچنے کے صرف پانچ منٹ بعد وہ بے خوشی سے آغاز کرتی اور بالوشی تک پہنچ جاتی۔ جیسے ہی اس کے خشک دہن پر جن کا چھینٹا پڑتا' اس کے منہ سے آہ نکلتی۔ اس آہ کے ساتھ پھیپھڑوں میں بھری ہوئی سانس کی واپسی بھی ہوتی تھی۔ اکثر وہ اپنا فرکوٹ اتارے بغیر ہی کاٹیج میں ادھر سے ادھر پھرتی۔ سامان کھولتی' چہرے پر پاؤڈر پف کرتی' سگریٹ پیتی اور کھڑکی سے باہر اجاڑ سرسبز زمین کو تکتی رہتی۔ جام سے ہر وقت اس کے ساتھ ہوتا۔

جن کے ابتدائی گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد اس کی سب سے بڑی خوشی اس میں ہوتی کہ وہ کھڑکیوں کے پردے برابر کر کے لائٹ آن کرے۔ اس عمل سے اسے اپنی پرائیویسی کے محفوظ ہونے کا احساس ہوتا۔ کبھی وہ خود بھی اپنی اس سوچ پر حیران ہوتی۔ کیونکہ وہاں پرائیویسی کو کسی طرح کا خطرہ نہیں تھا۔ بلکہ وہاں تو پرائیویسی ہی پرائیویسی تھی۔ مگر اسے یہ وہم ہوتا تھا کہ باغ میں یا

کہیں اور کوئی چھپ کر اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ اس کا اپنا تضاد تھا جو اسے خود بھی عجیب لگتا تھا۔ ایک طرف تو وہ شکایت کرتی تھی کہ یہاں آدم ہے نہ آدم زاد۔ دوسری طرف یہ وہم اسے ستاتا تھا۔

پھر کھڑکیوں کے پردے برابر کرنے کے بعد وہ ہمیشہ خوش مزاج ہو جاتی تھی۔ اسے یہ خوش گوار احساس بھی ہوتا کہ باہر کی نفرت انگیز ویرانی اور مہیب تنہائی سے اس کا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ پھر وہ اس ویرانی کو بھول جاتی۔ ایک دو گھنٹے تک اسے اپنے اندر دہکتی گلابی آنچ کا ایک شعلہ تھرکتا محسوس ہوتا۔

سات بجے تک وہاں رات ہو جاتی اور سناٹا گہرا ہوتا چلا جاتا۔ دراصل وہاں رات پرندوں کے بسیرے سے شروع ہوتی تھی۔ جب تک پرندے دانے دنکے کی تلاش میں اڑتے چہچہاتے' ان کی وجہ سے رونق رہتی۔ اور جب وہ بسیرے کے لئے واپس ہوتے تو رونقیں بھی ساتھ لے جاتے۔ اس کے بعد ہر لمحے اس کی تلخی میں اضافہ ہوتا رہتا۔ اس کے ہونٹ بھنچ جاتے۔ وہ ہر وقت لڑنے کے لئے آمادہ رہتی "میں تمہیں بتا رہی ہوں مسٹر بیری رچرڈسن کہ میں آخری بار اس بے زار کن منحوس مقام پر آئی ہوں" وہ دہاڑتی "یہ کاٹیج نہیں' مقبرہ ہے!" وہ چلاتی "میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکی ہوں' آئندہ نہیں کہوں گی۔ مجھے یہ جگہ اچھی نہیں لگتی۔ صحن میں رکھی ہوئی بالٹیاں سخت ناپسند ہیں مجھے۔ تم اپنی یہ سادہ اور خوب صورت زندگی اپنے پاس رکھو۔ میرا تو یہاں دم گھٹتا ہے۔ مجھے یہ پھانسی گھر معلوم ہوتا ہے' سمجھے؟"

ایک دن ایسے ہی غصے اور وحشت کے دورے میں اس نے اپنے ہونٹوں سے لٹکتی ہوئی سگریٹ کو چھوڑ دیا۔ سگریٹ اس کے فر کوٹ کے کالر میں گری۔ وہاں اس نے اچھی خاصی تباہی مچادی۔ ایک منٹ ہو گیا اور وہ خاموش رہی۔ اچانک دھواں دیکھ کر بیری کو خطرے کا احساس ہوا اور اس نے کیسے کیسے جتن کر کے اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بجھایا۔

"اوہ فور گاڈز سیک' جلنے دو مجھے۔ یوں بھی تو مجھے جلنا ہی ہے۔"

ایسے موقعوں پر اسے خود بھی احساس ہوتا کہ وہ بہت بدصورت لگ رہی ہے۔ اس کی عمر بھی زیادہ لگ رہی ہوگی۔ عمر بھر وہ سوچتی۔ مجھے خوب صورتی کا کیا کرنا۔ ہر ہفتے وہ اپنے بالوں کو مختلف رنگت دیتی۔ حالانکہ اس کے اپنے بالوں کی شہد جیسی رنگت بہت خوب صورت تھی لیکن جب آدمی کو قرار نہ ہو تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔

کھڑکی کے بند پردوں سے کوئی ایک میل ادھر ایک ندی بہتی تھی۔ موسم سرما میں وہ زیادہ تر خشک رہتی۔ اس کے سینے پر چھوٹے موٹے تالاب سے بنے رہتے لیکن بہار آتے ہی وہ پُرشور انداز میں بہنے لگتی۔ اس کا پاٹ بھی بڑھ جاتا۔ کنارے بھر جاتے دن بھر وہاں پرندوں کا میلہ لگا رہتا۔

رات میں بھی اُلّو کے چیخنے کی کریہہ آواز سنائی دیتی۔ وہ اکثر جاگ جاتی اور ان آوازوں کو سنتی رہتی۔ اسے ایسا لگتا کہ وہ اس کے اندر اٹھنے والی چیخوں کی بازگشت ہے۔ بیری وہاں پہنچ کر زندگی کی سادگی اور حسن میں گم ہو جاتا تھا۔ سادگی اور حسن۔ ہونہہ! وہ درختوں سے لکڑیاں کاٹتا۔ ان لکڑیوں کو چیرتا۔ پرندوں کو پکڑنے کے لئے زمین پر جال بچھاتا۔ سیب کے درختوں کے لاڈ کرتا۔ پھولوں کی کیاریاں بناتا۔ کبھی ندی پر مچھلی کا شکار کھیلنے چلا جاتا۔ اور کبھی یونہی چہل قدمی کے لئے نکل جاتا۔ یہ اس کی وہ خوشیاں تھیں جنہیں بانٹنے والا کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ ان خوشیوں میں مست ہو کر اپنے اندر..... بہت اندر گم ہو جاتا۔ ایسے میں اسٹیلا کو توہین کا بہت شدید احساس ہوتا۔ اس پر ڈپریشن طاری ہو جاتا۔

ایک دن بیری نے اسٹیلا کو کچن ٹیبل کے پاس گرا پایا۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ پہلے جام اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا۔ پھر وہ منہ کے بل ٹوٹے ہوئے جام پر گری تھی۔ خون بہہ رہا تھا مگر اسے ہوش نہیں تھا "میں تم سے بہت محبت کرتا تھا۔ لیکن کس لئے۔ یہ مجھے معلوم نہیں" اس نے جھنجلا کر کہا تھا۔

اور اسٹیلا کو جواب دینے کا ہوش تھا "وہ محبت نہیں' خیرات تھی.... خیرات!"

○☆○

ایک روز وہ دوپہر کے قریب سو کر اٹھی تو ایک حیرت انگیز نظارہ اس کے سامنے تھا۔ وہ مارچ کا مہینہ تھا۔ بلکہ مارچ بھی آدھے سے زیادہ گزر چکا تھا۔ لیکن برف باری ہوئی تھی۔ غیر متوقع باتیں اور چیزیں کتنی اچھی لگتی ہیں' اس کا اندازہ اسے اس روز ہوا۔

برف ایک فٹ... بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی۔ ہر چیز پر برف کی ہموار تہہ تھی۔ درخت' باغیچے کے پودے' زمین سب سفید ہو رہے تھے اور وہ کنوارا سفید رنگ تھا لیکن مارچ کی تیز دھوپ میں نیلگوں لگ رہا تھا۔ ہر چیز..... سب کچھ خوب صورت لگ رہا تھا۔ اسٹیلا کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ اٹھی اور بیڈ روم کی کھڑکی کے پاس گئی۔ دھوپ نے برف کو پگھلانا بھی شروع کر دیا تھا۔ چھت سے پانی جھرنے کی طرح گر رہا تھا۔

پھر اسے بیلچے اور پھاوڑے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے نیچے جھانکا۔ باغیچے کے راستے پر بیری پھاوڑا ہاتھ میں لئے بڑی جاں فشانی سے برف ایک طرف ہٹا رہا تھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ انیس بیس سال کی عمر کا ایک سیاہ بالوں والا لڑکا بھی اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

اسٹیلا کو سردی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے نائٹ گاؤن ہی پر فرکوٹ پہنا اور نیچے چلی آئی۔ اس نے کافی کا پانی رکھا ہی تھا کہ بیری کا چہرہ کچن کے دروازے میں نمودار ہوا "یہ لڑکا سعید خان ہے۔ میں لاہور میں اس سے ملا تھا۔ ہر فن مولا ٹائپ کا لڑکا ہے۔"

"یہ کس قسم کا تعارف ہے۔"
"بہت بہتر۔ مسز بیری ہیڈ، مسٹر سعید خان سے ملیے۔ میرا لاہور کا دوست" بیری نے مسخرے پن سے کہا "ویسے زبردست برف باری ہوئی ہے۔"
"میں دیکھ رہی ہوں۔"
"یہ بھی حیرت انگیز بات ہے۔ ارے واہ.... کافی کی خوشبو کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ سنو، یہ لڑکا صبح آٹھ بجے سے برف ہٹانے میں لگا ہوا ہے۔ بڑا جان دار لڑکا ہے۔"
"میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں لیکن میرا خیال ہے، پہلے اسے ناشتا کرنا چاہیے۔ تم پوچھ لو اس سے... میں انڈے فرائی کروں گی۔"

بیری نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ سو کر اٹھی تھی۔ اس نے ابھی تک میک اپ بھی نہیں کیا تھا اور بہت زرد لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر برف سے منعکس ہونے والی دھوپ تھی۔ پیلے پن کے باوجود اس کے چہرے پر زندگی کی رونق تھی۔ اس کے انداز میں بھی وہ اضمحلال کشیدگی اور سوگواری نہیں تھی، جو ہر صبح نظر آتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ برف نے اسے اس کی بے خبری میں مسحور کر لیا ہے۔ وہ بہت پُرسکون لگ رہی تھی پھر یہ انڈے تلنے کی پیشکش..... حالانکہ یہ ناشتے کا وقت نہیں تھا۔ بیری دوبارہ باغیچے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا "ہاں اسٹیلا، لڑکا ناشتا کرے گا۔ میں بھی کروں گا۔ یہ بہت سخت کام ہے۔ ہم دونوں ہی بھوکے ہو گئے ہیں۔"

چند منٹ بعد وہ تینوں کچن ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ دونوں مرد ناشتے پر ٹوٹ پڑے تھے جبکہ اسٹیلا میز پر کہنیاں ٹکائے کافی کی پیالی سامنے رکھے بیٹھی تھی۔ لڑکا بڑے جنگلی پن سے کھا رہا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر برا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک اور حیرت انگیز بات لڑکے کی خود اعتمادی تھی۔ عام طور پر ہندوستانی لوگ شدید احساسِ کمتری میں مبتلا تھے۔ اول تو وہ کسی انگریز کے ساتھ کھانے کی میز پر ہی نہ بیٹھتے۔ بیٹھتے تو تمام وقت چھری کانٹے میں الجھے رہتے۔ ٹھیک طرح سے کھا بھی نہ پاتے مگر یہ لڑکا اپنے طریقے سے کھا رہا تھا اور انداز سے لگتا تھا کہ اسے ان دونوں کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہے اور اگر احساس ہے تو پروا نہیں ہے۔
لڑکے کی بھوری آنکھوں میں ہلکی سی نیلاہٹ تھی۔ وہ بے حد چمک دار آنکھیں تھیں اور آرپار دیکھتی محسوس ہوتی تھیں۔ لیکن وہ انہیں اٹھا کم ہی رہا تھا۔ اس کی پیشانی غیر معمولی کشادہ تھی۔ اس کی بھنویں بہت گھنی اور خمیدہ تھیں، ایسی کہ اس کی آنکھیں گھونسلوں میں رکھے ہوئے انڈوں جیسی لگتی تھیں۔
اسٹیلا کو احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ اسے مسلسل دیکھ رہی ہے۔ لڑکے کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً نظریں اٹھاتا، کن انکھیوں سے اسے دیکھتا اور تیزی سے نظریں جھکا لیتا۔

اب وہ نروس ہو رہا تھا اور کھانے کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔
"میں کچھ اور انڈے تل رہی ہوں" اسٹیلا نے کہا "بس ایک منٹ لگے گا۔"
"نہیں میم صاحب شکریہ" لڑکے نے جلدی سے کہا "میں تو کھا چکا....."
"اوہ کم آن" بیری نے اس کی بات کاٹ دی "تمہیں ضرورت ہے کھانے کی۔ گیراج تک کا راستہ صاف کرنا ہے ابھی۔ بہت سخت کام ہے۔"
"نہیں جی۔ اتنا سخت بھی نہیں۔"
اسٹیلا نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ کام تو بلاشبہ سخت تھا لیکن وہ اتنا جاندار تھا کہ اسے کوئی کام بھی سخت نہیں لگتا ہو گا۔ وہ اٹھی اور اسٹوو کی طرف چل دی۔ اس نے اسٹوو جلایا، انڈے تلے اور پھرتی سے پاٹ میں کافی انڈیلی۔ بیری اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہر انداز آج غیر معمولی تھا ورنہ وہ تو اس وقت شراب کے نشے میں ہوتی تھی۔ کسی کا خیال کرنا اور اتنی پھرتی سے کام کرنا، اس کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ وہ اتنا حیران تھا کہ اس نے فقرے چست کرنے شروع کر دیے "کیا بات ہے۔ آج تو بڑی چست ہو رہی ہو۔ پیاری بھی لگ رہی ہو۔"
"اچھا۔ مجھے تو احساس ہی نہیں ہوا۔ کیا واقعی؟"
"آج تو تم ابابیل کی طرح خوش مزاج اور خوش گلو بھی ہو رہی ہو۔"
"یقین نہیں آتا" اسٹیلا نے کہا "شاید یہ برف کا کمال ہے۔"
ابابیل کے تذکرے پر لڑکے کے ہاتھ رک گئے "ابابیلیں تو آ چکی ہیں۔ کل ہی میں نے ابابیل دیکھی تھی" اس نے شرمیلے لہجے میں کہا۔
"میں تو سمجھتی تھی کہ وہ صرف موسم گرما میں آتی ہیں۔"
"نہیں میم صاحب۔ بس یہ آخری برف باری ہوئی ہے اور یہ بھی بے وقت ہے" لڑکے نے کہا "ابابیلیں سردی رخصت ہوتے ہی آ جاتی ہیں۔ ابابیلیں واپس آ جائیں تو سمجھ لیں کہ بہار آنے والی ہے۔"
"کیسی ہوتی ہے ابابیل؟ میں نے کبھی نہیں دیکھی" اسٹیلا بولی۔
لڑکے نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ حیرت اور بے یقینی ایسی تھی کہ وہ چند لمحے جواب بھی نہ دے سکا۔ پھر وہ اسے ابابیل کے متعلق بتانے لگا "میں آج ہی آپ کو دکھاؤں گا ابابیل" اس نے کہا "دھوپ بہت تیز ہے۔ ابابیلیں ضرور نکلیں گی۔"
"اتنی سردی میں ٹھٹھر کے مر نہیں جائیں گی؟" اسٹیلا نے پوچھا۔
"سردی اتنی تو نہیں ہے۔ برف پڑتی ہے لیکن دھوپ بھی تو بہت تیز ہے" لڑکے نے کہا "لیکن آپ کی بات ٹھیک ہے۔

ابابیلوں کو سردی راس نہیں۔ اسی لئے تو سردی آنے سے پہلے ہی یہ نیچے کے علاقوں کی طرف اڑ جاتی ہیں۔"
"تو یہ ہجرت بھی کرتی ہیں؟"
"جی میم صاحب۔ یہاں یہ ایسے آتی ہیں جیسے صاحب لوگ سیزن گزارنے آتے ہیں۔ زیادہ تر یہ اپنے پرانے گھونسلوں میں آکر رہتی ہیں۔ بہار میں انڈے دیتی ہیں۔ بچے نکلتے ہیں۔ گرمی گزرتے گزرتے بچے بڑے ہو جاتے ہیں پھر یہ اڑ جاتی ہیں۔"
"گھونسلا کیسا ہوتا ہے ان کا؟"
"بہت خوب صورت۔ میم صاب جیسے ہم لوگ مکان بناتے ہیں مٹی سے ویسے ہی یہ بھی بناتی ہیں۔ گندھی ہوئی گاڑھی مٹی اور اس کے ساتھ بھوسا۔ چھت سے تھوڑا نیچے کسی چیز کے سہارے سے بناتی ہیں۔ گراپیسا ہوتا ہے۔ صرف دو ابابیلیں رہ سکتی ہیں ان میں۔"
"مجھے دکھاؤ بھی۔"
"ضرور دکھاؤں گا۔"
بیری ہنسنے لگا "لگتا ہے تم سعید خان کی شاگردی اختیار کرو گی" اسے خوشی تھی کہ اسٹیلا زندگی میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اس سے پہلے شاید اس نے پرندوں کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ بہت اچھی علامت تھی۔ برف باری نے کمال کر دکھایا تھا۔
"یہاں زیادہ پرندے نظر نہیں آتے" اسٹیلا بدستور سعید خان کی طرف متوجہ تھی۔
"یہاں تو ہر طرح کے پرندے ہیں۔ مینائیں تو کثرت سے ہیں۔ بلبل ہدہد اور کیا بتاؤں۔ سیکڑوں ذات کے رنگ برنگ پرندے۔"
اسٹیلا کھلکھلا کر ہنس دی "پرندوں کے چہچہے تو بہت سنے ہیں میں نے لیکن دیکھے صرف کوّے ہیں۔"
"آپ گھر سے نکلتی ہی نہیں ہوں گی۔"
"تمہارا اندازہ درست ہے سعید خان" بیری نے تائید کی "میم صاحب کا اس ویرانے میں دل ہی نہیں لگتا۔ اسی لئے کاٹیج میں بند رہتی ہیں ہر وقت" اس نے کافی کی پیالی خالی کر کے رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا "اب ہم چلتے ہیں مسز رچرڈسن" اس نے شگفتگی سے کہا۔ "پرندوں کے بارے میں کوئی اور سوال؟"
"لڑکا ابھی ناشتا کر رہا ہے۔ اتنی جلدی کیا ہے" اسٹیلا نے کہا۔
"میں جلد از جلد گیراج کا راستہ صاف کر دینا چاہتا ہوں" بیری نے کہا۔ پھر وہ لڑکے کی طرف مڑا "میں گیراج کی طرف سے صفائی شروع کرتا ہوں۔ تم اطمینان سے ناشتا کر کے آنا۔"
بیری کے جانے کے بعد اسٹیلا دس منٹ تک لڑکے کے ساتھ اکیلی رہی۔ کھڑکی کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ جبکہ لڑکا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ سحر زدہ سی اس کی آنکھوں کو دیکھتی رہی۔ وہ آنکھیں اس پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ اس کی خود اعتمادی جیسے سلب ہو رہی تھی۔ اس نے سگریٹ سلگائی تو اس کے ہاتھ لرز رہے تھے لیکن یہ غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سو کر اٹھنے کے بعد اس کا یہی حال ہوتا تھا۔ ہاتھوں کی لرزش کے نتیجے میں ماچس اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ لڑکے نے جھک کر ماچس اٹھائی۔ سگریٹ اسٹیلا کے ہونٹوں میں دبی ہوئی تھی اور سلگ نہیں سکی تھی۔ لڑکے نے دیا سلائی جلا کر ادب سے اس کی طرف بڑھائی۔
"شکریہ سعید خان۔ بڑی مہربانی" اس نے کہا۔
سعید خان کچھ کہے بغیر پھر پلیٹ پر جھک گیا۔
"تم کہاں رہتے ہو؟"
"قریب ہی گاؤں ہے میرا۔"
"تم مسلم ہو نا؟"
"جی ہاں میم صاب۔"
"یہاں ہندو تو بہت رہتے ہیں؟"
"جی ہاں میم صاب" سعید خان نے پلیٹ صاف کی اور اٹھ کھڑا ہوا "کوئی ابابیل نظر آئی تو میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"
"میں باہر آنا چاہوں تو بوٹ پہننا ضروری ہوگا؟" اسٹیلا نے پوچھا۔
"جی نہیں۔ راستہ صاف ہے۔ ویسے بھی دھوپ میں برف سخت ہو رہی ہے۔"
اچانک اسٹیلا کے اندر شدت سے خواہش ابھری کہ وہ اوپر جائے اور کپڑے بدلے۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہ نائٹ گاؤن میں ہی رہتی تھی۔ اور ایسا لگتا تھا جیسے کوئی دھواں دھواں خواب ہے جس میں وہ چل پھر رہی ہے۔
اس روز اس نے اپنے لئے سبز ٹویڈ کا ڈریس نکالا، سلیقے سے بال برش کئے۔ ہلکا سا میک اپ کیا۔ یہاں تک کہ آخری لمحے میں اس نے موتیوں کے چھوٹے ایئر رنگ کانوں میں ڈال لئے۔ موتیوں کی ایک مالا بھی گلے میں ڈال لی۔ اس چکر میں اسے برتنوں کا خیال ہی نہیں رہا۔ سنے ہوئے برتن دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اس کی یہ حرکت احمقانہ ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس کے اندر پینے کی خواہش شدت سے ابھری۔ جاگے ہوئے اتنی دیر ہو چکی تھی اور اس نے گلا تر بھی نہیں کیا تھا۔
وہ اپنے لئے جام بنا رہی تھی کہ باہر سے لڑکے نے اسے پکارا۔
"میم صاب!"
اس نے جام چھوڑا اور باہر چلی گئی۔ باہر مارچ کی تیز دھوپ تھی۔ برف پگھل رہی تھی اور ہر طرف ٹپاٹپ لگی تھی۔ آسمان صاف تھا۔ برف کے پس منظر میں لڑکا زیادہ دراز قد، زیادہ جسیم لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی نیلاہٹ بھی زیادہ نمایاں ہو گئی تھی۔
"وہ دیکھیں... اوپر" لڑکے نے ہاتھ سے اشارہ کیا "یہ ہے ابابیل۔"
اسٹیلا نے سر اٹھا کر دیکھا "اتنی چھوٹی؟"
"جی ہاں" اسٹیلا دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ابابیل کو بولتے سنا۔ اسے لگا کہ اس کے سینے میں بہت سی ابابیلیں اڑ رہی ہیں۔ گانا گا رہی ہیں۔ وہ اس کے لئے بے ساختہ، سادہ اور غیر معمولی مسرت کا لمحہ تھا۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور خوشی سے چلائی "میں نے دنیا میں اس سے زیادہ خوب صورت کوئی چیز نہیں دیکھی اور میں نے اس سے خوب صورت آواز بھی نہیں سنی۔ بیوٹی فل!"

○☆○

برف اور ابابیل کی یکجائی کا وہ منظر اسٹیلا کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ کاٹیج سے اسے بھی خوشی ملی تھی۔ گرد و پیش کی ویرانی اب اسے مقدس لگ رہی تھی۔ سادگی میں لپٹی ہوئی وہ اچھوتی خوب صورتی اچانک ہی اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ سادہ زندگی... واہ!
"یہ لڑکا سارے کام کر سکتا ہے۔ کھانا پکا لیتا ہے۔ رنگ و روغن کرا لو۔ مالی کا کام بھی کر دے گا۔ اچھا خاصا الیکٹریشن بھی ہے۔ کھانا بھی سرو کر سکتا ہے" بیری نے اسے بتایا۔
"تو ہمیں کون سی ڈنر پارٹیاں دینی ہیں۔ ہم تو یہاں مصروفیت سے فرار کی خاطر..."
"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس سے رنگ و روغن کا کام کرا لوں۔ کچن کے لئے وال پیپر۔ کاٹیج کی شکل نکل آئے گی۔ اتنا عرصہ ہو گیا۔ اب تو یہ اجاڑ لگنے لگا ہے۔"
"یہ تمہارا اور تمہارے کاٹیج کا معاملہ ہے۔ میں کون اس معاملے میں بولنے والی۔ لیکن کیا اس لڑکے کو یہاں اکیلا چھوڑنا مناسب ہوگا؟"
"ارے... میں اسے لاہور سے جانتا ہوں۔ اور پھر اس کا گاؤں یہاں قریب ہی ہے۔ ایک بات بتا دوں، یہ لوگ چور اور بے ایمان ہرگز نہیں ہیں۔"
"پھر بھی... خیر تم جانو" اسٹیلا نے بے پروائی سے کہا۔
"اس مسئلے کا ایک آسان حل یہ ہے" بیری نے کہا "تم اس ہفتے یہاں رک جاؤ۔ کام کی نگرانی بھی کر لینا اور اس پر نظر بھی رکھنا۔"
اسٹیلا خاصی رد و قدح کے بعد مان گئی "لیکن مجھے گاڑی کی ضرورت ہوگی۔ مانسہرہ جا کر پینٹ اور دوسری چیزیں لاتا ہوں گی۔ ویسے میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ یہ برف پر ڈرائیو کرنا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔"
"ارے... کل تک برف کا نام و نشان بھی نہیں رہے گا۔ دیکھو نا بارش کے آثار ہیں۔"
"کاش ایسا نہ ہو۔ برف مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ چند دن تو رہے۔"
بہرکیف یہ طے پا گیا۔ بیری نے سعید خان سے بات بھی کر لی۔
اگلی صبح سعید خان نے کچن کی آرائش کے لئے تیاری شروع کر دی۔ باہر چاروں طرف اب بھی برف تھی۔ البتہ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے تالاب سے بن گئے تھے۔ برف جہاں نرم تھی وہاں تیز دھوپ نے اسے پگھلا دیا تھا "تو تمہارے خیال میں یہ بہت اسٹرانگ رہے گا" اسٹیلا نے سعید خان سے کہا۔
"جی ہاں۔ میرا خیال ہے گرین مناسب ترین رنگ ہے۔"
"تم ذوق بھی رکھتے ہو اور تمہیں رنگوں کی تمیز بھی ہے۔"
پہلے دن اسٹیلا ریگ مال سے دیوار صاف کرتی رہی جبکہ سعید خان تازہ پلاسٹر سے دیواروں کے رخنے بھرنے میں مصروف رہا۔
"یہاں مچھلی کی بو بری طرح رچی ہوئی ہے" اسٹیلا نے شکایت کی۔
سعید خان کا چہرہ شرمندگی سے تمتما اٹھا "میرے کپڑوں سے آرہی ہوگی میم صاب" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "میں یہی کپڑے پہن کر مچھلیاں پکڑنے گیا تھا۔"
"اوہ۔ کبھی مچھلی پکڑی بھی ہے تم نے؟" اسٹیلا کے لہجے میں اشتیاق تھا۔
"جی ہاں۔ ہم مچھلی کے شکار کو جاتے رہتے ہیں۔"
"کہاں جاتے ہو؟"
"یہ نیچے تھاکوٹ ہے نا۔ وہاں دریا ہے۔ بہت بڑا دریا ہے۔"
"بوٹ ہے تمہارے پاس؟"
وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا "نہیں میم صاب جی" پھر اس نے پوچھا "آپ کو مچھلی اچھی لگتی ہے؟"
اسٹیلا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"اگلی بار ہاتھ لگی تو آپ کے لئے مچھلی ضرور لاؤں گا۔"
"سو سویٹ آف یو۔ تم تو بہت شاندار آدمی ہو۔"
یہ اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی تعریفیں سعید خان پر اثر انداز ہوتی رہیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ میم صاب اسے پسند کرنے لگی ہیں اور ان کا انداز اس کے ساتھ مشفقانہ ہے۔ اس نے سوچا کہ اس کا بھی فرض ہے کہ ہر طرح سے ان کا خیال رکھے اور ایسا کوئی کام نہ کرے جو ان کے لئے ناپسندیدہ ہو۔ اس نے انہیں مچھلی کی بو سے بچانے کے لئے اپنا سویٹر اور قمیص بھی اتار دی۔ وہ سردی کے باوجود صرف بنیان میں کام کرتا رہا۔
اسٹیلا وقفے وقفے سے اسے چائے بنا کر دیتی رہی۔ ہر بار اپنے لئے وہ ایک جام بھی بناتی۔ اس نے اسے شراب کی دعوت نہیں دی۔ کیونکہ وہ کم عمر تھا "اگر تم چاہو تو کل میں تمہارے لئے بیئر لے آؤں گی۔ چائے کی بجائے بیئر پینا تم..."
"شکریہ میم صاب۔ اس کی ضرورت نہیں۔ چائے مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔"
اسٹیلا کبھی کبھی بے اختیار اس کی آنکھوں کو دیکھنے لگتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ عین اسی لمحے سعید خان کی نظریں بھی اٹھ گئیں۔ چند لمحے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا اور پھر گھبرا کر نظریں...

جھکا لیتا۔

"سپر ہو گئی میں تو تھک کر چور ہو گئی ہوں" اسٹیلا نے کہا۔ "تم نہیں تھکے؟ صبح سے جٹے ہوئے ہو۔"

"نہیں میم صاحب۔ میں کبھی نہیں تھکتا۔"

"تم ابھی تم جوان ہو نا۔ کرنل جوان! جوانی اور تھکن کی آپس میں نہیں بنتی۔"

○☆○

اگلی صبح وہ آیا تو اس کی سائیکل کے کیریر پر ایک ٹوکری بندھی ہوئی تھی۔ اس نے سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کی اور ٹوکری اتار کر اندر لے آیا "میں آپ کے لئے مچھلیاں لایا ہوں میم صاحب" اس نے کہا "یہاں سے جانے کے بعد میں دریا پر چلا گیا تھا۔ دو بجے گھر واپس آئے ہم۔"

"کیا ضرورت تھی۔ تم کر رہ گئے ہو گے۔"

"نہیں جی۔ سردی میں تو مچھلی کھانے کا مزہ آتا ہے۔ ہمیں سردی کا تو پتا بھی نہیں چلتا۔"

اسٹیلا اس پر اظہار رشک کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ اس نے مچھلیاں دیکھیں "اتنی مچھلیاں! میں کیا کروں گی اتنا۔ یہ تو ہفتوں چلیں گی۔ میں تو کھانا کم ہی کھاتی ہوں۔"

"آپ کہیں تو میں مچھلی تل دوں۔ یہ چھوٹی مچھلیاں تو محفوظ کی جا سکتی ہیں۔ بڑی والی تازہ ہی اچھی رہتی ہیں۔ دوپہر کے کھانے پر تل دوں گا۔"

"ہاؤ سویٹ آف یو۔ لیکن کچن اتنے برے حال میں ہے۔ ایسے میں تو مجھ سے کچھ کھایا نہیں جاتا۔"

"تو چلیں رات کے کھانے پر سہی۔"

اسٹیلا کھل اٹھی "یہ ٹھیک ہے۔ بہت بہت شکریہ تمہارا۔ مگر میں اتنی مچھلی اکیلے نہیں کھا سکتی۔ تمہیں بھی میرا ساتھ دینا ہو گا۔"

شام سات بجے تک دیواروں کے رخنے بھر دیے گئے۔ پرانا پینٹ بھی کھرچ دیا گیا۔ کچن کی صفائی بھی ہو گئی۔ سات بجے سعید خان نے مچھلی فرائی کرنے کی تیاری شروع کی۔ ٹوکری میں ایک سفید ایپرن بھی تھا۔ اس نے وہ باندھ لیا۔ اسٹیلا حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کا انداز پروفیشنل تھا۔ پھر وہ ہر کام بڑی نفاست سے کر رہا تھا۔ اس نے مچھلی تلنے کے علاوہ آلو کے قتلے بنائے۔ سلاد بھی تیار کی "مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ تم اتنے پرسکون ہو کر کام کرتے ہو۔ یہ سب کچھ کیسے سیکھا تم نے؟"

"میں لاہور میں کرنل بیگ کے بنگلے پر کام کرتا رہا ہوں۔" سعید خان نے شرمیلے لہجے میں بتایا۔

"بڑے سلیقے سے کام کرتے ہو تم۔ میں اپنے سارے کام کرنے کا سوچ بھی لوں تو پاگل ہو جاؤں۔ میں تو بیٹھی رہتی ہوں۔ کوئی کام ہی نہیں ہوتا مجھ سے۔"

انہوں نے سٹنگ روم میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اسٹیلا نے دو مچھلیاں روش کی تھیں۔ اسٹیلا تمام وقت مچھلی کی تعریف کرتی رہی۔ "میں نے کبھی اتنی لذیذ مچھلی نہیں کھائی۔ اور آلو بھی بہت عمدہ ہیں۔ تم تو جینئس ہو لڑکے۔ میں تمہیں مستقل طور پر اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔"

"آپ جب جی چاہے حکم کر دیا کریں" سعید خان نے کہا۔ "مجھے آپ کے لئے کھانا پکا کر خوشی ہو گی۔"

"تم بہت پیارے لڑکے ہو... بہت قیمتی۔"

○☆○

وہ بازار جا کر پینٹ، وال پیپر اور دوسری چیزیں لے آئی تھی۔ سعید خان نے کام شروع کر دیا تھا۔ کچن کو اس نے سب سے پہلے نمٹایا تھا۔ اسٹیلا اس سے بہت خوش تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اتنے برسوں کے بعد وہ زندگی سے خوش تھی۔ وہ اسے ڈارلنگ کہہ کر پکارتی تھی۔

اس روز بھی کھانا اس نے ہی پکایا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے برتن دھونے پر بھی اصرار کیا تھا۔ اس دوران اسٹیلا آتش دان کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں برانڈی کا گلاس تھا جس سے وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی۔ سعید خان برتن دھو چکا تو اسٹیلا نے اصرار کر کے اسے آتش دان کے سامنے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس وقت تک اسٹیلا برانڈی کے کئی جام پی چکی تھی۔ وہ بڑی خوب صورت خواب ناک کیفیت تھی۔ وہ بے خودی کے عالم میں بولے جا رہی تھی "میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اس گھر میں اتنا اچھا وقت بھی گزر سکتا ہے۔ یہ تمہارا ہی کمال ہے۔"

اسٹیلا کے نزدیک اس میں کوئی غیر فطری بات نہیں تھی کہ وہ اس کی طرف مڑے اور اس کے گھٹنوں پر نرمی اور آہستگی سے اپنا سر رکھ دے۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ ایسے موقعوں پر سعید خان کا پورا جسم کسی کمان کی طرح کھنچ جاتا تھا۔ وہ نروس ہو جاتا تھا۔ ان کے درمیان خاموشی بڑی کشیدہ ہوتی تھی۔

ایسے ہی ایک موقع پر سعید خان نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور انہیں بڑی محبت سے سہلانے لگا لیکن اس کے اپنے ہاتھ لرز رہے تھے۔ اسٹیلا استعجاب آمیز مسرت سے اسے دیکھتی رہی۔ اچانک سعید خان نے اپنا چہرہ جھکایا اور اس کے ہاتھوں کو بے تابانہ چومنے لگا۔ اسٹیلا کے نزدیک یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ نشہ دھند کی طرح اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اسے نجانے کیوں سعید خان پر ترس آنے لگا۔ پھر اسے احساس بھی نہیں ہوا۔ اس نے اسے چھیڑنا، بھڑکانا شروع کر دیا "تم بہت ہی پیارے لڑکے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ہزاروں لڑکیاں تم پر مرتی ہوں گی۔"

"نہیں... نہیں میم صاب" وہ بڑبڑایا۔

"جھوٹ مت بولو ڈارلنگ۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"میں نہیں مانتی۔"

"میری منگنی ہو چکی ہے۔ مگر میری منگیتر بڑی نا سمجھ ہے۔ آپ جیسی تو بالکل نہیں ہے۔"

"اب تم مجھے بتاؤ گے کہ تمہیں زیادہ عمر کی عورتیں اچھی لگتی ہیں۔ ہے نا؟" اسٹیلا نے کہا اور لاڈ سے ہنسنے لگی "میرا لی بوائے۔"

اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ خاموشی اسٹیلا کے لئے طمانیت بخش تھی جبکہ سعید خان نروس ہو رہا تھا۔

پھر اسٹیلا نے ہی خاموشی توڑی "ڈارلنگ، میرے لئے برانڈی کا ایک اور جام بناؤ۔ بڑا جام۔"

کچھ دیر اور گزری تو اسٹیلا کو اپنے ہونٹوں پر قابو نہیں رہا۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ لفظ گڈمڈ ہونے لگے۔ وہ بات بے بات ہنسنے لگی۔ ذہن پر چھائی ہوئی دھند اور گہری ہونے لگی۔ اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کھلنڈرے پن سے کہا "تم مجھے پیار کرنا چاہتے ہو؟ اچھا کر لو۔ مگر صرف آج کے لئے میں تمہیں اجازت دے رہی ہوں۔"

اس کے بعد کچھ پرجوش لمحے آئے۔ اس نے سعید خان کے بے قابو ہاتھوں کو اپنے جسم پر مچلتے دیکھا۔ مگر پھر اچانک جیسے چلتے چلتے فلم ٹوٹ گئی۔ اس سے پہلے اس نے سعید خان کی آہ سنی تھی۔ مگر اس وقت تک اس کی بے خودی میں سپردگی مکمل مل گئی تھی۔ اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔ بس اسے یاد تھا کہ وہ اسے چھوڑ گیا ہے۔ کئی گھنٹے بعد وہ جاگی۔ شاید سردی کا احساس اسے ہوش میں لایا تھا۔ آتش دان سرد ہو چکا تھا اور اس پر تھرتھری چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ تنہائی کا مہیب احساس بھی تھا۔ جیسے تیسے وہ خود کو گھسیٹتی ہوئی بستر تک لے گئی۔

○☆○

اگلے روز سعید خان سٹنگ روم کی دیواروں پر رنگ کر رہا تھا۔ کبھی پینٹ کی ضرورت ہوتی تو وہ ڈبا اسے دیتا اور وہ ڈبے میں پینٹ انڈیل کر اسے دے دیتی۔ ایک گھنٹا ہو گیا "تم نے کل میرے ساتھ بہت زیادتی کی" اسٹیلا نے بالکل اچانک کہا۔

سعید خان کا برش والا ہاتھ جیسے بے قابو ہو گیا "آپ مجھ سے خفا ہیں؟"

"کاؤ نو۔ لیکن ہر عورت چاہتی ہے کہ اس کی مرضی بھی معلوم کی جائے۔"

"آپ نے مجھے اجازت دی تھی" اس نے شرمیلے پن سے کہا۔

"مجھے تو یاد نہیں" اسٹیلا نے کہا۔ پھر اچانک ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اسے یاد آگیا "ہاں...... یاد آگیا مجھے۔ پھر تم مجھے چھوڑ کیوں بھاگے؟"

"وہ میں اجازت کی حد سے بڑھنے والا تھا۔ اس لئے۔"

"یوں کہو کہ تم ناکام رہے۔"

سعید خان کے پاس اس زخمی کر دینے والے تبصرے کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی انا کو ٹھیس لگی لیکن اسٹیلا کو احساس نہیں ہوا کہ وہ بے رحمانہ تبصرہ تھا "سنو ڈارلنگ، ایسی باتیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ یہ آرٹ ہے ڈیئر۔"

سعید خان اب بھی گنگ تھا۔ اس کی کروائی جیسے سلب ہو گئی تھی۔ اچانک اسٹیلا کو احساس ہوا کہ اس نے ایک غیر معقول بات کہی ہے "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تم بہت پیارے لڑکے ہو۔ کل میں بہت نشے میں تھی۔"

"جی۔ میرا خیال ہے کہ بہت زیادہ۔"

"میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ میں نشے میں بہت نرم مزاج اور رحم دل ہو جاتی ہوں" اسٹیلا نے اپنے طور پر سلائی پیش کی۔

"آپ ہر حال میں اچھی ہیں۔"

"لیکن ایسے موقعوں پر عورت ہوش میں رہنا چاہتی ہے" کہ اس نے موضوع بدلا "میں تمہارے لئے کافی بناتی ہوں۔"

لڑکا بجھ کر رہ گیا۔ اسٹیلا کو اس پر ترس آنے لگا۔ وہ کافی بنا کر لائی "سنو لڑکے، یہ منہ کیوں لٹکا لیا ہے تم نے؟"

"جی... نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ تم مجھے پیار کر سکتے ہو۔ کیا چاہتے ہو تم؟"

"نہیں جی۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ اسی طرح تو بات آگے بڑھتی ہے" لڑکے نے دانش مندی سے کہا۔

اسٹیلا کو اس کا جواب اچھا لگا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی "برف تو بہت تیزی سے پگھل رہی ہے۔"

"جی ہاں میم صاب۔"

"میں کافی نہیں پینا چاہتی" اسٹیلا نے اچانک کہا "میں برانڈی لوں گی" ایک بجے تک وہ کئی جام حلق سے اتار چکی تھی۔ اس کے اندر محبت اور سرشاری کروٹ لے رہی تھی۔ وہ بڑی گرم جوشی سے باتیں کر رہی تھی۔ بلکہ وہ کچھ زیادہ ہی بول رہی تھی۔ اس وقت بھی اسے دیکھ کر کوئی یقین نہ کرتا کہ یہ وہی اس کی لڑاکا بیوی ہے۔

"تم میرے پاس روز آیا کرو گے نا؟ دیکھو ڈارلنگ روز آنا۔ تم سے بات نہ کروں تو لگتا ہے پاگل ہو جاؤں گی۔ اور ہاں مچھلی بھی لاؤ گے نا۔"

"جی ہاں۔ لاؤں گا بھی اور پکاؤں گا بھی۔ مگر اس کے لئے مجھے ایک دو گھنٹے پہلے جانا ہو گا۔"

"مجھے چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتے ہو۔ مجھے تنہا چھوڑ کر۔ جبکہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"میں تو مچھلی کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔"

"میں جانتی ہوں ڈارلنگ۔ تم جاؤ۔"

"بہتر میم صاب۔"

"میم صاب نہیں میں مسز جہانزیب ہوں۔"

"بہت بہتر مسز جہانزیب۔"

"واپس رات کو آؤ گے؟"

"امید تو یہی ہے۔"

"بس تو میں آتش دان دہکا کر رکھوں گی۔ آج میں تمہیں بہت

کچھ سکھاؤں گی۔"
سعید خان کا چہرہ تپنے لگا۔
"ہاں۔ تجھ سے پیسے لینے ہاؤس۔ وائن بھی لے آنا۔"

○☆○

سعید خان کا رات کو کالج جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مسز رچرڈسن نے اسے جو کچھ سکھانے کو کہا تھا، وہ سیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ محکوم سہی، لیکن بہرحال مرد تھا اور وہ حاکم سہی مگر عورت تھی۔ اس نے اس کی مردانگی کو للکارا تھا۔ وہ دو طرح سے اس کا بدلہ لے سکتا تھا۔ ایک تو اسے پامال کرکے۔ لیکن ایک انجانی حس اسے بتا رہی تھی کہ اس میں جیت انگریز میم کی ہی ہوگی۔ وہ تو چاہتی ہی یہی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ وہ اس کے لئے ناقابل حصول ہو جائے۔ وہ اس کی آنکھوں میں نفسانی خواہش دیکھ چکا تھا۔ اسے تشنہ رکھنے میں ہی اس کی جیت تھی۔

مگر یہ کام مشکل بھی تھا۔ وہ بہرحال ایک مرد تھا اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ عورت مرد کو بہ آسانی بہکا سکتی ہے۔ اس کے پاس مدافعت کے لئے دو ہتھیار تھے۔ ایک تو مذہب، جو گناہ سے روکتا تھا۔ دوسرے یہ حقیقت کہ مسز رچرڈسن انگریز ہونے کے باوجود اسے اچھا انسان لگا تھا۔ عام انگریزوں کی طرح اس نے اس کے ساتھ حقارت کا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ اس کا بہکنا ایک اچھے انسان کے ساتھ غداری کے مترادف ہوتا۔ وہ گھر پہنچا تو اسی الجھن میں تھا۔ گھر سے نکلا تو باہر وزیر خان سے ملاقات ہو گئی "یارا۔ تم کہاں غائب ہو آج کل؟" وزیر خان نے کہا۔

"کام مل گیا ہے۔ تمہیں بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔"
"کہاں مل گیا کام؟"
"ادھر اوپر ایک انگریز صاحب کا بنگلا ہے۔ اچھا آدمی ہے یارا۔"
"قسمت والے ہو تم۔ اپنی تو لاہور کی کمائی چل رہی ہے۔ سوچتا ہوں پھر لاہور چلا جاؤں۔"

سعید خان جانتا تھا کہ گھر میں ریشم کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ وزیر خان کا لاہور جانا ٹھیک نہیں تھا۔ پھر اسے ایک آئیڈیا سوجھ گیا۔ اس نے چند لمحے غور کیا۔ پھر دل میں سوچا۔ واہ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام والا معاملہ ہے۔ وہ وزیر خان کو اپنے ساتھ کام پر لے جا سکتا تھا۔ وہ میم صاحب سے بھی محفوظ ہو جاتا اور وزیر خان لاہور بھی نہ جاتا "یارا..... کل سے تم بھی میرے ساتھ چلو نا کام پر" اس نے کہا۔

"تمہارا صاب اعتراض نہیں کرے گا؟"
"او یارا! تم میرے ساتھ چلو۔ میرا ہاتھ بٹانا۔ صاب جو بھی دے گا وہ آدھا آدھا کرلیں گے۔"
وزیر خان سوچ میں پڑ گیا "پھر بھی، تم پہلے پوچھ لو صاب سے۔"
"صاب تو ہفتے کو آئے گا۔ یہاں تو صرف میم صاب ہے۔ تم بس کل میرے ساتھ چلو۔"

وزیر خان ہچکچایا۔ مگر پھر مان گیا۔ اس میں اس کا نقصان تو کوئی نہیں تھا۔ سعید خان نے بھی سکون کی سانس لی۔ بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا "بس تم نو بجے تیار رہنا" سعید خان نے وزیر خان سے کہا۔
"وہ میم دیر تک سوتی ہے۔"
"میں تیار رہوں گا۔"
"سنو۔ مچھلی پکڑنے چلتے ہو؟" اچانک سعید خان نے پوچھا۔
"یہ اچانک مچھلی کی کیا سوجھی؟"
"او یارا! سمجھ لو یہ بھی کام ہے۔ وہ میں نے میم صاحب سے وعدہ کیا تھا۔"
"کام ہے تو چلو۔ کام کے لئے تو میں ہر وقت تیار ہوں۔"

○☆○

اگلی صبح وہ دونوں سائیکل پر پہنچے تو اسٹیلا جاگتی ملی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں۔ لگتا تھا، وہ جاگتی رہی ہے۔ اور وہ بہت ناراض بھی تھی "یہ کیا حرکت کی تم نے؟" اس نے غصے سے کہا۔ "پتا ہے، میں رات بھر جاگتی رہی ہوں۔"
"سوری مسز رچرڈسن۔ دریا سے واپسی میں بہت دیر ہو گئی تھی" سعید خان نے معذرت کی "میں مچھلیاں لایا ہوں جی آپ کے لئے۔"
"اور یہ کون ہے؟" اس نے وزیر خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وزیر خان سحر زدہ سا اسے تک رہا تھا۔
"یہ میرا دوست بھی ہے جی اور چچیرا بھائی بھی ہے۔"
"اسے کیوں لائے ہو؟"
"یہ جی کام میں میرا ہاتھ بٹائے گا۔ میں نے سوچا، صاب کے آنے سے پہلے کام مکمل ہو جائے تو صاب خوش ہو جائیں گے۔"
"لیکن بلا اجازت.....؟"
"یہ الگ سے پیسے نہیں لے گا مسز رچرڈسن۔ میں اپنے پیسوں میں سے اسے دے دوں گا۔"
"اچھا ٹھیک ہے۔ کام شروع کرو۔ اسے کام سمجھا کر کام پر لگاؤ اور پھر کچن میں آؤ" یہ کہہ کر اسٹیلا اندر چلی گئی۔
سعید خان وزیر خان کو اندر کمرے میں لے گیا "یہ کمرا پورا کرنا ہے۔ پھر اوپر دو بیڈ روم بھی ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ دو دن میں کام نمٹانا ہے۔ تم کام شروع کرو، میں آتا ہوں۔"
"یارا سعید خان، یہ تمہاری میم ہے بہت زوردار" وزیر خان نے کہا۔
سعید خان نے جاتے جاتے پلٹ کر اسے دیکھا "یہ کوئی پہلی میم تو نہیں دیکھی ہے ہم نے۔"
"پہلی تو نہیں ہے۔ مگر یہ مرتی ہے تم پر۔"
"وہم ہے تمہارا۔ میری بات سنو۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ کسی چکر میں نہ پڑنا۔ میں نے میموں کے چکر میں لوگوں کو جان سے جاتے دیکھا ہے۔ یہ حاکم لوگوں کا معاملہ ہے" سعید خان نے سخت لہجے

میں کہا۔
"پھر یارا، وہ تمہارے لئے رات بھر جاگتی رہی ہے۔"
"میرے لئے نہیں، مچھلی کے لئے" سعید خان نے خشک لہجے میں کہا۔
"میں شرط لگا سکتا ہوں۔ اسے مچھلیوں کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اس کی مچھلی تو تم ہو" وزیر خان ایک آنکھ بند کرکے مسکرایا۔
"بکواس مت کرو۔ کام کرو۔ میں تمہیں کام کے لئے یہاں لایا ہوں۔"
سعید خان مچھلیاں لے کر کچن میں پہنچا۔ کچن میں اسٹیلا چائے بنا چکی تھی "ناشتا کرو گے؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں مسز رچرڈسن۔ ہم ناشتا کرکے آئے ہیں۔"
"تو جاؤ۔ یہ چائے اپنے دوست کو دے کر آؤ" اس نے چائے کی پیالی سعید خان کی طرف بڑھائی۔
سعید خان وزیر خان کو چائے دے کر واپس آیا تو وہ جام ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی "ڈارلنگ، یہ تم دم چھلا اپنے ساتھ کیوں لگا لائے؟" اس نے شکایت کی۔ سعید خان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے وضاحت کی "یہ جو غیر آدمی کو تم میرے گھر میں لے آئے ہو۔"
"اسے میں کام کے لئے......"
"وہ تو تم مجھے بتا چکے ہو۔ مگر تمہیں مجھ سے اجازت لینی چاہئے تھی ڈیئر۔"
"اور وہ غیر نہیں، میرا بہت قریبی رشتے دار ہے۔ دوست بھی ہے پھر میرا ہونے والا بہنوئی ہے۔"
"بہنوئی؟ تمہارا مطلب ہے......"
"میری بہن سے اس کی شادی طے پاچکی ہے۔"
"اوہ، نام کیا ہے اس کا۔"
"وزیر خان ہے جی۔"
اسٹیلا چند لمحے کسی سوچ میں ڈوبی رہی پھر بولی "چائے پی کر تم بھی جاؤ۔ دوپہر کے لئے میں سینڈوچ بنا دوں گی۔ مچھلی رات کے کھانے کے لئے تلنا۔"
"بہت بہتر مسز رچرڈسن۔"

○☆○

شام پانچ بجے اسٹیلا نے سعید خان کو آواز دی۔ سعید خان آیا تو اس نے کہا "اب اس وزیر خان کی چھٹی کر دو۔"
"یعنی میں بھی چھٹی کرلوں۔"
"نہیں، تمہیں تو کھانا تیار کرنا ہے۔"
"لیکن مسز رچرڈسن۔ میں اسے اکیلا تو نہیں بھیج سکتا" سعید خان نے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یوں تو وزیر خان کو لانا بھی بے کار ہو جائے گا "آپ جانتی ہیں، اس سے میرا کیا رشتہ ہے" اس نے دلیل دی "ہاں، اسے بھی روک لیں تو اور بات ہے۔"
"مگر میں اسے نہیں روکنا چاہتی۔ مجھے وہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔ تمہاری اور بات ہے۔"
"تو پھر کیا کروں؟"
اسٹیلا تھوڑی دیر سوچتی رہی۔ پھر اس نے قریب رکھے پرس میں سے سو کا نوٹ نکال کر اسے دیا "تم ایسا کرو کہ اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ سات بجے آجانا۔ پھر ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور میں تمہیں اچھے لوگوں کے آداب اور طور طریقے سکھاؤں گی۔"
سعید خان الجھن میں پڑ گیا۔ وہ جو کچھ سکھانا چاہتی تھی وہ نہیں سیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بہت ضدی لڑکا تھا۔ آن والا اور اس میم نے اس کی آن کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ مگر یہاں معاملہ سو روپے کا تھا۔ سو روپے بہت بڑی چیز تھے۔ وہ لاہور میں [illegible] کرتا تو سو روپے مہینوں میں بھی ہاتھ آتے نہیں لگتے تھے۔ اس کا ذہن تیزی سے حساب کتاب لگانے میں مصروف تھا۔ سو روپے میں تو زمین بھی مل سکتی تھی۔ اور سو روپے ایسے بھی مل سکتے ہیں۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نوٹ نے اسے خواب دکھانے شروع کر دیے۔ ایسے بہت سے نوٹ جمع ہو جائیں تو وہ بہت زمین خرید سکتا ہے۔ بہت بڑا خان بن سکتا ہے۔ اس کے باپ کو اور بھائیوں کو دوسروں کی زمینوں پر کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ان کے پاس بے حساب زمین ہوگی اور عزت ہی عزت۔ لوگ جھک جھک کر سلام کریں گے انہیں۔ جرگے میں ان کی بات کی ایک اہمیت ہوگی۔
"کیا سوچ رہے ہو لڑکے؟"
اسٹیلا نے اسے چونکا دیا "کچھ نہیں میم صاب۔ ٹھیک ہے۔ میں آجاؤں گا جی۔"
لڑکے چلے گئے۔ اسٹیلا لانچے میں آ بیٹھی۔ شام بہت خوش گوار تھی۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈ تھی۔ لیکن وہ ناخوشگوار نہیں تھی۔ برف پگھل چکی تھی اور بہار کی آمد کی علامتیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ بیٹھی اپنے بارے میں سوچتی رہی۔ کیسی تبدیلی آئی تھی اس میں۔ وہ اس کالج میں بہت اچھا وقت گزار رہی تھی جس سے اسے نفرت تھی۔ یہ تبدیلی صرف اس لڑکے کی وجہ سے آئی تھی۔ اس کی سوچوں کا رخ سعید خان کی طرف مڑ گیا۔ وہ خود کو ٹٹولنے لگی۔ وہ دیانت داری سے کہہ سکتی تھی کہ اس لڑکے سے کوئی ایسی ویسی غرض نہیں۔ بس وہ تنہائی کی ماری ہوئی تھی۔ محبت کے لمس سے کب سے محروم تھی۔ وہ قربت تھا۔ ہلکا پھلکا رومانس تھا۔ شاید وہ خود کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ ابھی زندہ ہے اور بس۔
بیٹھے بیٹھے دیر ہو گئی۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ خنکی بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ آتش دان دہکانے میں چند منٹ لگے۔ اب وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے یہ سوچ کر اپنے لئے پہلا جام بنایا کہ جام ختم ہوتے ہوتے وہ آجائے گا۔
سات بجے کے بعد اس پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔ وہ کیوں نہیں آیا اب تک؟ کیا وہ نہیں آ رہا ہے؟ آخر یہ لڑکا [illegible]

جھنجلاہٹ بڑھتی گئی۔ آٹھ بجے تک اسے گنتی بھی یاد نہیں رہی تھی کہ وہ کتنے جام پی چکی ہے۔ اور وہ نہیں آیا تھا۔

○☆○

سعید خان عجیب کشمکش میں تھا۔ وہ سات بجے میم صاب کی طرف جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اسے یہ احساس بھی تھا کہ یہ بہت بڑی بات بن سکتی ہے۔ وہ سوچتا رہا اور الجھتا رہا مگر اس کشمکش میں نہ جانے کے خیال کا پلہ بھاری تھا۔ پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ نہیں جائے گا۔

مگر سات بجے تو اس کا دل اندیشوں کے ہیولے تراشنے لگا۔ اس نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر دیکھا۔ اس نوٹ کو اس کے پاس ہونے کا کوئی حق نہیں۔ میم صاب نہ دیتی تو شاید عمر بھر ایسا کوئی نوٹ اس کے پاس نہ آتا۔ بلکہ شاید اتنے روپے بھی عمر بھر اکٹھے نہ ہوتے۔ اگر اسے نہیں جانا تھا تو پھر اسے یہ نوٹ بھی نہیں لینا چاہئے تھا۔ اسے زبان بھی نہیں دینی چاہئے تھی۔ اب زبان دے دی ہے تو پوری بھی کرنی چاہئے۔

"حاکم اور محکوم کے درمیان زبان دینے کا ایسا رشتہ نہیں ہوتا۔" اس کے اندر کے سرکش لڑکے نے دلیل دی۔

"یہ حاکم اور محکوم کی بات ہی نہیں ہے۔" ضمیر نے کہا۔ "حاکم کی حیثیت سے تو وہ تم سے بیگار بھی لے سکتی تھی یا حاکم محکوم کو معاوضہ تو نہیں ادا کرتے۔"

پھر بھی اس نے کٹ حجتی کی کوشش کی۔ لیکن ضمیر کی اس دلیل کا اس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔

پھر لاہور میں گزرے ہوئے وقت کے حوالے سے اس کا تصور حرکت میں آگیا۔ وہاں اس نے بہت میموں کو دیکھا تھا۔ لوگ باتیں بھی کرتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ میموں کی مرضی کے خلاف کچھ کرو یا انہیں سرکشی دکھاؤ تو وہ نہایت آسانی سے چوری کا الزام لگا دیتی ہیں بلکہ الزام کی نوعیت اور سنگین بھی ہو سکتی ہے پھر آدمی بھاگتا رہتا ہے لیکن کہاں تک۔ آخر پکڑا جاتا ہے۔

چوری کا الزام! تو کیا مسز رچرڈسن اس پر چوری کا الزام لگا سکتی ہے؟

"کیوں نہیں؟" ذہن نے جواب دیا۔ "اور یہ سو روپے کا نوٹ اس پر آسانی سے جرم ثابت کرا دے گا۔ یہ نوٹ وہ کہیں چھپا بھی نہیں سکتا۔ کسی کو دے بھی نہیں سکتا۔ نوٹ کہیں چھپا بھی دے تو مار پیٹ کے بعد اس کے بارے میں ضرور زبان کھولے گا۔ اور وہ یہ کہے گا کہ یہ نوٹ اسے خود میم صاب نے دیا تھا تو کون مانے گا۔ اس لئے کہ میم صاب نے تو خود اس کے خلاف رپورٹ کی ہوگی۔"

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بری طرح پھنس چکا ہے۔ اسے جانا ہی ہوگا۔ یہ فیصلہ کر کے وہ پرسکون ہوگیا۔

پونے آٹھ بجے وہ گھر سے نکل آیا۔

آٹھ بج کر دس منٹ پر وہ کالج پہنچا۔ اس وقت تک اچھی خاصی رات ہو چکی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ مسز رچرڈسن دروازہ بند کر کے سو چکی ہوگی لیکن اس نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ وہ اندر چلا گیا۔

میم صاب سٹنگ روم میں قالین پر آتش دان کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جام تھا۔ سامنے رکھی بوتل تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ وہ شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے تھی جس کے نیچے کچھ بھی نہیں تھا۔ سعید خان کا دل اتھل پتھل ہونے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ میم بلاشبہ بہت حسین ہے۔

اسٹیلا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی "تم۔ تم کون ہو؟" وہ اس کے چہرے کے قریب انگلی نچا رہی تھی۔

"نہیں میم صاب۔ میں سعید خان ہوں۔"

"وہ تو میم صاب کہنے سے ہی پتا چل گیا" وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی "بچہ نہیں ہو تو بچوں جیسی حرکتیں مت کیا کرو۔"

"میں سمجھا نہیں مسز رچرڈسن" سعید خان کو میم صاب والی بات طعنے کی طرح لگی تھی۔

"یہ کون سا طریقہ ہے کہ جب چاہا منہ اٹھایا اور چلے آئے۔"

"وہ مسز رچرڈسن دیر ہوگئی......"

"کیوں اتنی دیر کی تم نے؟" اسٹیلا کا لہجہ بے حد سخت تھا۔

سعید خان تمام راستے عذر ہی تو تراشتا رہا تھا "وہ جی میم صاب، وزیر خان سے پیچھا ہی نہیں چھوٹ رہا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی۔ ایک بار گھر بھی چلا گیا مگر تھوڑی دیر بعد باہر نکلا تو وہ گھر کے باہر ہی کھڑا ملا۔ آپ کا حکم ہوتا تو میں اسے بھی لے آتا لیکن آپ نے منع کیا تھا۔ بس اسی چکر میں دیر ہوگئی۔"

اسٹیلا نے جام خالی کیا اور پھر بوتل جام میں خالی کردی۔

"تمہیں احساس نہیں تھا کہ میں اکیلی ہوں اور تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

"سوری مسز رچرڈسن۔ میں ابھی کھانا تیار کرتا ہوں۔"

"اب بھوک کسے ہے۔ رہنے دو" اسٹیلا نے بے زاری سے کہا۔

"اچھا۔ صرف مچھلی تل لیتا ہوں۔ بس پندرہ منٹ لگیں گے۔"

"نہیں تم میرے پاس بیٹھو" اسٹیلا نے کہا اور اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ سعید خان کے لئے وہ بڑی آزمائش تھی۔ اسے پہلے کبھی نسوانی قربت ملی بھی نہیں تھی۔ وہ اس کے لئے پہلا موقع تھا۔ اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ یہ بھی سچ تھا کہ اسٹیلا بہت خوب صورت لگ رہی تھی اور اس کی نیم برہنگی بہت بڑی آزمائش تھی۔ لیکن مردانگی کا توڑ بھی مردانگی ہی ہوتی ہے۔ سعید خان یہ نہیں بھول سکتا تھا کہ میم اس کی مردانگی کو للکارتی رہی ہے۔ اس نے اس کا مذاق بھی اڑایا ہے۔ وہ اسے اچھے لوگوں کے طور طریقے اور آداب سکھانا چاہتی ہے۔ اچھے لوگ اور طور

طریقے اور آداب! ہونہہ۔ اس احساس نے اس کے اندر مزاحمت پیدا کردی۔ پھر اس کے بعد ترغیب ترغیب نہیں رہی اور آزمائش آسان ہوگئی۔

اسٹیلا تھوڑی دیر لیٹی رہی۔ مگر وہ نشے میں دھت تھی۔ ذرا دیر بعد اس کے خراٹے سنائی دیے۔ وہ بہت بدصورت آواز تھی۔ سعید خان پھر بھی تھوڑی دیر یونہی بیٹھا رہا۔ اس کے بعد وہ آہستگی سے اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ مچھلیاں تلنے کے بعد وہ آیا۔ تب بھی اسٹیلا ویسے ہی بے سدھ سو رہی تھی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔

وہ گھر جانے کے لئے نکل ہی رہا تھا کہ اسے خیال آیا کہ اسٹیلا ممکن ہے رات بھر یونہی پڑی رہے۔ آتش دان تو یقینی طور پر دو گھنٹے میں سرد ہو جائے گا۔ رات کو ابھی خاصی سردی ہو جاتی ہے۔ کہیں طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ یہ سوچ کر اس نے اسٹیلا کو اٹھا لیا۔ وہ اس کی توقع سے بڑھ کر بھاری تھی۔ مگر بوجھ اٹھانا اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ پھر بھی اسے اٹھا کر اوپری منزل کے بیڈ روم تک لے جانے میں اسے پسینہ آگیا۔ اس نے اسٹیلا کو بیڈ پر لٹا کر اسے کمبل اڑھایا اور بڑی نفاست سے تینوں طرف کمبل کے کونے اندر اڑس دیے۔

پھر وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔

○☆○

وزیر خان بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کالج، میم صاب اور سعید خان اس کے ذہن پر سوار تھے۔ ایک دن میں ہی اس نے بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ وہ ذہین بھی تھا۔ اس کا مشاہدہ بھی بہت اچھا تھا اور اس کی فطرت میں تجسس بھی بہت تھا۔ وہ جوان تھا اور اپنی جوانی میں بھی سعید خان سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی جوانی منہ زور گھوڑی کی طرح تھی اور اس نے بھی اسے بے لگام چھوڑا ہوا تھا۔ اس میں بے حد تندی تھی۔ وہ کہیں سے گزرتا اور اسے کوئی پھول نظر آجاتا تو وہ اسے توڑے بغیر نہ رہتا لیکن نسوانی قربت اسے اب تک میسر نہیں آئی تھی۔ لاہور میں ایسا ہو جاتا لیکن سعید خان آڑے آگیا تھا۔ وہاں ان کے ساتھ کام کرنے والے کاریگر اکثر بازار چلے جاتے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو بھی دعوت دی تھی۔ لیکن سعید خان نے پوری بات سننے سے پہلے ہی سختی سے انکار کردیا تھا۔ اب وزیر خان کیا کرتا۔ اس کا اور سعید خان کا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ پھر ایک نازک رشتہ بھی تھا۔ سعید خان کی بہن ریشم اس کی منگ تھی۔ یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اکیلا بازار چلا جاتا۔ ہاں' سعید خان نے ہامی بھری ہوتی تو اور بات تھی۔ مستقبل کے سالا بہنوئی ایک ساتھ عیاشی کر سکتے تھے مگر شرط یہی تھی کہ سعید خان پہل کرے۔ وزیر خان کڑھنے، جھنجلانے اور سعید خان پر غصہ کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

سعید خان نے سائیکل خریدی تھی تو اسے حیرت ہوئی تھی لیکن اس نے سوچا تھا کہ شاید وہ لاہور کے کمائے ہوئے پیسے اڑا رہا ہے پھر تین چار دن سے وہ غائب بھی رہنے لگا تھا۔ یہ راز خود سعید خان نے اس پر کھول دیا۔ بلکہ اسے شریک بھی کرلیا۔ وہ بہت اچھا دوست تھا۔

وزیر خان ایک جھلک دیکھ کر ہی میم صاب پر مرمٹا تھا۔ یہ اس نے پہلی میم نہیں دیکھی تھی۔ مگر اس سے پہلے اس نے جتنی میمیں دیکھی تھیں' وہ بہت خرانٹ لگتی تھیں اور اسی وجہ سے حسین ہونے کے باوجود حسین نہیں لگتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ فاتح ہیں اور مفتوح کبھی نہیں ہو سکتیں۔ وہ قربت سے نوازیں گی بھی تو حاکم ضرور ہوں گی۔ لاہور میں مالی' خانساماں اور ڈرائیور لوگوں نے اسے ان میموں کی قربت کی بہت کہانیاں سنائی تھیں جن کے گھروں میں وہ کام کرتے تھے۔ وزیر خان کو اچھا نہیں لگا تھا۔ اب ایسا بھی کیا کہ مرد مرد نہ رہے' عورت بن جائے اور عورت مرد۔

لیکن اسٹیلا رچرڈسن مختلف تھی۔ لہجے میں تلخی ہونے کے باوجود اس کے نقوش میں نرمی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی اور سوگواری تھی۔ اس کا وجود دعوت دیتا محسوس ہوتا تھا کہ آؤ اور مجھے فتح کرلو۔ میں فتح کرنا نہیں۔ فتح ہونا چاہتی ہوں۔ وہ ہر طرح سے عورت لگتی تھی۔ عورت جو کمزور اور نازک ہوتی ہے۔

تو اس چیز نے ابتدا میں ہی وزیر خان کو بھڑکا دیا تھا۔ اس نے ارادہ کرلیا تھا کہ اس انگریز میم کو ضرور فتح کرے گا۔ کیسے؟ یہ وہ ابھی نہیں جانتا تھا۔

اسے احساس تھا کہ میم کو اس کا آنا اچھا نہیں لگا ہے۔ جیسے اس نے آکر کسی اہم کام میں مداخلت کی ہو۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ میم سعید خان پر ملتفت ہے لیکن سعید خان اس سے گھبراتا ہے۔ اسے لگا کہ شاید سعید خان اسے اسی لئے لے کر آیا ہے۔

پھر سعید خان نے کہا تھا کہ کام سات آٹھ بجے تک کرنا ہوگا لیکن پہلے ہی دن پانچ بجے چھٹی ہوگئی تھی۔ وزیر خان نے کہا بھی تھا کہ تھوڑا سا کام رہتا ہے۔ اسے مکمل کرلیں مگر سعید خان نے کہا تھا' چھوڑو کل کرلیں گے۔

پھر واپس آتے ہوئے ایک اور اہم بات ہوئی تھی۔ سعید خان سائیکل چلا رہا تھا اور وہ پیچھے بیٹھا تھا۔ ایک چڑھائی پر سائیکل کا توازن بگڑنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ اتر کر سائیکل کو سنبھالتا اور دھکا لگاتا' سائیکل گر گئی۔ سعید خان بھی گرا اور ساتھ ہی اس کی جیب سے سو روپے کا وہ نوٹ بھی۔ سعید خان کو احساس ہوا تو اس نے جلدی سے نوٹ جیب میں رکھ لیا۔

"یہ کیا ہے؟" وزیر خان نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" سعید خان نے گڑبڑا کر کہا۔ ذرا دیر خاموشی رہی جیسے سعید خان کوئی جھوٹ گھڑنے کی کوشش کر رہا ہو "میم صاب نے کچھ سامان لانے کو کہا ہے۔"

وزیر خان بے وقوف نہیں تھا۔ جس تیزی سے سعید خان نے

نوٹ اس کی نظر سے بچا کر وہ اپنا بٹوہ جیب میں رکھنے کی کوشش کی تھی اس سے بہت کچھ سمجھ میں آ جاتا تھا۔ مگر اس کے جواب نے تو سب کچھ واضح کر دیا تھا۔

تو سو کے نوٹ یوں بھی مل سکتے ہیں۔ شاید وزیر خان نے سوچا۔ میم نے اسے یہ نوٹ دیا تو کھل اٹھا۔ سعید خان بتا چکا تھا کہ مزدوری اسی وقت ملے گی جب صاب تنخواہ دیں گے۔ اس نے جو اندازے لگائے تھے ان کی تصدیق کرنی تھی۔ اس کے لیے وہ اندھیرا ہونے کے بعد کالونی کے باہر چھپ کر بیٹھ گیا۔

رات گہری ہونے لگی تو اسے مایوسی ہوئی۔ شاید اس کا اندازہ غلط تھا۔ مگر اسی وقت اسے سعید خان سائیکل پر آتا دکھائی دیا۔ سعید خان ذرا آگے نکل گیا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ سائیکل کے کیریئر پر کوئی سامان موجود نہیں ہے۔ اب بس اسے ایک بات کی تصدیق کرنا تھی۔

پھر اس نے دیکھ لیا کہ سعید خان کا رخ ان سے جانے والی سڑک کی طرف نہیں بلکہ وہ صاب کے کاٹیج کی طرف جا رہا ہے۔ اس نے وہیں تعاقب موقوف کر دیا۔ پہلے اس کے جی میں آئی تھی کہ وہ بھی کاٹیج پہنچے۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ بے کار کی مشقت کا کیا فائدہ۔ سب کچھ معلوم ہو گیا ہے تو کھوج کا فائدہ۔ مگر اس کے لیے سونا دوبھر ہو گیا۔ یہ تو بہت اچھا راستہ نظر آیا تھا۔ سو کے نوٹ...... وہ کچھ کا کچھ بن سکتا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ میم محبت کی بھوکی ہے اور محبت کو ایسی چیز سمجھتی ہے جسے خریدا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے تو وہ دوہرے منافع والا سودا تھا۔ میم ویسے ہی اسے پسند آئی تھی۔

صبح ہوتے اسے تھوڑی دیر کے لیے نیند آئی مگر پھر وہ خود ہی اٹھ گیا۔ اس روز اس نے خاص طور پر تیاری کی۔ اپنے سب سے اچھے کپڑے پہنے یعنی بن ٹھن کر گھر سے نکلا۔ تھوڑی دیر بعد سعید خان بھی آ گیا۔ دونوں سائیکل پر بیٹھ کر چل دیے۔

○☆○

اسٹیلا کی جو اس کی آنکھ دس بجے کھلی۔ منہ کا ذائقہ کسیلا ہو رہا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ اپنے بستر میں کمبل میں لپٹی ہوئی ہے۔ رات کی آخری بات جو اسے یاد تھی وہ یہ تھی کہ وہ سٹنگ روم میں آتش دان کے سامنے سعید خان کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں تھا۔

تو پھر وہ بیڈ روم میں کیسے آ گئی؟ کیا وہ سوتے میں چلنے لگی ہے؟ اس کا خمار ٹوٹ رہا تھا اور ذہن صاف نہیں تھا۔ پھر بھی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ سعید خان اسے اٹھا کر بیڈ روم تک لایا تھا۔ اس نے ہی اسے لٹایا تھا اور کمبل اوڑھایا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اسے صبح روشن لگنے لگی لیکن اسے اچنبھا ہو رہا تھا۔ وہ اتنی ہلکی تو نہیں۔ اسے لا کر اوپر لٹانا! لڑکا واقعی بہت جان دار ہے۔ اس کے وجود میں عجیب سی خوشی بھر گئی۔

باتھ روم سے باہر آ کر اس نے کپڑے بدلے۔ پھر نیچے آ کر کچن کا رخ کیا۔ اس وقت اسے بلیک کافی کی اشد ضرورت تھی۔ آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ لڑکے آ چکے ہیں اور انہوں نے کام شروع کر دیا ہے۔ اس خیال نے اسے بدمزہ کر دیا کہ سعید خان کے ساتھ دوسرا لڑکا بھی ہو گا۔ کافی پیتے ہوئے وہ رات کے بارے میں سوچتی رہی۔ بات کس حد تک آگے بڑھی تھی؟ وہ ذہن پر زور دیتی رہی لیکن اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ اسے مایوسی ہوئی۔ اگلے ہی لمحے اس مایوسی سے اسے شاک لگا۔ ہلکی پھلکی تفریح میں ناکامی پر ایسی مایوسی تو نہیں ہوتی۔ وہ تو ایک ہلکی پھلکی تفریح تھی۔ بوریت اور اکتاہٹ سے فرار کا ایک ذریعہ تھا، جس کی وجہ سے زندگی زندگی لگنے لگی تھی۔ اس میں سیریس ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ اور سعید خان محض ایک نادان لڑکا ہے۔ نادان، اور بھولا اور شرمیلا۔

سب کچھ اپنی جگہ۔ لیکن مایوسی کا احساس بدستور تھا۔ وہ اپنی بے توقیری کو کوستی رہی۔ آدمی کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب اعتدال سے کام لے گی۔ وہ دوسری پیالی ختم کر رہی تھی کہ سعید خان آ گیا "وہ میم صاب......"

اس نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ چپ ہو گیا "اب تمہاری سزا یہ ہے کہ مجھے اسٹیلا کہو گے۔ یہ میرا نام ہے۔"

"جی میم...... اسٹیلا، نیچے کا کام مکمل ہو گیا ہے" لڑکے نے شرمیلے لہجے میں کہا "اب اوپر کے بیڈ روم رہ گئے ہیں۔ میں صاب کے آنے تک کام مکمل کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"وہ جی سامان باہر نکالنا ہو گا۔"

"ناشتا کیا ہے تم نے؟" لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ "میں ابھی چائے بناتی ہوں تمہارے لیے۔ وہ دم چھلا بھی تمہارے ساتھ ہے؟"

"جی ہاں ہے...... اسٹیلا۔"

اچانک اسٹیلا کو ایک خیال سوجھ گیا "یہ تم نے رات کیا حرکت کی میرے ساتھ" اس نے بے حد درشت لہجے میں کہا۔

"میں نے؟" سعید خان ہکا بکا رہ گیا "میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا میم صاب۔ خدا کی قسم۔"

اسٹیلا کو اس پر ترس آنے لگا "تم مجھے اٹھا کر اوپر لائے جیسے میں کوئی بچی ہوں۔"

"وہ جی...... آتش دان سرد ہو جاتا۔ آپ کو ٹھنڈ لگ جاتی تو...... بس جی میں نے آپ کو اوپر لے جا کر لٹا دیا تھا۔ میں نے کچھ......"

"اچھا تم جا کر دوسرے بیڈ روم سے سامان نکالو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ پھر اپنا بیڈ روم خالی کرا دوں گی۔ جاؤ اور ہاں، میرے بیڈ روم میں رنگ صرف تم کرو گے۔"

"بہت بہتر...... اسٹیلا۔"

اسٹیلا چائے لے کر اوپر گئی تو وہ اسپیئر بیڈ روم کو خالی کر چکے تھے۔ اس روز اسٹیلا نے دوسرے لڑکے کو پہلی بار غور سے دیکھا۔ وہ بھی بہت پیارا تھا۔ بلکہ اس کے نقوش سعید خان سے زیادہ اچھے تھے۔ البتہ آنکھیں سعید خان کی زیادہ خوب صورت تھیں۔ دوسرے لڑکے کی آنکھیں براؤن تھیں۔ شہد جیسی۔ وہ چھوٹی اور چمکیلی آنکھیں تھیں۔ اسٹیلا کا اندازہ تھا کہ وہ چالاک بہت ہو گا۔

"تمہارا نام کیا ہے لڑکے؟"

"جی وزیر خان" لڑکے نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

"اچھا تم دونوں چائے پی لو۔ اتنی دیر میں میں اپنا کمرا سمیٹتی ہوں۔ پھر سامان نکال دینا۔"

اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اسٹیلا کو اپنے وجود میں نظروں کی چبھن کا احساس رہا۔ پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سعید خان نے اسے کبھی اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ یہ وہ دوسرا لڑکا وزیر خان تھا اور وہ کسی لڑکے کی نہیں، ایک مرد کی نظریں تھیں۔ اسٹیلا کو بہت اچھا لگا۔ مدت سے کسی نے اسے اتنی توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔

○☆○

اس روز انہوں نے دیر تک کام کیا۔ دونوں کمرے مکمل ہو گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے فرش دھویا اور سامان دوبارہ کمروں میں رکھا۔ اسٹیلا نے اپنے کمرے کی سیٹنگ تبدیل کر دی۔ اس کام سے نمٹتے نمٹتے ساڑھے سات بج گئے "اب کھانا کھا کر ہی جانا" اسٹیلا نے کہا۔ اس نے محسوس کیا کہ وزیر خان کھل اٹھا ہے جبکہ سعید خان ہچکچا رہا تھا۔

"میں مچھلی تل لیتا ہوں۔ رات مسالا لگا کر رکھ دی تھی" سعید خان نے کہا۔

"ہاں، ٹھیک ہے" اسٹیلا بولی۔ رات کی مچھلی اسے کچن میں رکھی ملی تھی۔ دوپہر تک اس میں سے بساندھ آنے لگی تھی۔ اس نے پھینک دی تھی۔

"آج میں سرکا بھی لایا ہوں سے......" سعید خان کہتے کہتے رک گیا۔ اسٹیلا کے گھورنے پر اسے یاد آ گیا "اسٹیلا میم صاب۔"

اس پر وزیر خان نے اپنے دوست کو اور پھر اسٹیلا کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ پھر اس نے پوچھا "میں آپ کو کیا کہا کروں؟"

اسٹیلا کو ہنسی آ گئی۔ لڑکے کے لہجے میں رشک، رقابت اور جانے کیا کیا تھا "تم ابھی نئے نئے ہو۔ تم میم صاحب ہی کہا کرو۔ تمہارے منہ سے اچھا بھی لگتا ہے۔"

"جی بہتر میم صاب" وزیر خان نے مایوسی سے کہا۔ اسٹیلا پھر ہنسنے لگی "ویسے میم صاب، وفاداری اور تابعداری میں اس سے کم نہیں ہوں میں۔ آزما لیجیے گا۔"

"وفاداری تو ٹھیک ہے لیکن یہ سعید خان تابع دار نہیں ہے؟" اسٹیلا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"تب تو میں اس سے اچھا ہوا میم صاب" وزیر خان نے جوش سے کہا "آپ مجھ سے کچھ کہہ کر دیکھیں۔ میں کبھی انکار نہیں کروں گا۔"

سعید خان نے اسٹیلا کو شکایتی نظروں سے دیکھا "میں تو آپ کی ہر بات مانتا ہوں اسٹیلا۔"

اسٹیلا وزیر خان کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ سعید خان اس کا نام لیتا تھا تو وزیر خان کی رنگت متغیر ہو جاتی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ لڑکوں کے درمیان اس کے سلسلے میں مسابقت اور رقابت پیدا ہو رہی ہے۔ دونوں اسے خوش کرنے کے سلسلے میں ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسٹیلا کو لطف آ رہا تھا "میں بھی آپ کو مچھلی تل کر دکھاؤں میم صاب۔ ایمان سے بہت اچھی مچھلی تلتا ہوں میں" وزیر خان نے اسٹیلا سے پوچھا۔

اسٹیلا کے جواب دینے سے پہلے سعید خان بول اٹھا "جب تمہیں ہو تو سارا کام خود کرنا۔ یہ مسالا میں نے لگا کر رکھا ہے۔ میں ہی تلوں گا۔"

اس روز اسٹیلا کو کھانے میں بہت لطف آیا۔ وہ ان کی نوک جھونک پر مسکراتی رہی۔ کھانے کے بعد وہ رخصت ہونے لگے تو سعید خان نے کہا "کل جمعہ ہے اسٹیلا میم صاب۔ کل صاب بھی آئیں گے نا؟"

"ہاں۔ آندھی آئے یا طوفان۔ جمعے کے دن دنیا کی کوئی طاقت جی کو یہاں آنے سے نہیں روک سکتی" اسٹیلا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کل ہم جلدی آئیں گے۔ صرف باہر کا کام رہ گیا ہے۔ وہ پورا کر دیں گے۔ پھر کل باغیچے میں کیاریاں بھی بنائیں گے۔"

"آپ دیکھیے گا، میں پھولوں کے بہت پیارے پودے لگاؤں گا" وزیر خان نے کہا۔

"آپ برا نہ مانئے گا اسٹیلا میم صاب۔ یہ وزیر خان بہت شیخی خورا ہے۔"

اس رات اسٹیلا بستر پر لیٹی تو بہت خوش تھی۔ برسوں کے بعد اسے ایسی کچی خوشی ملی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی عمر دس پندرہ سال کم ہو گئی ہے۔ وہ جیسے ایک دوشیزہ حسینہ تھی جس کے لیے دو جوان ڈوئل لڑنے کو تیار تھے۔ ایک حسین عورت کی سب سے بڑی خوشی یہی تو ہوتی ہے۔ اس رات سونے سے پہلے اس نے صرف ایک جام پیا تھا۔ یہ بھی بہت بڑی کامیابی تھی۔

ادھر گھر جاتے ہوئے وزیر خان کو احساس ہو رہا تھا کہ سعید خان اس سے خفا ہے۔ وہ بات بھی نہیں کر رہا تھا "سعید خان، خفا ہے یار؟"

"ہاں وزیر خان۔ میرا دل بڑا خفا ہے تم سے۔"

"پر بات کیا ہے یار؟"

"بات تم جانتے ہو وزیر خان" سعید خان نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہاں جانتا ہوں" وزیر خان نے گہری سانس لے کر کہا "لیکن یار، یہ تو تمہارا بچپنا ہے۔"

سمجھتا ہے" سعید خان پھر گیا "تم کتنی گھٹیا باتیں کر رہے تھے۔"

"او یارا' تم بڑے نادان ہو۔ او میں تو اسے خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا سعید خاناں۔ تم نے دیکھا نہیں' وہ ہمارے لئے کتنا خوش ہو رہی تھی۔ یار او دیکھو' یہ تو لاہور کی مزدوری سے بھی اچھا کام ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ صاب اور میم صاب ہماری قسمت بنا دیں گے۔ یہ سولی اسامی ہے یارا۔"

سعید خان کو میم صاب کی خوشی یاد آئی تو وہ دل میں وزیر خان کی تائید کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی دوسری بات بھی ٹھیک تھی "وہ تو ٹھیک ہے وزیر خان۔ لیکن کبھی میم کو خوش کرنے میں اتنا آگے نہ بڑھ جانا کہ خون خرابے کی نوبت آ جائے۔"

"تم تو پاگل ہو یارا۔"

"میں پاگل نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں' تم بہت اتھلے آدمی ہو۔"

"اچھا۔ اب بات ختم کرو یارا۔ میں اتھلا ہوں۔ مجھے دیکھو' میں نے تم سے سونے کے نوٹ کے بارے میں پوچھا بھی نہیں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں۔"

سعید خان سناٹے میں آ گیا۔ وزیر خان نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

○☆○

جمعے کے دن دوپہر تک دونوں لڑکوں نے رنگ و روغن کا کام نمٹا لیا۔ پھر وہ کیاریاں بنانے میں لگ گئے۔ وہ جس سلیقے سے کام کر رہے تھے اسے دیکھ کر اسٹیلا بہت متاثر ہوئی۔ انہوں نے دو طرف دو دو کھپچیاں مٹی میں گاڑ کر ادھر سے ادھر تک ستلی باندھ کر ستلیوں کے درمیان کی زمین نرم کی۔ بیج ڈالے پھر کھاد ڈالی اور پانی دیا۔ کیاریوں میں کسی بھی جگہ ایک سینٹی میٹر تک کا فرق نہیں تھا۔ وزیر خان موسمی پھولوں کے چھوٹے پودے بھی لایا تھا۔ وہ ابھی نہیں لگائے گئے تھے۔

اسٹیلا کھڑی انہیں کام کرتے دیکھ رہی تھی۔ کبھی وہ پلٹ کر کاٹیج کو دیکھتی۔ یہ حقیقت تھی کہ کاٹیج کی شکل نکل آئی تھی۔ اب کاٹیج کو دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی۔ یہ سب لڑکوں کی محنت کا نتیجہ تھا۔ اسٹیلا کو یقین ہو گیا کہ یہ دونوں باغیچے کی شکل بھی بدل دیں گے۔

اچانک سعید خان نے سر اٹھا کر اسٹیلا کو دیکھا "ٹائم کیا ہوا ہے اسٹیلا میم صاب؟"

"ڈیڑھ بجنے والا ہے۔"

"آپ ہم نماز کے لئے جائیں گے اسٹیلا میم صاب۔ میں واپسی میں گوبر کی کھاد بھی لاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے سعید خان۔"

سعید خان نے ہاتھ جھاڑے اور سیدھا کھڑا ہو گیا "چلو یارا' ہاتھ دھو لو۔ پھر چلیں" اس نے وزیر خان سے کہا۔

"میں نہیں جا سکوں گا آج" وزیر خان نے معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا "میرے کپڑے پاک نہیں ہیں۔"

"تو گھر جا کر بدل لو۔"

"نہانے اور کپڑے بدلنے میں جماعت نکل جائے گی۔ افسوس' دیر سے وقت کا خیال آیا۔ میرا جمعہ نکل گیا۔"

سعید خان کے چہرے پر ناگواری ابھری لیکن وہ بغیر کچھ کہے چلا گیا۔ وزیر خان سر جھکا کر دوبارہ کام میں لگ گیا۔ ذرا دیر بعد اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو اسٹیلا جا چکی تھی۔ اس کے دل کو ٹھیس لگی۔ اس نے تو اس کی خاطر نماز چھوڑ دی تھی اور وہ......

اب اس کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تو وہ بادل ناخواستہ کام کرتا رہا۔ پھر اس نے کھرپی وہیں ڈالی اور کاٹیج کی طرف چل دیا۔ اسٹیلا سٹنگ روم میں تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھی کوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔ اس کا اسکرٹ اوپر سرک گیا تھا۔ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وزیر خان ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

اسٹیلا کو گھورے جانے کا احساس ہوا تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس نے اس قدر اچانک سر اٹھایا تھا کہ وزیر خان کو نظریں ہٹانے کی مہلت نہیں ملی۔ وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔

"کیا بات ہے؟" اسٹیلا نے درشت لہجے میں کہا "تمہیں نہیں معلوم کہ دروازے پر دستک دے کر اندر آتے ہیں۔"

"میم صاب' میں اندر تو نہیں آیا۔ دروازے میں کھڑا ہوں۔" اس نے بے حد معصومیت سے جواب دیا۔

اسٹیلا کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ ویسے اسے یہ حرکت بہت بری لگی تھی "یہ تم مجھے گھور کیوں رہے ہو؟" اس بار اس کا لہجہ نسبتاً نرم تھا۔

"میم صاب جی' آپ پر نظر پڑ جائے تو ہٹائی ہی نہیں جاتی۔"

اسٹیلا مسکرا دی "کیوں؟"

"میں نے آپ جیسا کوئی خوب صورت آج تک نہیں دیکھا۔"

"تم نے زیادہ عورتوں کو دیکھا ہی نہیں ہو گا۔ اسی لئے ایسا لگتا ہے تمہیں" اسٹیلا نے نخرے سے کہا۔

"یہ بات نہیں میم صاب جی" وزیر خان نے گہرا سانس لے کر کہا "ہمارے علاقے میں بھی خوب صورتی کم نہیں ہے جی۔ پھر میں نے لاہور میں چار سال گزارے ہیں۔ میں نے بڑی میموں کو دیکھا ہے جی۔ پر آپ جیسا کوئی نہیں دیکھا۔"

"میری کیا چیز اچھی لگی ہے تمہیں؟"

"آپ پوری..... سر سے پاؤں تک" وزیر خان نے دونوں ہاتھوں سے سر سے پاؤں تک کا احاطہ کرتے ہوئے کہا لیکن وہ مقام ایسے تھے جہاں اس نے دانستہ اپنے ہاتھوں کو ایک ثانیے کے لئے ساکت کر دیا تھا "..... خوب صورت ہیں" اس نے جملہ مکمل کیا۔

اسٹیلا کو اپنے سارے جسم کا خون چہرے کی طرف لپکتا محسوس ہوا۔ یہ بات خود اس کے لئے بھی حیرت انگیز تھی۔ وہ ایسے معاشرے کی پروردہ تھی جہاں حسن کی تعریف بہت بے باکی سے کی جاتی ہے۔ لیکن اس تعریف میں حجاب میں لپٹی ہوئی ایسی بے حجابی تھی جس نے اسے عورت ہونے کا بہت شدت سے احساس دلایا تھا۔ وہ بے ساختہ جسم چرانے لگی تھی۔ اس نے اپنے اسکرٹ کو آہستگی سے برابر کیا اور خشک لہجے میں بولی "تم نے بتایا نہیں' تم کیوں آئے ہو۔"

"بھوک لگ رہی ہے میم صاب جی۔"

"اچھا...... میں کچھ کرتی ہوں تمہارے لئے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا میم صاب جی۔ آپ مجھے اجازت دیں۔ میں خود ایک چیز بناؤں گا۔ آپ بھی کھائیں گی؟"

"کیا بناؤ گے تم؟"

"کھا کر دیکھیے گا۔ آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔"

"اچھا' ٹھیک ہے۔"

وہ کچن میں چلا گیا۔ اسٹیلا بیٹھی اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ جتنا سعید خان بھولا تھا' اتنا ہی وزیر خان چالاک تھا۔ چالاک ہی نہیں' اس کی خود اعتمادی بھی غیر معمولی تھی۔ اس ملک میں ایسے کتنے مقامی لوگ ہوں گے' جو اس کی طرح کسی انگریز عورت کے حسن کی تعریف اتنی بے باکی سے کر سکیں۔ اسٹیلا کو تو اب تک ایسا کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ اسٹیلا کو اس کی نظریں' اس کی تعریف تو اچھی لگی تھی لیکن سعید خان کے مقابلے میں وہ اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی' یہ نظریں سعید خان کی ہوتیں' یہ تعریف سعید خان نے کی ہوتی تو کتنا اچھا لگتا۔

ادھر کچن میں وزیر خان نے چھ انڈے توڑے اور زردی کو اچھی طرح پھینٹا۔ پھر اس میں شہد ملایا۔ اس کے بعد اس نے فرائنگ پین میں مکھن ڈالا۔ ڈبل روٹی کے سلائس زردی اور شہد میں بھگو کر اس نے انہیں مکھن میں تل لیا۔ اسے اندازہ تھا کہ میم صاب کافی زیادہ پسند کرتی ہیں۔ اس نے کافی بنائی۔ کھانے کی چیزیں اس نے بڑے سلیقے سے میز پر رکھ دیں۔ پھر وہ میم صاب کو بلانے چلا گیا "میں تو نہیں کھاؤں گی۔ تم کھا لو۔" اسٹیلا نے کہا۔

"آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔"

وہ بچوں کی طرح ایکسائٹ ہو رہا تھا۔ اسٹیلا کو مزید انکار کی ہمت نہیں ہوئی "اچھا ٹھیک ہے۔"

ٹیبل پر بیٹھنے کے بعد اسٹیلا نے بڑی بدمزگی سے دیکھا۔ مگر دل رکھنے کی خاطر ایک ٹوسٹ اٹھا لیا۔ ٹوسٹ کا ایک ٹکڑا دانتوں سے کاٹتے ہی اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ وزیر خان داد طلب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا "واہ بھئی' تم نے تو کمال کر دیا" اس نے پوری سچائی سے کہا اور وزیر خان خوش ہو گیا۔ یہ بڑی بات تھی کہ خواہش نہ ہونے کے باوجود وہ تین ٹوسٹ کھا گئی۔ کافی بھی بہت عمدہ تھی۔

کھانے کے بعد وزیر خان دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔ اس بار وہ تندہی سے کام کر رہا تھا۔ پچھلی رات کی گفتگو میم صاب کے معاملے میں اسے پہلی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سعید خان کو پہلے آنے کے اعتبار سے اس پر فوقیت حاصل ہے۔ لیکن اور بہت سے معاملات میں وہ اس سے آگے تھا۔ کام مشکل اور وقت طلب تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ بالآخر وہ میم صاب کا دل جیت لے گا۔

ایک گھنٹے بعد سعید خان بھی آ گیا۔ وہ گوبر کی کھاد کی پوری بوری رکھ کر لایا تھا۔ سورج ڈھلتے ڈھلتے انہوں نے باغیچے کا کام بھی مکمل کر لیا۔ پھر انہوں نے ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدل لئے۔ اب انہیں صاب کی آمد کا انتظار تھا۔ جیپ کی آواز سنائی دی تو انہوں نے بچوں کی طرح اس طرف دوڑ لگا دی۔

بیری رچرڈسن کاٹیج سے کافی دور تھا کہ وہ اس تک پہنچ گئے۔ بیری نے بریک لگایا "کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟" اس نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے صاب۔ آپ چل کر کام دیکھیں ہمارا۔ گاڑی نہ روکیں۔ ہم ساتھ ساتھ بھاگیں گے۔"

"نہیں۔ تم جیپ میں بیٹھ جاؤ۔"

انہیں بٹھا کر بیری رچرڈسن کاٹیج تک پہنچا۔ کاٹیج کو دیکھ کر اس کا دل خوش ہو گیا۔ باغیچے کو وہ اس وقت نہیں سراہ سکتا تھا کیونکہ اندھیرا ہو گیا تھا۔ اندر جا کر اس نے ہر کمرے کا' کچن کا اور باتھ روم کا جائزہ لیا "تم نے کمال کر دیا" اس نے سعید خان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا "مگر یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟"

سعید خان نے وزیر خان کے متعلق بتایا "اس نے میرا ہاتھ بٹایا ہے صاب جی ورنہ یہ اتنی جلدی ہونے والا کام نہیں تھا۔"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں" بیری نے کہا "لیکن سعید خان ایک بری خبر ہے۔ میں تمہیں ابھی مزدوری نہیں دے سکوں گا۔ پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔"

"صاب جی۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔ آپ مجھے اچھے لگے ہیں۔ اس لئے طبیعت سے کام کیا ہے آپ کا۔ پیسوں کی بات تو نہیں ہے۔"

"پھر بھی ضرورت تو ہوتی ہے۔"

"ہم غریب لوگ ہیں صاب جی۔ ہمارا گزارہ تو پیسے کے بغیر بھی ہو جاتا ہے۔ وہ تو لاہور سے کچھ کما لائے تھے ورنہ ہمیں مہینوں پیسے کی شکل نظر نہیں آتی۔"

"مجھے اپنے بارے میں بتاؤ سعید خان" بیری رچرڈسن نے کہا۔

وہ تینوں اس وقت سٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔ اسٹیلا نے ان کے سامنے کافی کی پیالیاں رکھ دی تھیں۔ سعید خان نے اپنے بارے میں تفصیل بتائی۔ بیری توجہ سے سنتا اور سر ہلاتا رہا "میرا یہ مشورہ ہمیشہ یاد رکھنا۔ جب بھی موقع ملے' کچھ بھی نہ کرنا' بس زمین خریدنا" اس نے کہا "یاد رکھو' زمین بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں زمین خریدنے کا موقع ضرور ملے گا۔"

وہ دونوں چلے گئے۔ اسٹیلا ہیری کے سامنے آ بیٹھی "کام بہت اچھا کیا ہے لڑکوں نے" ہیری نے کہا۔ پھر پوچھا "کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں دیکھی ان میں؟"

"نہیں۔ بلکہ اکثر تو یہ میرے سو کر اٹھنے سے پہلے آ کر کام شروع کر دیتے تھے۔ چور بے ایمان نہیں ہیں" اسٹیلا نے بتایا۔

"میں اس سعید خان کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میں کاٹیج کے کاموں کے لیے اسے رکھنا چاہتا ہوں۔ ہمیں ضرورت ہے ایک ایسے آدمی کی۔ اگر تم مطمئن ہو تو بات کروں اس سے۔"

"مطمئن تو میں ہوں" اسٹیلا نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا "لیکن اس نے اپنے ساتھ اس دوسرے لڑکے کو لگایا ہے۔ ہمیں دو لڑکوں کی تو ضرورت نہیں۔"

"میں اس سے بات کروں گا۔ اگر ایک تنخواہ میں دونوں مل جائیں تو کوئی برائی بھی نہیں ہے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"ایک اور کام بھی آ گیا ہے ان کے لیے" ہیری نے کہا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "کل اسی علاقے کے ایک خان نے مجھے دو گھوڑے دیے ہیں۔ ایسے خوب صورت گھوڑے ہیں کہ دیکھو گی تو دیکھتی رہ جاؤ گی۔ میں سوچ رہا ہوں، گھوڑوں کو بھی یہیں رکھا جائے۔ ویک اینڈ کے لیے ایک اور تفریح ہو جائے گی۔"

"مگر مجھے تو رائیڈنگ آتی نہیں ہے۔"

"تو آ جائے گی۔ تم اس کی فکر مت کرو۔"

"اور یہاں کوئی اصطبل ٹائپ کی جگہ بھی نہیں ہے۔"

ہیری ہنسنے لگا "اصطبل یہ لڑکے بنائیں گے۔ کل آئیں گے تو ان سے بات کروں گا۔ ابھی تو میں نے انہیں مزدوری بھی نہیں دی ہے" اس نے اسٹیلا کو پیسوں کے بارے میں سعید خان سے اپنی گفتگو سنائی "دیکھو تو غریب لوگ ہیں۔ پیسہ پاس نہیں پھر بھی پیسے کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ محبت والے لوگ ہیں۔"

اس رات ہیری رچرڈسن بہت خوش تھا۔ طویل عرصے کے بعد وہ اسٹیلا کو سویرا اور خوش دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اسٹیک تیار کی تھی۔ اسٹیلا نے بھی اس کا ہاتھ بٹایا تھا۔ کھانے کے بعد وہ باغیچے میں چہل قدمی کرتے رہے۔ پھر وہ بیڈ روم میں چلے آئے "حیرت انگیز لڑکا ہے یہ سعید خان" ہیری نے کہا "باغیچے کو بھی بدل کر رکھ دیا اس نے۔"

"ہاں... تمہارے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ تمہیں ورشپ کرتا ہے۔"

"ورشپ اور مجھے؟" ہیری نے حیرت سے کہا "مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہیں ورشپ کرتا ہے۔"

"نہیں... تمہارے لیے وہ ایک غلام کی طرح ہو جاتا ہے" اسٹیلا نے زور دے کر کہا "میرے معاملے میں تو وہ بے حد شرمیلا ہے۔ سچ پوچھو تو اسے دیکھ کر مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔"

"خیر... کچھ بھی ہو۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمہیں یہ جگہ اچھی لگنے لگی ہے۔ اتنے عرصے میں پہلا موقع ہے کہ میں تمہیں خوش دیکھ رہا ہوں ورنہ تم یہاں کبھی خوش ہو کر نہیں آئی تھیں اور یہاں خوش بھی نہیں رہتی تھیں۔ میرے لیے تو یہ سب سے بڑی بات ہے۔"

"یہ اعتراف تو میں ضرور کروں گی کہ اس مقام کے متعلق میرا پچھلا رویہ سراسر زیادتی تھا" اسٹیلا نے مسکراتے ہوئے کہا "سچ یہ ہے کہ میں اس مقام سے چڑتی تھی۔ نفرت تھی مجھے اس سے۔ لیکن اب مجھے یہ حیرت انگیز طور پر بہت اچھا لگتا ہے۔ ایک بات بتاؤں۔ اس علاقے میں کوئی پراسرار سی کشش ہے۔ بہت عرصے بعد وہ سمجھ میں آئی ہے۔ اور اس کے بعد جکڑ لیتی ہے آدمی کو۔ عجیب طلسماتی مقام ہے یہ۔ اب تو یہاں سے جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

"میرے لیے تو یہ شکر کا مقام ہے۔"

اس رات کی قربت میں اسٹیلا کی گرم جوشی اور والہانہ پن بھی ہیری رچرڈسن کے لیے حیرت انگیز تھا۔ اسے شادی کے بعد کا ابتدائی عرصہ یاد آنے لگا۔ لیکن وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ اسٹیلا کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔

ادھر اسٹیلا بھی اپنی کیفیت پر حیران تھی۔ وہ ہیری رچرڈسن کے ساتھ تھی۔ لیکن درحقیقت وہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیتا جاگتا سعید خان اس کے سامنے ہے۔ وہ ایسی مستی اور سرشاری کی کیفیت میں تھی، جو دنیا کی کسی شراب میں نہیں تھی۔ کچھ بھی ہو، وہ دونوں ہی بہت خوش تھے!

○☆○

اگلے روز دونوں لڑکے ذرا دیر سے آئے۔ دونوں کے درمیان کھنچاؤ تھا۔ درحقیقت کھنچاؤ صرف سعید خان کی طرف سے تھا۔ وزیر خان کا نماز چھوڑنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن وزیر خان نے جو سبب بیان کیا تھا، اس کے بعد وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میم صاب کو جن نظروں سے دیکھتا تھا، وہ بھی سعید خان کو اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اس میں اسے دو طرح کے خطرے نظر آتے تھے۔ ایک تو یہ کہ کہیں میم صاب ناراض نہ ہو جائے اور صاب سے شکایت نہ کر دے۔ اس صورت میں نقصان سعید خان کو بھی پہنچتا۔ وزیر خان کو وہی تو لے کر آیا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وزیر خان اس کی بہن کا منگیتر تھا۔ سعید خان نہیں چاہتا تھا کہ اس رشتے میں کوئی خرابی پیدا ہو۔ وہ پچھتا رہا تھا کہ وزیر خان کو کیوں لے کر آیا۔ ویسے اس نے تو اپنی طرف سے بہن کے لیے بہتری ہی چاہی تھی۔ وزیر خان کچھ کماتا تو بہن ہی کے لیے اچھا ہوتا۔ مگر یہاں تو خرابی پیدا ہو رہی تھی اور اس کا ذمے دار بھی وہی تھا۔

وہ کاٹیج پہنچے تو گورا صاب باغیچے میں ٹہل رہا تھا "تم لوگوں نے کمال کر دیا" اس نے انہیں دیکھتے ہی کہا "میں بہت خوش ہوں تم سے۔"

"شکریہ صاب" سعید خان سے پہلے وزیر خان نے جواب

دیا۔

"دیکھو وزیر خان، تم اندر جاؤ۔ میم صاب سے کافی بنانے کو کہو۔ اور ہاں، سٹنگ روم سے کچھ کرسیاں باہر نکال لاؤ۔ دھوپ بہت اچھی لگ رہی ہے۔"

"ابھی لایا صاب" وزیر خان نے کہا اور کاٹیج کی طرف دوڑ لگا دی۔

"بہت پھرتیلا لڑکا ہے" ہیری نے ستائشی لہجے میں کہا۔ پھر سعید خان کی طرف مڑا "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے سعید خان۔ اور تمہارے اس دوست کے سامنے بات کرنا مناسب نہیں تھا۔"

"حکم کریں صاب" سعید خان نے کہا۔ اسے خدشہ تھا کہ صاب وزیر خان کی شکایت کرے گا۔

"پہلے ایک بات بتاؤ۔ تمہاری کوئی مصروفیت تو نہیں۔"

"نہیں صاب جی۔ ہم تو بالکل فارغ ہیں۔ بلکہ سوچ رہے ہیں کہ روزگار کے لیے شاید پھر لاہور جانا پڑے گا۔"

"اور اگر میں تمہیں یہیں نوکری دے دوں تو؟"

"یہ تو نعمت ہو گی نا صاب۔ ہم پہاڑی لوگوں کو شہر کا موسم اچھا تو نہیں لگتا۔ مگر مجبوری کی بات ہوتی ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم کاٹیج کی دیکھ بھال کیا کرو۔ ہم تو ہفتے میں دو دن کے لیے آتے ہیں۔ تم کاٹیج کا خیال رکھو۔ باغیچے کی نگہداشت کرو۔ لکڑیاں کاٹ کر جمع کیا کرو تاکہ ہم آئیں تو آتش دان کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اوپر کے چھوٹے موٹے کام تمہیں کرنے ہوں گے۔ مگر وہ اس وقت جب ہم یہاں موجود ہوں۔"

"یہ تو میری خوش قسمتی ہو گی صاب۔"

"مگر یہ تمہارا ساتھی وزیر خان... دیکھو کام ایک آدمی کا ہے۔ میں تمہیں ماہانہ پچاس روپے تنخواہ دوں گا۔"

پچاس روپے ہر ماہ... سعید خان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں اسے مستقل نوکری مل سکتی ہے ورنہ وہ وزیر خان کو یہاں اپنے ساتھ کبھی نہ لاتا۔ اب یہ معاملہ نازک تھا۔ رشتہ بھی نازک تھا۔ اب وہ وزیر خان کو منع تو نہیں کر سکتا تھا اور منع نہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ تنخواہ کے بھی دو حصے ہوں گے۔ خیر... پچیس روپے بھی کم تو نہیں ہوتے اور مل بانٹ کر کھانے میں برکت ہوتی ہے۔

"ٹھیک ہے صاب جی۔ ہم تنخواہ آپس میں تقسیم کر لیں گے۔"

"تم جانو۔ لیکن میرے خیال میں تم بے وقوف ہو۔ تم اسے منع بھی کر سکتے ہو" ہیری نے کہا۔

"وہ میرا دوست اور ساجھے دار ہی نہیں صاب جی، رشتے دار بھی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ میری بہن سے اس کی شادی ہونے والی ہے۔"

"اوہ... یہ بات ہے" ہیری نے سر کو تفہیمی جنبش دی "تب تو ٹھیک ہے۔ چلو میں تم دونوں کو ساٹھ روپے دوں گا۔"

"شکریہ صاب جی۔"

اتنی دیر میں وزیر خان برآمدے میں کرسیاں لگا چکا تھا "آؤ چلیں" ہیری نے اس سے کہا۔

ہیری برآمدے میں کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ دونوں کھڑے رہے۔

"بیٹھو نا" ہیری نے کہا۔ وزیر خان زمین پر بیٹھنے لگا تو اس نے کہا۔ "نہیں۔ کرسی پر بیٹھو" وہ دونوں بھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اسٹیلا کافی لے آئی تھی۔ وہ بھی بیٹھ گئی۔

"ایک بات بتاؤ۔ تم لوگوں نے کبھی گھوڑوں کا کام بھی کیا ہے۔"

"میں تو بس سواری کرنا جانتا ہوں صاب۔ مگر..."

وزیر خان نے سعید خان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میں گھوڑوں کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں صاب جی۔"

"بات یہ ہے کہ مجھے کسی نے دو گھوڑے دیے ہیں تحفے میں" ہیری نے وضاحت کی "میں ان گھوڑوں کو یہاں رکھنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن یہاں تو اصطبل نہیں..."

"اسی لیے تو تم سے بات کر رہا ہوں" ہیری نے وزیر خان کی بات کاٹ دی "تم دونوں یہاں اصطبل بنا سکتے ہو۔ ضرورت کی ہر چیز میں فراہم کر دوں گا۔"

"کیوں نہیں صاب جی۔ یہ کام بھی ہو جائے گا۔"

"اس کام کی اجرت میں الگ دوں گا" ہیری نے سعید خان سے کہا "باقی بات تم اپنے ساتھی سے کر لو۔"

"ٹھیک ہے صاب جی۔"

"اور میم صاب کو گھڑ سواری تم سکھاؤ گے" ہیری وزیر خان سے مخاطب ہوا۔

"ٹھیک ہے صاب۔"

"اب تم لوگ مجھے بتا دو کہ کیا کیا چاہیے تاکہ فوراً کام شروع کر سکو۔"

○☆○

ہیری رچرڈسن بیوی میں مثبت تبدیلی سے بہت خوش تھا۔ اس کے خیال میں یہ کاٹیج کا اور اس علاقے کی فضا کا کمال تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسٹیلا کے مزاج میں پھر چڑچڑا پن پیدا ہو۔ کیونکہ اس کا اس پر اور اس کے کام پر اچھا اثر نہیں پڑتا تھا۔ اسی لیے اسے اصطبل والا آئیڈیا سوجھا تھا۔ اسی بہانے اسٹیلا یہاں رکتی۔ پھر اس کے بعد گھڑ سواری سیکھنے کے شوق میں رکتی۔ اور ہیری رچرڈسن جانتا تھا کہ یہاں کی سادہ زندگی اور اس کی تفریحات آدمی کو ایک بار گھیر لیں تو پھر ہمیشہ کے لیے اسیر کر لیتی ہیں۔ خود اس کا یہی حال تھا۔ اتوار کی شام رخصت ہوتے وقت اس نے سعید خان کو سو روپے اور وزیر خان کو پچاس روپے دیے "یہ تمہارے پچھلے کام کی اجرت ہے" اس نے کہا "اصطبل کے لیے کسی اضافی چیز کی ضرورت ہو تو میم صاب سے پیسے لے لینا۔ کام فرسٹ کلاس ہونا چاہیے" پھر وہ سعید خان کی طرف مڑا "اور ہاں... میم صاب کا خیال رکھنا۔"

دونوں لڑکے خوش ہو گئے تھے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ سپنے دیکھ رہے تھے۔ سعید خان کے پاس اس وقت دو سو روپے جمع ہو گئے تھے۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ وہ زمین خرید سکتا تھا۔ صاب نے سچ کہا تھا کہ اسے زمین خریدنے کا موقع ضرور ملے گا۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ امید تو یہی تھی کہ اصطبل کے کام کے بعد بھی کم از کم سو روپے ضرور ملیں گے۔ پھر وہ زمین خریدے گا۔ اس کے بعد تیس روپے ماہوار الگ۔ وہ بھی جمع ہی ہوں گے۔ اور پھر مزید زمین!

دوسری طرف وزیر خان نے بھی بیری رچرڈسن کا مشورہ گرہ میں باندھ لیا تھا۔ وہ بھی زمین کے خواب دیکھ رہا تھا۔ یعنی زمین ان دونوں کا خواب مشترک تھا۔ لیکن وزیر خان کی آنکھوں میں ایک اور خواب بھی تھا۔ اور وہ ریشم کا تھیں' میم صاب کا تھا۔ وہ اس تصور سے سرشار تھا کہ وہ میم صاب کو گھڑ سواری سکھائے گا۔ اس تصور نے اس کے خواب کو اور رنگین کر دیا تھا۔

اگلے روز سے انہوں نے اصطبل پر کام شروع کر دیا۔ وہ بہت محنت کر رہے تھے۔ شام کو دیر تک..... بلکہ بعض اوقات رات تک کام کرتے۔ دونوں کا مقصد یہی تھا کہ جلد از جلد کام مکمل ہو جائے اور انہیں پیسے مل جائیں تاکہ زمین خریدی جاسکے۔ دونوں نے اسٹیلا کو نظر انداز ہی کر دیا تھا۔ اسٹیلا کو ڈپریشن ہونے لگا تھا۔ لیکن وہ شراب سے دور رہی تھی۔ اکثر وہ چائے' کافی یا سینڈوچ لے کر ان کے پاس چلی جاتی۔ دیر تک بیٹھ کر انہیں کام کرتے دیکھتی رہتی۔

چوتھے دن کچھ سامان لانے کی ضرورت پڑی۔ سعید خان کاٹیج میں چلا آیا۔ اسٹیلا سٹنگ روم میں بیٹھی تھی "کیا بات ہے ڈارلنگ' تم یہاں کیسے؟" اسٹیلا نے پوچھا "تم نے تو یہاں آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں اکیلی بور ہوتی رہتی ہوں۔"

"کام کی مصروفیت ہی اتنی ہے اسٹیلا میم صاب۔ وقت ہی نہیں ملتا" سعید خان نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

"اتنی جلدی کیا ہے کام کی۔ آرام سے کرو۔"

"وہی کام ختم ہوگا تو پیسے ملیں گے۔"

"پیسے؟ میں نے تو کہا تھا' تمہیں پیسوں کی پروا ہی نہیں۔" اسٹیلا نے حیرت سے کہا۔

"پیسوں کی تو واقعی پروا نہیں ہے۔ پر اسٹیلا میم صاب' زمین کی تو فکر ہے۔"

"اچھا" اسٹیلا کی کچھ سمجھ میں آیا' کچھ نہیں آیا "خیر..... بیٹھو نا یہاں۔"

سعید خان بدستور کھڑا رہا "وہ اسٹیلا میم صاب جی' کچھ سامان جا کر لانا ہے بازار سے۔ پیسے چاہئیں۔"

"کون جائے گا بازار؟"

"میں جاؤں گا جی۔"

اسٹیلا نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے چار بجے تھے "ایسا کرو..... ایک گھنٹے بعد وزیر خان کو ساتھ لے کر آنا۔ میں پیسے دے دوں گی۔"

"مگر اسٹیلا میم صاب' بازار بند نہ ہو جائے۔"

"جیسا میں کہتی ہوں' ویسا ہی کرو" اسٹیلا نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ چلا گیا۔

ساڑھے پانچ بجے وہ دونوں آئے تو اسٹیلا آتش دان دہکانے کی تیاری کر رہی تھی "آ گئے تم دونوں۔ میں ابھی پیسے دیتی ہوں" اسٹیلا نے کہا۔ اور میز پر رکھے ہوئے پرس کی طرف بڑھی۔ پرس سے سو کا نوٹ نکال کر اس نے وزیر خان کی طرف بڑھایا "یہ لو۔ لیکن پہلے ایک کام کرو۔ ذرا کچھ لکڑیاں کاٹ کر لا دو آتش دان کے لیے....."

"لیکن اسٹیلا میم صاب' بازار تو مجھے جانا ہے" سعید خان نے احتجاج کیا۔ وزیر خان کی نظروں میں تائید تھی۔ اسے میم صاب کے ساتھ اکیلے رہنے کا موقع مل رہا تھا۔

"ایک تو تم لوگ میرا حکم بھی نہیں مانتے" اسٹیلا نے درشتی سے کہا۔

"میں تو مانتا ہوں میم صاب" وزیر خان نے کہا "میں لکڑیاں لاتا ہوں جی" یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

"اب تم جا کر اپنا کام کرو" اسٹیلا نے سعید خان سے خشک لہجے میں کہا۔ وہ بھی چلا گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد وزیر خان لکڑیاں لے کر آیا "یہ لیجیے میم صاب۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم بازار چلے جاؤ۔"

"لیکن میم صاب' میرے پہنچتے پہنچتے دکانیں بند ہو چکی ہوں گی۔ سامان کل لے آؤں گا۔"

"نہیں آج ہی کوشش کرو۔ دکانیں بند ہوں تو گھر چلے جانا۔ کل سامان لیتے ہوئے آنا۔"

وزیر خان اس بات میں خوش نہیں تھا۔ لیکن پہلے ہی دن وعدہ کر چکا تھا کہ اس کا ہر حکم مانے گا۔ اور یہ میم صاب کا حکم تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ بھی گھاٹے کا سودا تو نہیں۔ اس سامان کی خریداری میں وہ کچھ رقم بچا بھی سکتا ہے۔ وہ سلام کر کے نکل آیا۔ جانے سے پہلے اس نے سعید خان کو خدا حافظ بھی کہا۔

پندرہ منٹ بعد اسٹیلا نے سعید خان کو آواز دی۔ وہ آیا تو وہ بیٹھی میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی "سنو ڈارلنگ' میں باتھ روم جا رہی ہوں۔ تم ذرا آتش دان دہکا دو۔ اور ہاں..... جانا نہیں مجھے دیر لگے تو یہاں آتش دان کے سامنے بیٹھ کر اس میگزین سے دل بہلانا۔"

"لیکن میم صاب' مجھے پڑھنا کہاں آتا ہے۔"

"یہ پڑھنے والا نہیں' دیکھنے والا رسالہ ہے" اسٹیلا یہ کہہ کر باتھ روم کی طرف چل دی۔

سعید خان نے آتش دان میں سلیقے سے لکڑیاں جمائیں' کچھ کاغذ رکھے اور ایک جلتا ہوا کاغذ ان پر ڈال دیا۔ کچھ دیر وہ کھڑا رہا

دیکھنے کے لیے کہ دوبارہ آگ جلانے کی ضرورت تو نہیں ہے۔ پھر وہ مطمئن ہو کر پلٹ آیا۔ اس نے وہ رسالہ اٹھایا' جو اسٹیلا اس کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کے بعد اس نے بہت اطمینان سے رسالہ کھولا۔ لیکن پہلی تصویر پر نظر پڑتے ہی وہ ہکا بکا ہو گیا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ وہ رسالے کو بند کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن لرزتے ہاتھوں کو حرکت دینا جیسے اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ تصویر سے نظریں ہٹا لینا چاہتا تھا لیکن آنکھیں سرکشی پر اتر آئی تھیں۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ تھی۔ برائی کا احساس اس کے اندر موجود تھا۔ لیکن وہ بھی اس کی طرح بے بس تھا۔

بڑی مشکل سے..... بہت کوشش کر کے اس نے نظریں ہٹا لیں۔ اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ وہ رسالہ نہیں ہے' جو میم صاب اس کے لیے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے غلطی سے دوسرا رسالہ اٹھا لیا ہے۔ مگر کمرے میں کوئی اور رسالہ تھا ہی نہیں۔

اسے معلوم تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ رسالہ دیکھنے کی خواہش اس کے اندر بے حد شدید تھی۔ وہ اس خواہش کے خلاف مزاحمت کر رہا تھا۔ لیکن وہ خواہش طوفان کی طرح اس کے اندر اٹھی تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ یہ جنگ ہار جائے گا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کا دماغ شل ہو رہا تھا۔ آنکھیں مچل رہی تھیں۔ نظریں بے قابو ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر وہ طوفان اس کے ہوش و حواس کو تنکے کی طرح بہا لے گیا۔ اس کی نظریں رسالے کی تصویر پر جم گئیں۔ اب طوفان جیسے دماغ تک پہنچ گیا تھا۔ کسی سحر زدہ معمول کی طرح اس نے ورق الٹ دیا۔ سامنے ایک اور تصویر تھی..... پچھلی تصویر سے زیادہ تباہ کن!

یہ پہلا موقع تھا کہ کبھی ایک نامعلوم وحشت میں گرفتار ہو کر جو کچھ وہ تصور میں دیکھنے کی کوشش کرتا تھا' بغیر کسی ابہام کے دیکھ رہا تھا۔ اس کی وحشتوں کی کوئی حد نہیں تھی۔

وہ ورق الٹتا رہا۔ بعض تصویروں کو اس نے کئی کئی بار دیکھا۔ ایک جادو تھا' جس نے اسے اسیر کر لیا تھا۔

وہ اس قدر منہمک تھا کہ اسے قدموں کی چاپ بھی نہیں سنائی دی۔ اسے نظروں کی چبھن کا احساس بھی نہیں ہوا۔

اسٹیلا کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ وہ اس وقت تصویر سے زیادہ تباہ کن تھی۔ اس کے جسم پر ایک باریک گاؤن کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ سعید خان اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس چکا ہے۔ وہ ایک نازک سحر میں گرفتار ہے۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ اس کا اسے پکارنا مناسب نہیں۔ ایک سحر سے دوسرے سحر تک نظر پہنچنے میں جو ایک ثانیہ آئے گا' وہ اسے اس طلسم سے آزاد بھی کر سکتا ہے۔ وہ کچا کام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ دبے پاؤں بڑھی اور بڑی آہستگی سے قالین پر اس کے سامنے جا بیٹھی۔

اس کی موجودگی کے احساس سے سعید خان کی محویت ٹوٹی۔ اس نے نظریں اٹھائیں تو اسے روبرو پایا۔ پہلا طلسم کاغذی تھا۔ مگر یہ جیتا جاگتا' سانس لیتا طلسم تھا۔ اسٹیلا کے جسم سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر سعید خان کی نظروں نے نیچے کا سفر شروع کر دیا۔

اس بار سعید خان کو معلوم ہوا کہ طوفان کیا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے وہ جسے طوفان سمجھ رہا تھا' وہ تو طوفان کا آغاز تھا۔ طوفان تو اب سر اٹھا رہا تھا۔ وحشت سی وحشت تھی۔ ایسی وحشت تو اس پر کبھی طاری نہیں ہوئی تھی۔

اس کا ردعمل تو اسٹیلا کے لیے خلاف توقع نہیں تھا۔ لیکن اس کی شدت اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر تھی۔ وہ اس پر یوں جھپٹا تھا' جیسے کوئی باز چڑیا کو دبوچتا ہے۔ وہ خود کوئی موم کی گڑیا نہیں تھی۔ لیکن لمحوں میں وہ اس پر پوری طرح چھا گیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ جانتی تھی کہ مزاحمت وحشت کو اور سوا کر دے گی۔ وہ حد سے بڑھنے لگا تو اسٹیلا نے تحکمانہ لہجے میں اسے پکارا "سعید خان!" اس نے دانستہ اسے ڈارلنگ کہنے سے گریز کیا تھا۔ پہلی پکار بے اثر ہوئی۔ دوسری..... تیسری پکار پر اس کے ہاتھ ٹھٹکے۔ چوتھی پکار پر اس نے چونک کر اسٹیلا کو دیکھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں شناسائی نہیں' اجنبیت تھی۔

"سعید خان..... ہوش میں آؤ" اسٹیلا کا لہجہ بے حد سخت تھا۔

"اسٹیلا؟" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا ڈارلنگ کہ ہر کام کے آداب' طور طریقے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر محبت کے۔ اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں تمہیں آداب سکھاؤں گی۔"

سعید خان کے ہاتھ اب بھی گستاخی پر آمادہ تھے۔

"سعید خان..... اب اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں کاٹیج سے بھی نکال دوں گی اور نوکری سے بھی۔ وزیر خان تم سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ وہ تابع دار ہے۔ میرے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہے۔"

اس بار سعید خان پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ بلکہ اسے ایسا لگا' جیسے کسی نے یخ بستہ پانی کی بالٹی اس کے سر پر انڈیل دی ہے۔ اسے جھٹکا سا لگا۔ اس کا دماغ سنسنانے لگا۔ کاٹیج سے نکالے جانے پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن نوکری سے نکالا جانا اسے قبول نہیں تھا۔

"ڈارلنگ..... اتنی جلدی کیا ہے۔ وقت کی تو کمی نہیں ہمارے پاس" اسٹیلا نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

لیکن اب اس لہجے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ طلسم پوری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ سعید خان اس وقت غصے اور نفرت سے پھنک رہا تھا۔ لیکن اتنی ذہنی انتشار کے باوجود' غصے اور نفرت کے باوجود اسے اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ اس کے مفادات کو کوئی ٹھیس نہ پہنچے۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ اسٹیلا نے اس کی مردانگی کی' اس کے وجود کی توہین کی تھی۔ اس نے لفظوں کے بغیر اسے جنگلی اور اجڈ کہا

تھا۔
"کیا سوچ رہے ہو ڈارلنگ؟" اسٹیلا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔
مصلحت نے سعید خان کو اس کا ہاتھ جھٹکنے سے روک دیا۔
"کچھ نہیں اسٹیلا میم....."
"صرف اسٹیلا کہو مجھے" اسٹیلا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
"اسٹیلا میں تمہاری باتوں پر غور کر رہا ہوں۔"
"سنو ڈارلنگ، میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔ محبت بہت نازک اور لطیف چیز ہے۔ اس میں پیار بھری باتوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔۔۔"
اسٹیلا کہتی رہی۔ لیکن سعید خان کچھ نہیں سن رہا تھا۔ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ وہ ایک یقینی گناہ سے بچ گیا۔ اس اعتبار سے میم نے اس پر احسان کیا ہے ورنہ وہ تو ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اسے اچھے برے کی تمیز نہیں رہی تھی۔ ایک بار وہ گر جاتا تو پھر ہمیشہ ذلت کے اس کنوئیں میں گرا رہتا۔ پھر اس نے سوچا، احسان اپنی جگہ مگر اس ذلت اور توہین کا بدلہ ضرور لینا ہے اور وہ بھی ایسے کہ اس کے مفادات پر ضرب بھی نہ پڑے۔
"سمجھ رہے ہو نا میری بات؟" اسٹیلا نے اسے چونکا دیا۔
اس نے اسٹیلا کو دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے کہا "جی ہاں۔ سمجھ رہا ہوں" اسے حیرت ہوئی کہ اب وہ اسے اتنی بری لگ رہی ہے کہ دیکھنا بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ خوب صورت تو وہ اب بھی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر کراہت آ رہی تھی۔
"تو پھر عمل بھی کرنا۔"
"ایک بات کہوں اسٹیلا میم..... آج آپ کے چہرے پر وہ چمک نہیں، جو اس دن تھی۔ وہ گلابی رنگت بھی نہیں ہے۔"
"میرا خیال تھا کہ میں بہت اچھی لگ رہی ہوں" اسٹیلا نے مایوسی سے کہا۔
"اچھی تو آپ ہمیشہ لگتی ہیں۔ مگر آج جو کمی ہے وہ مجھے معلوم بھی ہے۔"
"تو مجھے بتاؤ۔"
"جب آپ پیتی ہیں نا تو آپ کا چہرہ تمتما جاتا ہے۔ آپ بہت اچھی لگتی ہیں اس وقت۔"
سعید خان کی بات نے اسٹیلا کو بھڑکا دیا۔ واقعی..... شراب بھی ہو تو دو آتشہ ہو جائے۔ وہ اٹھی اور جا کر بوتل اور جام لے آئی۔ سعید خان نے تشویش سے دیکھا کہ وہ دو جام لائی ہے اور بنا بھی رہی ہے۔ اسٹیلا نے جام اس کی طرف بڑھایا تو اس نے احتجاج کیا "یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟"
"تم بھی پیو گے نا میرے ساتھ۔ اکیلے پینے میں لطف نہیں آتا۔"
"لیکن آپ جانتی ہیں کہ میں نہیں پی سکتا۔ ہمارے لیے تو یہ حرام ہے۔"
"حرام تو ہمارے لیے بھی ہے۔ تم فضول باتیں مت کرو۔ منع تو ہمارا اس طرح ساتھ بیٹھنا بھی ہے۔"
سعید خان کو جھٹکا لگا۔ کہہ تو وہ ٹھیک رہی تھی۔ لیکن وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس کا اس دوسرے گناہ کا بھی کوئی ارادہ نہیں "بس اسٹیلا... میں پی ہی نہیں سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے پی تو میری طبیعت خراب ہو جائے گی۔ پھر سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔"
اسٹیلا اسے تولنے والی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ وہ اس شام کو برباد نہیں کرنا چاہتی تھی "ٹھیک ہے۔ میں اصرار نہیں کروں گی۔"
سعید خان اس کی تعریف کرتا رہا اور اسے اور پینے پر اکساتا رہا "پتا نہیں کیا بات ہے۔ وہ چمک ہی نہیں آئی آپ کے چہرے پر" وہ یہ کہتا اور ایک اور جام اسے تھما دیتا۔ پانچویں جام کے بعد اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ آنکھوں میں دھندلاہٹ اتر آئی۔
"اسٹیلا میم صاب، مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔"
"وہ بیری بے وقوف کہتا تھا، تمہیں پیسے کی پروا نہیں" اسٹیلا نے اس کی آنکھوں کے آگے انگلی نچاتے ہوئے کہا "مگر تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں پیسے دوں گی۔"
یوں سعید خان کو سو روپے کا بونس بھی مل گیا۔ تھوڑی دیر میں اسٹیلا بالکل آؤٹ ہو گئی۔ اس بار سعید خان اس پر اوپر لے جا کر لٹانے کی مہربانی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ تاہم اس نے اتنا ضرور کیا کہ آتش دان میں مزید لکڑیاں ڈال دیں اور ایک کمبل لا کر اس کے جسم پر ڈال دیا۔ پھر وہ کاٹیج سے نکل آیا۔

○☆○

اسٹیلا کی آنکھ صبح چار بجے کے قریب کھلی۔ اس نے اپنے ادھر اُدھر ٹٹولا۔ اسے توقع تھی کہ سعید خان وہاں موجود ملے گا۔ لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر اسے اپنے جسم پر پڑے کمبل کا احساس ہوا۔ کمبل تو وہ ساتھ نہیں لائی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
وہ سٹنگ روم میں ہی تھی۔ آتش دان سرد ہو چکا تھا۔ اسے تھرتھری چڑھنے لگی۔ اس نے خود کو اچھی طرح کمبل میں لپیٹ لیا۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد اسے اپنی کیفیت سمجھنے کا موقع ملا۔ اس کی زبان اینٹھی ہوئی تھی اور یوں موٹی ہو رہی تھی کہ جیسے منہ میں سما ہی نہیں سکے گی۔ حلق میں کانٹے ابھر رہے تھے۔ منہ میں کڑواہٹ تھی۔ ذہن کا یہ حال تھا کہ اس کے لیے کچھ سوچنا بھی مشکل تھا۔ اس کیفیت کا توڑ بھی ایک جام ہی تھا۔ مگر وہ اب پینا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اٹھ کر ایک جام لیا اور پھر کچن میں چلی گئی۔ اس نے خوب گاڑھی سیاہ کافی بنائی۔ تھرموس میں کافی بھر کے وہ بیڈ روم کی طرف چل دی۔ جام پینے کے بعد دماغ پر چھائی ہوئی دھند چھٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسے کام نہیں چلے گا۔ اوپر پہنچ کر وہ بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ اس نے ایک اور کمبل اپنے اوپر ڈال لیا۔ اس کے بعد وہ پے در پے کافی کی چار

پیالیاں حلق سے اتار گئی۔ اب وہ کچھ سوچ سمجھ سکتی تھی۔ کافی سے اس کے حلق سے لے کر وجود تک میں کڑواہٹ اتر گئی۔ لیکن نہیں، کڑواہٹ تو پہلے سے موجود تھی۔ بہرحال اب وہ کم از کم سوچ تو سکتی تھی۔ اور وہ گزشتہ شام کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ سب کچھ اسے دھندلا دھندلا یاد آ رہا تھا۔ اس نے وزیر خان کو رخصت کیا تھا۔ سعید خان کو بلا کر آتش دان روشن کرنے کو کہا تھا۔ پھر وہ باتھ روم سے آئی تھی تو سعید خان میگزین کو بڑے ذوق و شوق سے دیکھ رہا تھا۔ پھر سعید خان کی وحشت، اس کا روکنا اور.....
اس پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔ یہ شراب ہمیشہ گڑبڑ کر دیتی ہے۔ اس نے سوچا۔ لیکن اسے احساس ہو رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ بھی ہے جسے اس کا ذہن گرفت میں نہیں لے پا رہا ہے۔ وہ اسے سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔
جانے کتنی دیر تک وہ جاگتی رہی۔ بالآخر اسے نیند آ گئی۔ اس کے بعد اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ چڑھ چکی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ جمعے کا دن ہے۔ آج بیری بھی آئے گا۔

○☆○

"کیا بات ہے۔ میرے جانے کے بعد تم نے کچھ کام نہیں کیا۔" وزیر خان نے سعید خان سے پوچھا "کیا چھٹی کر لی تھی؟"
"نہیں، چھٹی تو نہیں کی تھی۔ مگر یہاں کام بھی نہیں کیا تھا۔" سعید خان نے جواب دیا۔
"تو پھر کیا کرتے رہے؟" وزیر خان نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔
"میم صاب کے کہنے پر ادھر اُدھر کے کام کرتا رہا تھا۔"
وزیر خان خوب جانتا تھا کہ ادھر اُدھر کے کام کیا تھے۔ وہ نہ تو دودھ پیتا بچہ تھا، نہ ہی بے وقوف تھا۔ وہ گیا نہیں تھا۔ اس نے سٹنگ روم کی کھڑکی سے وہ پورا تماشا دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے بڑی مشکل سے خود کو اس محفل میں زبردستی کی شرکت سے روکا تھا۔ اسے میم صاب پر بھی غصہ آ رہا تھا اور سعید خان پر بھی۔ سعید خان خوش قسمت تھا۔ جس چیز کے لیے وہ یعنی وزیر خان مرا جا رہا تھا وہ اس سعید خان کو بن مانگے مل رہی تھی۔ اور وہ....
"سامان لے آئے ہو؟" سعید خان نے پوچھا۔
"ہاں۔ لے آیا ہوں۔"
"آج صاب آئے گا۔"
"ہاں۔ لیکن کام ابھی کافی باقی ہے۔"
"ابھی یہ پورا ہوگا بھی نہیں۔ پیر کا دن گزر جائے گا کام ہوتے ہوتے۔ بلکہ منگل ہی سمجھ لو۔"
دونوں کام میں لگے رہے۔ پھر اچانک وزیر خان نے کہا "میم صاب نظر نہیں آئی ابھی تک۔"
"سو رہی ہوگی۔ یہ لوگ دیر تک سوتے ہیں" سعید خان نے بے پروائی سے کہا۔
بارہ بجے کے قریب اسٹیلا ان کے لیے چائے لائی "کیسے ہو تم لوگ؟" اس نے پوچھا۔ اس نے سعید خان کو دیکھنے سے گریز کیا تھا "تم سامان لے آئے وزیر خان؟"
"جی میم صاب۔ آج صبح بازار گیا تھا۔ کل تو بازار بند ہو چکا تھا۔"
"چلو ٹھیک ہے۔"
وزیر خان نے جیب سے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے "یہ پیسے بچے ہیں میم صاب۔"
"یہ تم رکھ لو" اسٹیلا نے بے پروائی سے کہا۔ پھر وہ کاٹیج میں چلی گئی۔
"یہ لوگ دل کے بڑے ہوتے ہیں" اس کے جانے کے بعد وزیر خان نے کہا۔
"بغیر مطلب کے کسی کو کچھ نہیں دیتے" سعید خان نے تلخ لہجے میں کہا "ہشیار رہنا۔"
"میں بہت ہشیار ہوں۔ تم اپنی فکر کرو" وزیر خان نے بھی ترکی بہ ترکی کہا۔
ادھر اسٹیلا کا ذہن بڑی حد تک صاف ہو چکا تھا۔ وہ سٹنگ روم میں بیٹھی رات کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اس کی سمجھ میں بہت کچھ آ رہا تھا۔ اس نے ہر قدم پر عقل مندی سے کام لیا تھا مگر اب اسے خیال آ رہا تھا کہ ایک مقام پر وہ چوک گئی تھی۔ اسے سعید خان کی وحشت کے آگے بند نہیں باندھنا چاہیے تھا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے اس کا غلام ہو جاتا۔ اس نے اسے ہوش میں لا کر اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی مار لی تھی۔
اب وہ رات کے ہر اس لمحے کو تصور میں دیکھ رہی تھی، جس کا اسے ہوش تھا۔ اسے سعید خان کے چہرے کا اس وقت کا تاثر یاد آیا جب اس کی تہدید اسے ہوش میں لائی تھی۔ بس اس کے بعد وہ بدل گیا تھا۔ لیکن یہ بات وہ اب سمجھ سکی تھی۔ اس وقت تو سعید خان نے اسے یہ سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اس نے انداز ایسا اختیار کیا تھا جیسے اس کا مطیع ہو چکا ہو۔ پھر اس نے اسے پینے کی ترغیب دی تھی اور اس کے بعد اسے پینے پر اکساتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا سعید خان نے وہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اس کا یقینی جواب تو اس کے پاس نہیں تھا۔ لیکن امکان یہی تھا کہ ایسا ہی ہوا ہے۔ اس کی حس بھی یہی بتا رہی تھی۔ اور اگر یہ سچ ہے تو.....
اسٹیلا کو توہین کا شدید احساس ہونے لگا۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اس نے اسے ٹھکرایا تھا۔ بے وقوف بنایا تھا۔ اس کے پندار کو ٹھیس پہنچی تو وہ غصے سے سلگنے لگی۔ اسے اس توہین کا بدلہ لینا ہے۔
ان لمحوں میں نہ وہ انگریز رہی، جو حاکموں میں سے تھے۔ نہ وہ ایک باوقار عورت رہی۔ نہ ہی اسے اپنے مسز بیری رچرڈسن ہونے کا احساس رہا۔ وہ بس ایک عورت تھی، جس کی نسوانی انا کو دانستہ طور پر زخمی کیا گیا تھا۔ بدلہ لینا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ کچھ

بھی کر سکتی تھی۔ وہ اپنے مجرم کو زندگی بھر کے لیے محروم کر سکتی تھی۔ لیکن اسی لمحے اسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ سعید خان کو پسند کرتی ہے۔ اسے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اور اب اس بات کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ اس نے اسے ٹھکرایا تھا۔ اس کی تلافی اسی صورت ہو سکتی تھی کہ سعید خان اس کے سامنے گڑگڑائے، حسن کی بھیک مانگے۔ اس کے التفات کی خیرات کا طلب گار ہو۔ اب اسے اسی ایک منصوبے کے تحت کام کرنا تھا۔

○○○

بیری چند دن آنکھا تھا۔ وہ اس بار بھی لڑکوں کے کام سے راضی اور مطمئن تھا۔ البتہ اسٹیلا اسے چپ چپ اور کبھی کبھی الجھی رہی تھی۔ اگرچہ اسے غلط فہمی نہیں ہو رہی تھی تو یہ اسٹیلا کی بے زاری کی علامت تھی۔ اور کسی بھی وقت دوبارہ بدمزاجی کی لوٹ آسکتی تھی۔

"صاب جی۔۔۔ آپ کو شکار کھیلنے کا شوق نہیں ہے؟" وزیر خان نے اچانک کہا۔

بیری نے چونک کر سر اٹھایا "یہاں شکار ہے؟"

"ہر طرح کا شکار ہے صاب جی۔ لیکن میں تیتر کی بات کر رہا ہوں۔ کالا تیتر بہت ہے اس علاقے میں۔"

بیری نے سوالیہ نظروں سے سعید خان کو دیکھا۔ سعید خان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو کل چلتے ہیں شکار کو۔ گن تو ہے میرے پاس۔"

"ٹھیک ہے صاب جی۔ کل دس بجے ہم آجائیں گے۔"

اگلے روز وہ پوری تیاری کے ساتھ شکار کے لیے روانہ ہو گئے۔ وزیر خان رہبری کر رہا تھا۔ اسٹیلا بھی ساتھ تھی۔ لیکن اس کے انداز سے عدم دلچسپی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ صرف اس لیے ان کے ساتھ آگئی تھی کہ گھر پر اکیلے بور ہونے سے یہ بہتر تھا۔

وہ اس علاقے میں سفر کر رہے تھے جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بیری سحر زدہ سا ہو گیا تھا۔ اسٹیلا بھی اس علاقے کے حسن کو دل ہی دل میں سراہ رہی تھی۔ وہ لوگ کالج اور اس کے گرد و پیش تک محدود رہے تھے۔ انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ یہ علاقہ اس قدر خوب صورت ہے۔

ایک جگہ وزیر خان نے جیپ رکوا دی "اب آگے پیدل کا سفر ہے صاب جی۔ جیپ یہیں چھوڑنی ہوگی۔"

"لیکن پتا نہیں، ہماری واپسی کتنی دیر میں ہو" بیری نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

"آپ جیپ کی فکر نہ کریں صاب۔ ہم لوگوں میں ہزار برائیاں ہوں گی۔ لیکن ہم چور نہیں ہیں" وزیر خان نے فخریہ لہجے میں کہا۔

وہ پیدل چل دیے۔ کوئی ایک میل چلے ہوں گے کہ اچانک انہیں احساس ہوا کہ وہ جنگل میں ہیں۔ وزیر خان اندر ہی اندر انہیں پہاڑی کے کنارے پر لے آیا۔ اب ان کے سامنے پہاڑی ڈھلوان تھی "ایسی جگہوں پر ہوتے ہیں تیتروں کے ٹھکانے" وزیر خان نے کہا "آپ فائر کے لیے تیار رہیں۔"

تین گھنٹے بعد وہ جنگل سے نکلے تو چھ تیتر شکار کر چکے تھے۔ جیپ وہیں موجود تھی جہاں انہوں نے اسے چھوڑا تھا۔

کالج پہنچ کر وزیر خان اور سعید خان تیتروں کی صفائی میں مصروف ہو گئے۔ اس کے بعد پکانے کا مرحلہ تھا۔ وہ وزیر خان نے اپنے ذمے لے لیا۔ سعید خان محسوس کر رہا تھا کہ وزیر خان پورے دن چھایا رہا ہے۔ درحقیقت وہ وزیر خان کا ہی دن تھا۔ لیکن سعید خان یوں ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ وزیر خان کو خود سے آگے نکلتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ خاص طور پر اس لیے کہ وہ یہاں پہلے آیا تھا اور وزیر خان کو متعارف اس نے ہی کرایا تھا۔

"صاب جی۔۔۔ کل آپ مصروف تو نہیں؟" اس نے بیری سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ کیا بات ہے؟"

"کل میں آپ کو ایک جگہ لے چلوں گا۔ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ کس وقت چلنا ہے؟"

"دس بجے ٹھیک رہے گا۔"

وزیر خان کان لگا کر ان کی باتیں سن رہا تھا "یہ تو بتاؤ، کہاں چلیں گے؟"

"صاب جی، دریا پر چلیں گے۔ مچھلیاں پکڑیں گے۔"

بیری خوش ہو گیا "واہ۔۔۔ مچھلی کا تو بڑا شوق ہے مجھے" پھر وہ وزیر خان کی طرف مڑا "کیوں لڑکے، تم بھی چلو گے نا؟"

"کل مجھے ایک کام سے جانا ہے صاب جی ورنہ ضرور چلتا" وزیر خان نے سوچا سمجھا جواب دیا۔ ان دونوں کی گفتگو کے دوران ہی اس نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہار میں اس کا کوئی نقصان نہیں تھا۔ جیتنے کی صورت میں اسے ایک شاندار موقع ملتا قسمت آزمائی کا۔

تھوڑی دیر بعد اس کے داؤ کا فیصلہ ہو گیا۔ کھانے کے دوران بیری نے اسٹیلا کو اگلے روز کا پروگرام بتایا "ان تفریحات کا تو ہمیں خیال بھی نہیں آیا تھا" اس نے آخر میں کہا "یہ لڑکے ہم لوگوں کے لیے بہت مبارک ثابت ہوئے ہیں۔"

"لیکن بیری، میں آج بہت تھک گئی ہوں۔ کل نہیں چل سکوں گی۔"

"چلو، کوئی بات نہیں۔ میں چلا جاؤں گا۔ اچھا لگا تو اگلی بار تمہیں بھی لے چلیں گے۔"

اس روز گھر واپس جاتے ہوئے سعید خان نے وزیر خان سے پوچھا "یہ تمہیں کیا کام نکل آیا؟"

"یار! کیا بات ہے۔ مجھے کوئی کام نہیں ہو سکتا" وزیر خان نے ہنستے ہوئے کہا "لیکن میں تمہاری پریشانی کی وجہ سے بھی واقف ہوں۔"

"ہونا بھی چاہیے" سعید خان نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے تو تمہیں چھوڑ کر جاتے ہوئے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔"

"تمہیں بھی نہیں جانا چاہیے۔ میں اچھے برے کی تمیز بھی رکھتا ہوں اور مجھے برائی سے بچنا بھی آتا ہے۔"

وزیر خان کی تیوریاں چڑھ گئیں "سعید خان میں اچھے برے کی تم سے زیادہ تمیز رکھتا ہوں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بھی ایسی جگہ نہیں' تمہیں حد سے بڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ تم بس اپنے کام سے کام رکھو۔ تم اپنے فائدے میں مجھے شریک نہیں کرتے تو میں شکایت بھی نہیں کرتا۔ لیکن اپنے فائدے کی ضرور سوچوں گا اور تم سے مدد بھی نہیں لوں گا۔"

اس کے بعد تمام راستے دونوں خاموش رہے۔

○☆○

وہ سعید خان کے لیے بے چینی کی رات تھی۔ وہ ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا۔ صاب کو دوبارہ لے جانے کی پیشکش اس نے خود کی تھی۔ اب وہ پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وزیر خان اس کے اور بیوی کے جانے کے بعد کالج ضرور جائے گا۔ وہ میم صاب کے لیے اس کی نظریں دیکھتا رہا تھا۔ وہ وزیر خان کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ پولیس میں کسی کے ساتھ چار سال گزار لیے جائیں تو کچھ چھپا نہیں رہتا۔ لاہور میں صرف اس کی وجہ سے وزیر خان آوارگی سے بچا رہا تھا۔ کئی بار لوگوں نے انہیں بازار لے جانے کی پیشکش کی تھی۔ لیکن اس نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے ایسے ہر موقع پر وزیر خان کی آنکھوں کو جلتے بجھتے دیکھا تھا' اس کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ چلا بھی گیا ہوتا۔

مگر اب معاملہ مختلف تھا۔ میم صاب کے معاملے میں وزیر خان کو پیسے کا لالچ بھی تھا۔ اور اس معاملے میں کوئی لحاظ نہیں چلتا تھا۔ سعید خان کو یہ احساس بھی تھا کہ اس معاملے میں اس سے پے درپے غلطیاں ہوئی ہیں۔ پہلی غلطی تو یہ تھی کہ وہ اسے کالج لے آیا۔ دوسرے اس نے سو روپے کے جو دو اضافی نوٹ حاصل کیے تھے' ان میں وزیر خان کا حصہ نہ لگانا بھی غلطی تھی۔ وزیر خان نے نوٹ دیکھ لیے تو آنکھوں میں ایسے ہی نوٹوں کے خواب بھی بسا لیے ہوں گے۔ سعید خان کو وزیر خان سے کئی خدشے تھے۔ وہ چالاک بھی تھا اور لالچی بھی۔ چالاک آدمی ویسے بھی غلطیاں کرتا ہے۔ اور لالچ تو اسے غلطی کا احساس بھی نہیں ہونے دیتا۔ پھر وہ گرم مزاج اور عجلت پسند بھی تھا۔ سعید خان جانتا تھا کہ اب وزیر خان کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اگر بات صرف دوستی اور رشتے داری کی ہوتی تو سعید خان کو کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ سوچتا کہ اپنا معاملہ وہ جانے۔ لیکن یہاں مسئلہ بہت نازک تھا۔ یہ سعید خان کی بہن کے مستقبل کا سوال تھا۔ سعید خان یہ بھی جانتا تھا کہ یہ مانگ بہت پرانی ہے اور ریشم بھی وزیر خان کو بہت پسند کرتی ہے۔ وزیر خان کی کوئی لغزش ریشم کی زندگی برباد بھی کر سکتی تھی اور یہ سعید خان کو گوارا نہیں تھا۔

مگر فی الوقت وہ پریشان ہونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ رات بھر پریشان رہا۔ ٹھیک طرح سے سو بھی نہیں سکا۔ صبح وہ کالج جانے کے لیے نکلا تو جاتے ہوئے وزیر خان کے گھر بھی چلا گیا۔

"وہ صبح ہی کہیں چلا گیا ہے پتر" وزیر خان کی ماں نے بتایا "کہتا تھا' کام سے جا رہا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے اسے کوئی کام ہی ہو" سعید خان نے دل میں سوچا۔ لیکن تسلی نہیں ہوئی۔ اس کی پریشانی اپنی جگہ رہی۔

○☆○

جیلی سعید خان کے ساتھ مچھلی کے شکار کو چلا گیا تھا۔ اسٹیلا اکیلی تھی اور کئی دنوں کے بعد اسے تنہائی کا شدید احساس بھی ہو رہا تھا۔ پہلے وہ اکیلی ہوتی تھی تو سعید خان کا خیال اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کا تصور آنکھوں میں ہوتا تھا۔ مگر اب اس کے خیال سے تنہائی کا احساس اور سوا ہو رہا تھا۔ انا کا زخم ہرا ہو گیا تھا۔

اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس لیے اسے ڈپریشن زیادہ ہوتا ہے۔ مگر اب بہرحال اس کے پاس ایک کام تھا۔ اسے سعید خان کو جھکانے کے بارے میں سوچنا تھا۔ منصوبہ بنانا تھا اور اس پر عمل کرنا تھا۔

گھر میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ گھر میں رہنے میں یہ ڈر بھی تھا کہ وہ پینا شروع کر دے گی۔ چنانچہ وہ باہر نکلی اور باغ کی طرف چل دی۔ پھل دار درختوں میں پھول آگئے تھے۔ وہاں سے وہ باغیچے میں چلی آئی۔ وہاں لڑکوں کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ باغیچہ رنگا رنگ پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ گھاس ذرا بڑی ہو گئی تھی۔ اسے چھٹائی کی ضرورت تھی۔

وہ گھاس پر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت بھی سعید خان کو جھکانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ لیکن اس نے اس بار فیصلہ کر لیا تھا کہ اس ہفتے وہ یہاں نہیں رکے گی۔ بلکہ جیری کے ساتھ واپس جائے گی۔ شاید وہاں وہ بہتر طور پر سوچ سکے۔

قدموں کی آہٹ سے وہ چونک گئی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو وزیر خان نظر آیا۔ اسے حیرت ہوئی۔ وزیر خان نے اسے دیکھا تو اس کی طرف چلا آیا "سلام میم صاب۔"

"تمہیں تو کوئی کام تھا وزیر خان" اسٹیلا نے نرم لہجے میں کہا۔

"جی میم صاب۔ لیکن کام جلدی ہو گیا تو میں نے سوچا' یہاں کا کام بھی کچھ کم کر لوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ جاؤ کام کرو۔"

وزیر خان زیر تعمیر اصطبل کی طرف چلا گیا۔ جاتے ہی وہ کام پر یوں پل پڑا' جیسے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنا چاہتا ہو۔ اور درحقیقت یہی اس کا منشا بھی تھا۔ کیونکہ کام کے علاوہ بھی اس کے ذہن میں کچھ تھا۔ مصروفیت ثابت کرنے کے لیے کم وقت میں زیادہ کام کرنا ضروری تھا۔

اسٹیلا اپنی سوچوں میں الجھی رہی۔ وہ سعید خان کو جھکانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس پر ڈپریشن طاری ہونے لگا۔ اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا اور وہ دہری آگ میں جل رہی تھی۔ اسے سعید خان کو پانا بھی تھا اور اسے جھکانا' ذلیل کرنا بھی تھا۔ لیکن کیسے؟

باغیچے میں بیٹھے بیٹھے اس پر وحشت طاری ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر کاٹیج میں چلی گئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی۔ اس کا ڈپریشن بڑھتا گیا۔ بالآخر اس نے بوتل اور جام اٹھا لیا۔ تاہم اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اتنی نہیں پیے گی کہ آؤٹ ہو جائے۔

وزیر خان آیا تو وہ چوتھا جام پی رہی تھی۔ اس نے چونک کر وزیر خان کو دیکھا "تمہیں اب بھی نہیں معلوم ہوا کہ دروازہ ناک کر کے اندر آنا چاہیے" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"سوری میم صاب' آئندہ خیال رکھوں گا۔"

"اچھا... بات کیا ہے؟"

"میں چائے بنا لوں میم صاب۔"

"بنا لو۔ پوچھنے کی کیا بات ہے۔"

"آپ کے لیے بھی بناؤں؟"

"نہیں۔ میں اپنی چائے پہلے ہی پی رہی ہوں" وہ تلخی سے ہنسی۔

وزیر خان کچن میں چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے نکلا۔ اسٹیلا نے اسے آواز دے لی "آؤ وزیر خان... یہیں بیٹھ کر چائے پی لو۔"

وزیر خان نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ قالین پر نیم دراز تھی۔ اس کا چہرہ نوشی سے تمتما رہا تھا۔ گاؤن بے ترتیب ہو رہا تھا۔ وزیر خان کا دل بے ایمان ہونے لگا۔ وہ قالین پر اس کے سامنے جا بیٹھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"کیا بات ہے۔ مجھ سے ڈرتے ہو؟" اسٹیلا نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"جی یہی سمجھ لیں۔ ہمیں ڈرنا بھی چاہیے۔"

"تمہارا دوست تو نہیں ڈرتا۔"

"وہ بے وقوف ہے میم صاب جی۔"

اس وقت اسٹیلا کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ کچھ نشہ اور کچھ ڈپریشن۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اس نے کسی کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا نہ کیا تو مر جائے گی۔ جیسے اندر کوئی دھماکا ہو گا اور وہ پھٹ جائے گی "تم مجھ سے مت ڈرو وزیر خان" اس نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"آپ کہتی ہیں تو نہیں ڈروں گا جی" وزیر خان نے سادگی سے کہا۔

"مجھے اس وقت کسی دوست' کسی ہمدرد کی ضرورت ہے۔"

"میں حاضر ہوں میم صاب جی" اس بار وزیر خان کے لہجے میں اعتماد تھا۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ یہ دن رائگاں نہیں جا رہا ہے۔

"میرا دکھ کوئی نہیں سمجھتا" اسٹیلا خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"میں آپ کا دکھ سمجھتا ہوں۔"

اسٹیلا نے چونک کر اسے دیکھا "تم کیسے سمجھ سکتے ہو میرا دکھ" اس نے وزیر خان کے چہرے کے پاس انگلی لہراتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں میم صاب" وزیر خان نے بھرپور اعتماد سے کہا۔

"کیا سمجھتے ہو؟"

"آپ کا دکھ سعید خان ہے جی۔"

اسٹیلا سناٹے میں آگئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اسے لفظ نہیں ملے۔ بس ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔

"اور میم صاب جی' آپ کے دکھ کا علاج بھی ہے میرے پاس۔"

"وہ کیسے؟"

"اس وقت تو بات نہیں ہو سکتی۔ صاب کسی بھی وقت واپس آجائیں گے۔ فرصت میں بات کروں گا جی۔"

"پھر بھی... مجھے یقین نہیں آتا۔ تم میرے دکھ کا علاج کیسے کر سکتے ہو؟"

"ایسے..." وزیر خان نے کہا اور اچانک ہی اس کا ایک ہاتھ تھام لیا۔ وہ دلاسا دینے والے انداز میں اسے تھپتھپاتا رہا۔ پھر سہلانے لگا۔ اب اس کی اپنی انگلیوں میں لرزش بھی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اسٹیلا تعجب سے اسے دیکھ رہی تھی۔

پھر اچانک وزیر خان نے اپنا چہرہ جھکایا اور اسٹیلا کے ہاتھ کو دیوانہ وار چومنے لگا۔

"یہ تم میرے دکھ کا علاج کر رہے ہو؟" اسٹیلا نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ اس طرح آپ کے دکھ کا علاج ہو سکتا ہے" وزیر خان نے عاجزی سے جواب دیا۔

"میری سمجھ میں تمہاری بات بالکل نہیں آرہی ہے۔"

"اور میں کہہ چکا ہوں کہ میں آپ کو فرصت سے بتاؤں گا' جب کسی کے آنے جانے کا دھڑکا نہیں ہو گا۔"

"اور میں اتنا سمجھ گئی ہوں کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

"یہ تو آپ کو پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا میم صاب۔ میں نے یہ بات چھپائی ہی کب تھی۔ لیکن جہاں تک آپ کے دکھ کے علاج کا تعلق ہے تو وہ میں آپ کو کل بتاؤں گا' ایسے وقت جب یہاں کوئی نہیں ہو گا۔"

"لیکن کل میں یہاں نہیں ہوں گی۔ اس بار میں جیری کے ساتھ واپس جا رہی ہوں۔"

"آپ کی مرضی میم صاب۔ بعد میں کبھی سہی' جب موقع ملے۔ بہرحال فائدہ آپ کا ہی ہے۔"

اسٹیلا کا واپس جانے کا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ وہ اس سلسلے میں

جلد سے جلد حل کرنا چاہتی تھی "تم اچھے لڑکے ہو وزیر خان" اس نے کہا "لیکن تمہارا اس میں کیا مفاد ہے؟"

"آپ کے دکھ کے علاج میں میرے دکھ کا علاج بھی ہے میم صاب۔"

اسٹیلا اس کا مطلب بغیر کسی ابہام کے سمجھ رہی تھی۔ پھر بھی اس نے پوچھ لیا "تم مجھ پر یہ عنایت کیوں کر رہے ہو؟ تم کیا چاہتے ہو مجھ سے۔"

"زمین خریدنے کے لیے کچھ رقم" وزیر خان نے بلا جھجک کہا۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا "اور... اور آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔"

"مگر پہلے تمہیں ثابت کرنا ہوگا کہ تم صرف لفظوں سے نہیں کھیل رہے ہو۔"

"مجھے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں" وزیر خان نے بے رخی سے کہا "آپ خود ہی فیصلہ کرلیں کہ میں آپ کے کام آسکتا ہوں یا نہیں۔"

اسٹیلا کے تیور اور لہجہ سب کچھ بدل گیا "میں جانتی ہوں ڈارلنگ۔ تم میرے کام آسکتے ہو۔ لیکن..."

وزیر خان نے بھانپ لیا کہ وار کامیاب رہا ہے۔ پھر بھی احتیاطاً اس نے آزمائش کر ڈالی "تو پھر بہانہ نکالیں" اس نے کہا اور اسٹیلا کے پوچھنے پر بہانے کی وضاحت بھی کی۔ وہ اسٹیلا کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ اسٹیلا بھی ایکسائیٹڈ ہو گئی "مستو ڈارلنگ... ذرا میرے لیے شراب انڈیلو جام میں۔"

وزیر خان نے جام بھر کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اسٹیلا نے جام سے چھوٹا سا ایک گھونٹ لیا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلو ٹھیک ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو مجھے پیار کرلو۔ مگر صرف ایک بار۔ بس اتنی ہی اجازت دے رہی ہوں میں۔"

وزیر خان کو پہلے تو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ پھر اس نے اسٹیلا کو بانہوں میں بھر لیا۔ لمحوں میں اس پر دیوانگی طاری ہونے لگی۔ اس کے ہاتھ بے قابو ہونے لگے تو اسٹیلا نے اسے پرے دھکیل دیا "چلو... بس اب جاؤ اور اپنا کام کرو" وہ بولی "بیری آنے ہی والا ہوگا۔"

○☆○

بیری رچرڈسن اور سعید خان شام چار بجے واپس آگئے۔ بیری بہت خوش نظر آرہا تھا۔ سعید خان آتے ہی مچھلیوں کی صفائی اور انہیں فرائی کرنے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ پہلے بیری کو ہی پتا چلا کہ وزیر خان آیا تھا اور کام میں مصروف ہے۔ وہ اصطبل کی طرف چلا گیا۔ وزیر خان نے جتنا کام نمٹایا تھا' اسے دیکھ کر بیری متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ویسے بھی وہ لڑکوں کی محنت اور خلوص کا قائل ہو چکا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ کاٹیج میں لے آیا "چلو بیٹھو۔ اب مچھلی کھانا" اس نے کہا۔

"سعید خان کہاں ہے؟" وزیر خان نے پوچھا۔

"کچن میں مچھلی فرائی کر رہا ہے۔"

"میں اس کا ہاتھ بٹاتا ہوں صاب جی۔"

وزیر خان کچن میں چلا گیا۔ سعید خان نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا "تمہارا کام تو ہو گیا نا؟" اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہو گیا۔ کیوں نہ ہوتا۔"

"تمہارے جاتے ہی تم یہاں چلے آئے ہو گے۔"

"تمہارے جاتے ہی نہیں' اپنا کام ہوتے ہی میں یہاں چلا آیا۔"

"تب تو تم نے بہت کام کرلیا ہوگا؟" سعید خان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"خود ہی چل کر دیکھ لینا" وزیر خان نے بے پروائی سے کہا۔

پانچ بجے مچھلی تیار ہو گئی۔ بیری اور اسٹیلا نے ساتھ بیٹھ کر مچھلی کھائی۔ وہ پی بھی رہے تھے۔ سعید خان اور وزیر خان نے الگ بیٹھ کر مچھلی کھائی۔ چھ بجے بیری واپسی کی تیاری کرنے لگا "اب تم لوگ چھٹی کرو" اس نے روانہ ہوتے وقت ان دونوں سے کہا "اور ہاں... تمہارے خیال میں اصطبل کب مکمل ہو جائے گا؟"

"زیادہ سے زیادہ پرسوں تک" وزیر خان نے جواب دیا۔

"تو اصطبل مکمل ہوتے ہی تم دونوں ایبٹ آباد میرے پاس آجانا" بیری نے کہا "وہاں سے دونوں گھوڑوں کو لے آنا۔"

"جی بہتر صاب جی۔"

"پھر میم صاب کو گھڑ سواری سکھانی ہوگی۔"

"آپ بے فکر رہیں صاب جی۔"

"اور ہاں' تم دونوں میم صاحب کا خیال رکھنا۔"

"آپ فکر نہ کریں صاب جی" اس بار دونوں نے بیک آواز جواب دیا۔

بیری کے ساتھ ہی وہ کاٹیج سے نکل آئے۔ بیری کو رخصت کرنے کے بعد سعید خان اپنی سائیکل کی طرف گیا۔ وہ باہر جانے کے لیے سائیکل موڑ ہی رہا تھا کہ وزیر خان نے اسے ٹوک دیا "چل کر یہ تو دیکھ لو کہ کام کہاں تک پہنچ گیا ہے۔"

سعید خان نے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور وزیر خان کے ساتھ زیر تعمیر اصطبل کی طرف چلا گیا۔ کام دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی اور پشیمانی بھی۔ وزیر خان نے تقریباً اتنا ہی کام کیا تھا' جتنا پورے دن میں کیا جا سکتا ہے "واہ یارا... تم نے تو زبردست کام کیا ہے؟" اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"شکر ہے۔ ورنہ تم تو جانے کیا سمجھ رہے تھے۔"

سعید خان نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ وہ بھی جانتا تھا اور وزیر خان کو بھی معلوم تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور یہ بھی نہیں تھا کہ وہ غلط سوچ رہا ہو۔ البتہ وہ یہ خواہش ضرور کر رہا تھا کہ کاش اس کی سوچ غلط ہو "آؤ یارا گھر چلیں" اس نے گہری سانس لے کر کہا "باقی باتیں راستے میں کریں گے۔"

دونوں دوست گھر کی طرف چل دیے۔ اس روز وہ سائیکل پر نہیں' پیدل جا رہے تھے۔ ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر سعید خان نے کہا "وزیر خان' میں چاہتا ہوں کہ اس نوکری میں ہم اپنا اصل مقصد سامنے رکھیں اور کسی چکر میں نہ پڑیں۔ یہ انگریز بڑے چالاک اور مطلبی ہوتے ہیں۔"

"یہ میں بھی جانتا ہوں" وزیر خان نے کہا "لیکن یہ لوگ ایسے نہیں لگتے۔"

"صاب تو اچھا ہی لگتا ہے۔ لیکن میم بڑی مکار ہے۔"

"مجھے تو نہیں لگتا۔"

"تمہارا واسطہ ہی کہاں پڑا ہے اس سے۔ میں جانتا ہوں اور تمہیں بتا رہا ہوں۔"

وزیر خان دل ہی دل میں ہنس دیا۔ وہ سعید خان کی بات کی یقینی طور پر تردید کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ میم کی سمجھ میں خود وہ بات نہیں آئی تھی' جو وہ اب اسے سمجھانے جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ انگریز مکار نہیں ہوتے۔ ہم دیسی لوگ اپنے مطلب' اپنے مفاد کے لیے انہیں مکاری سکھاتے ہیں "یارا جی' سچ یہ ہے کہ مجھے تو اس میم میں کوئی مکاری نظر نہیں آئی" اس نے کہا "ورنہ تم اسے بے وقوف بنا کر اپنا الو کیسے سیدھا کرتے۔"

"یارا جی' تم غلط سمجھ رہے ہو مجھے۔ وہ میم بدکردار ہے" سعید خان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مگر اس سے اس کی مکاری تو ثابت نہیں ہوتی۔ اس سے زیادہ مکار تو میں ہوں۔"

"کچھ بھی سہی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم بھی اپنا الو سیدھا کرو۔ بس اس کے فریب میں نہ آنا۔"

"یارا' تم میری اتنی فکر کیوں کرتے ہو؟" وزیر خان نے چڑ کر کہا۔

"تم جانتے ہو کہ کیوں کرتا ہوں۔"

اس کے بعد تمام راستے خاموشی رہی۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے رہے۔

○☆○

اسٹیلا رچرڈسن سو رہی تھی۔ وہ شاید خواب دیکھ رہی تھی۔ وہ کاٹیج میں تھی اور کوئی دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دستک زیادہ زوردار نہیں تھی۔ لیکن اتنی دھیمی بھی نہیں تھی کہ وہ اسے سن نہ پاتی۔ وہ دروازہ کھولنے کے لیے اٹھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔

پھر دستک کی آواز تیز ہو گئی۔ جیسے آنے والا دروازہ نہ کھلنے پر مایوس ہوا ہو۔ مگر واپس بھی نہیں جانا چاہ رہا ہو۔ اسٹیلا کسمساتی رہی۔ پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ چند لمحے وہ یونہی لیٹی رہی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ دستک خواب میں نہیں' واقعتاً ہو رہی ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ کچھ خوف زدہ ہو گئی۔ اس نے روشنی کی اور پھر گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے دس بج چکے تھے۔ اتنی رات کو کون آسکتا ہے؟ کہیں بیری تو نہیں واپس آگیا۔

"کوئی زمانہ تھا کہ میں بہت خوب صورت ہوا کرتا تھا۔ میرے بال گھنے' ریشمی اور چمکیلے تھے۔ میری جلد ریشم کی طرح ملائم اور گلاب کی طرح سرخی مائل تھی۔ میرے ہونٹ گلابی تھے۔ آنکھیں چمکیلی اور شفاف تھیں۔ افسوس کہ اس وقت میں صرف چار سال کا تھا۔!"

وہ اٹھی اور اس نے گاؤن پہن لیا۔ پھر اس نے دراز میں سے پستول نکال کر ہاتھ میں لیا اور نیچے چلی آئی "کون ہے؟" اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر پوچھا "میں ہوں میم صاب جی۔"

اسٹیلا کا دل دھڑکنے لگا۔ سعید خان... "میں نے نام پوچھا ہے تمہارا؟" اس نے بے رخی سے کہا۔

"میں وزیر خان ہوں میم صاب۔"

"اتنی رات کو کیوں آئے ہو؟"

"آپ کے دکھ کا علاج کرنے۔"

"یہ کیا بکواس ہے" اسٹیلا جھنجھلا گئی۔

"حالانکہ آپ اسی کے لیے رکی ہیں ورنہ تو آپ واپس جا رہی تھیں۔"

اسٹیلا کے نیند میں ڈوبے ہوئے ذہن کو اس بات سے جھٹکا سا لگا۔ اسے وہ پوری بات یاد آگئی۔ وزیر خان کا کہا ہوا ایک ایک لفظ یاد آگیا "لیکن یہ کون سا وقت ہے آنے کا؟" اس نے برہمی سے کہا "کل دن میں بات کریں گے۔"

"کل تو سعید خان بھی موجود ہوگا میم صاب۔"

"میں اسے کہیں بھیج دوں گی... کسی کام سے۔"

"پھر بھی اس کے آنے کا دھڑکا تو لگا رہے گا۔"

"کچھ بھی ہو' اس وقت تو تمہیں واپس جانا ہوگا۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

"میم صاب جی..." وزیر خان گڑگڑانے لگا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے میم صاب۔ پھر آپ بھول جائیں کہ میں نے آپ سے کچھ کہا تھا۔ اس میں صرف میرا نہیں' آپ کا فائدہ بھی ہے بلکہ آپ کا زیادہ فائدہ ہے۔"

اسٹیلا سوچ میں پڑ گئی۔ اسے یاد آگیا کہ سعید خان نے اس کی نسوانی انا کو ٹھیس پہنچائی ہے' اس کی توہین کی ہے۔ مگر پھر بھی وہ اس کے دل سے نہیں اترا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کرنا ہے۔ اگر یہ وزیر خان اس سلسلے میں کچھ کر سکتا ہے تو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

"میں جاؤں میم صاب...؟"

اسٹیلا نے دروازہ کھول دیا۔ پستول والا ہاتھ اس نے سامنے ہی رکھا تھا "چلے آجاؤ۔" اس نے کہا "میں تمہیں [illegible] سکتی ہوں۔"

"رہنے دیں۔ بعد میں بھی کرلیں گے یہ بات" وزیر خان کے لہجے میں بے نیازی آگئی۔

"کیا چاہتے ہو؟ آجاؤ" اسٹیلا نے بے زاری سے کہا۔

وزیر خان تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ دشمنی کا راستہ ہی مناسب رہے گا۔ وہ اندر چلا گیا۔ اسٹیلا اسے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ اس نے لائٹ آن کی اور وزیر خان کو قالین پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ خود جا کر بوتل اور جام اٹھا لائی "ہاں۔ اب کہو۔ کیا بات ہے؟" اس نے اپنے لیے جام بناتے ہوئے کہا۔

"بات تو وہی ہے میم صاحب۔ آپ سعید خان کو اپنے اشاروں پر نچانا چاہتی ہیں نا؟"

اسٹیلا چند لمحے ہچکچائی۔ اسے احساس تھا کہ سعید خان اور وزیر خان ہم قوم، ہم وطن ہی نہیں، آپس میں رشتے دار بھی ہیں۔ اور وہ ان کے لیے ہر اعتبار سے غیر ہے۔ تو کیا ان میں سے کوئی اس کے لیے دوسرے کے خلاف ہو سکتا ہے۔ عقلی طور پر تو یہ ممکن نہیں تھا۔ لیکن بیری نے جو کچھ بتایا تھا، اس کے مطابق یہاں انگریزوں کی حکومت ہی مقامی لوگوں کے تعاون سے چل رہی تھی۔ وہ بہ آسانی ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اور اس معاملے میں تو وزیر خان یہ بھی بتا چکا تھا کہ اس کا اپنا مفاد کیا ہے۔ چنانچہ اسٹیلا نے تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد کہا "تم جانتے تو ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ اب کام کی بات کرو۔"

"میرے ذریعے آپ سعید خان کو اپنا غلام بنا سکتی ہیں" وزیر خان نے کہا۔

"مجھ سے صاف صاف بات کرو۔"

"آپ جانتی ہیں، میرے اور سعید خان کے درمیان کیا رشتہ ہے؟"

"ہاں۔ تم لوگ کزن ہو نا۔"

"بات صرف اتنی ہی نہیں۔ اس کی بہن سے میری شادی ہونے والی ہے" وزیر خان نے بتایا۔

"اوہ۔ تم نے بتایا تو تھا۔ لیکن مجھے یہ بات یاد نہیں رہی تھی۔"

"آپ شاید اس کی اہمیت کو نہیں سمجھتیں۔"

اچانک اسٹیلا کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ وہ جان گئی کہ وزیر خان اسے کیا آفر کر رہا ہے اور اس کا طریقہ کار کیا ہوگا۔ وزیر خان کو کیا چاہیے۔ یہ وہ پہلے ہی بتا چکا تھا۔ اسٹیلا جانتی تھی کہ وہ سودے بازی کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی وہ کوشش تو کر سکتی تھی۔ اس نے کہا "ذرا پھر دہرا دو کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو اس کے عوض۔"

"زمین خریدنے کے لیے کچھ رقم اور آپ کی قربت۔"

"دیکھو وزیر خان" اسٹیلا نے جام خالی کیا اور اسے دوبارہ بھر لیا "رقم تو میں تمہیں دے سکتی ہوں۔ لیکن دوسری شرط مجھے قبول نہیں" وہ کہتے کہتے رکی۔ پھر اس نے وضاحت کی "دیکھو نا، یہ تو دل کا سودا ہوتا ہے۔ یہ کوئی سامانِ تجارت تو نہیں۔" وہ وزیر خان کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے مایوسی بھانپ کر اس نے اسے دلاسا دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے "ہاں یہ ناممکن بھی نہیں۔ ممکن ہے کچھ دن ساتھ رہو تو تم مجھے اچھے لگنے لگو۔ اب مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے" یوں اس نے وزیر خان کو اصرار کرنے سے بھی روک دیا۔

وزیر خان نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "مجھے آپ کے قریب اور آپ سے بے تکلف دیکھنے سے بچنے کے لیے سعید خان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ آپ کے قدموں میں آگرے گا۔"

"ہوں۔ بات تو سمجھ میں آتی ہے" اسٹیلا نے سر ہلا کر کہا "لیکن وہ کچھ اور بھی تو کر سکتا ہے۔ میں نے سنا ہے، تم لوگ خطرناک ہوتے ہو۔"

"وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا" وزیر خان نے بڑے یقین سے کہا۔

"آپ کے خیال میں کیا کر سکتا ہے وہ؟"

"وہ میری یا تمہاری جان بھی تو لے سکتا ہے۔"

"آپ کے بارے میں وہ ایسا اس لیے نہیں سوچ سکتا کہ آپ لوگ حاکم ہیں۔ اور میرے بارے میں اس لیے کہ میں اس کا بہنوئی ہوں۔ اس کے سامنے اس کے سوا کوئی اور راستہ ہی نہیں کہ وہ آپ کے سامنے سر جھکا دے۔"

"اور جو وہ تم سے یہ رشتہ ختم کر لے تو؟" اسٹیلا نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"ایسا نہیں ہوگا۔ میں خوب جانتا ہوں اسے۔"

اسٹیلا نے دوسرا جام خالی کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی "تم یہیں رکو۔ میں ابھی آتی ہوں" یہ کہہ کر وہ اوپر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ وہاں سے آئی تو اس کے ہاتھ میں سو کا ایک نوٹ تھا۔ وہ نوٹ اس نے وزیر خان کی طرف بڑھایا "یہ لو اور اب تم جاؤ۔"

"بس؟"

"بہت زیادہ امید نہ رکھنا مجھ سے۔ میں اپنا کام کسی اور طرح بھی نکال سکتی ہوں۔"

"میرا اشارہ رقم کی طرف نہیں تھا۔ میں نے کچھ اور بھی طلب کیا ہے آپ سے۔"

"اوہ۔ اور میں نے اس کا جواب بھی تمہیں دے دیا تھا۔ ابھی تو نہیں۔ ہاں، ممکن ہے بعد میں......"

وزیر خان چند لمحے اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ میں موجود نوٹ دیکھا "ٹھیک ہے میم صاحب، میں انتظار کر لوں گا۔ لیکن میں بتا دوں کہ اس کے بغیر بات بننے کی بھی نہیں۔"

"دیکھیں گے۔ اب تم جاؤ۔"

○☆○

اگلے روز دونوں لڑکے تن دہی سے کام میں لگے رہے۔ اسٹیلا نے بھی ان میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اب کام مکمل کرنے کی فکر میں ہیں۔ اور ہوا بھی یہی۔ رات کو وہ گھر واپس گئے تو اصطبل مکمل ہو چکا تھا۔

"کل ہم بھوسا چارا لائیں گے" وزیر خان نے اسٹیلا سے کہا "اور پھر گھوڑے لانے کے لیے ایبٹ آباد چلے جائیں گے۔"

"جو چاہو کرو۔ یہ تمہارا دردِ سر ہے" اسٹیلا نے بے زاری سے کہا۔

بظاہر تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن سعید خان محسوس کر رہا تھا کہ کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ کوئی گڑبڑ ہے۔ وزیر خان کا انداز بدلا بدلا تھا۔ اس نے میم سے جتنی بار بھی بات کی تھی اس کے لہجے اور انداز میں بے پناہ اعتماد تھا۔ یہی نہیں، اس کی نگاہوں میں بھی بے باکی تھی۔ اور میم کا انداز مدافعانہ تھا۔ سعید خان تمام وقت یہی سوچتا رہا کہ کہیں ان دونوں کے درمیان کچھ طے تو نہیں پا گیا ہے۔

اگلے روز انہوں نے اصطبل کو ہر اعتبار سے مکمل کر لیا۔ دانے پانی کا بھی بندوبست ہو گیا۔ پھر وہ ایبٹ آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں انہیں صاحب سے ملنا اور گھوڑوں کو لے کر کاٹیج واپس آنا تھا۔ وہ منگل کا دن تھا۔

وہ سہ پہر کے وقت ایبٹ آباد پہنچے اور بیری رچرڈسن سے ملے۔ بیری نے انہیں ان کے کام کی اجرت بھی دی اور دونوں گھوڑے ان کے حوالے کر دیے۔ گھوڑے سدھے ہوئے تھے۔ لہٰذا انہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ واپسی کے سفر میں سعید خان بہت خوش تھا۔ اب وہ زمین کا خواب پورا کر سکتا تھا۔

وہ گھوڑے لے کر کاٹیج پہنچے تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ سعید خان کو گھر جانے کی بے تابی تھی۔ گھوڑوں کو اصطبل میں پہنچاتے ہی اس نے کہا "وزیر خان، اب گھر چلیں؟"

وزیر خان نے حیرت سے اسے دیکھا "گھر چلنے میں تھوڑی دیر لگے گی یارا۔ گھوڑوں کی تمام ضرورتیں پوری کر دیں۔ گھوڑوں کو ذرا مانوس ہونے کا وقت مل جائے......"

"یہ تمہارا دردِ سر ہے۔ میں تو چلا یارا۔"

وزیر خان کو حیرت ہونے لگی۔ سعید خان یوں اسے اکیلا چھوڑ کر چلا جائے......!

"میں چلتا ہوں۔ تم آتے رہنا۔"

وزیر خان چند لمحے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اپنے کام میں لگ گیا۔

اس روز گھر جاتے ہوئے سعید خان کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اب اس کے پاس اتنی رقم جمع ہو چکی تھی کہ وہ بہت کافی زمین خرید سکتا تھا۔ وہ یہ فیصلہ کر کے چلا تھا کہ آج پوری رقم بابا کے ہاتھ پر رکھ دے گا۔ [illegible]

ادھر اصطبل میں کام کرتے ہوئے وزیر خان بھی سعید خان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اور اسٹیلا ایک [illegible] سے دوچار تھی۔ [illegible] خیال سے بے حد [illegible] تھا کہ اب وہ وزیر خان سے گھڑ سواری سیکھنے کے بہانے سعید خان پر پہلی ضرب لگا سکے گی اور جلد ہی سعید خان اس کی مٹھی میں ہوگا۔ اپنی خوشی میں وہ ان دونوں کی تبدیلی بھی محسوس نہ کر سکی۔ وزیر خان بھی تھوڑی دیر بعد رخصت ہو گیا تھا۔

○☆○

ان دونوں کے درمیان تقسیمِ کار طے ہو گئی تھی۔ اصطبل کا کام وزیر خان کے ذمے تھا۔ باقی سب کچھ سعید خان کو کرنا تھا۔ یہ احساس سعید خان کو ذرا دیر میں ہوا کہ وزیر خان کی ایک اور ڈیوٹی بھی ہے۔ میم صاحب کو گھڑ سواری سکھانا۔ اور اس سوچ ہی سے وہ دل سے خوش ہوتا تھا اور نظر آتا تھا۔ سعید خان کے لیے یہ تشویش ناک تھی۔ سعید خان پریشان تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ابھی صورت حال جتنی خراب ہے، آگے جا کر اس سے کہیں خراب ہوگی۔ اس کا اندازہ اسے پہلے ہی دن ہو گیا تھا۔ اس روز وزیر خان میم کے لیے گھوڑا نکال کر لایا تھا۔ پہلے تو وہ میم کو سمجھاتا رہا "میم صاحب، پہلا مرحلہ گھوڑے کو خود سے مانوس کرنے کا ہوتا ہے" وہ کہہ رہا تھا "یہ صرف محبت سے ممکن ہے۔ سرکش سے سرکش گھوڑے کو بھی رام کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سدھے ہوئے گھوڑے ہیں۔ مسئلہ نہیں بنیں گے۔ آپ اسے چمکاریں۔ اس کی گردن سہلائیں، تھپتھپائیں۔ بس یہ تھوڑی دیر میں آپ سے رشتہ جوڑ لے گا۔ آپ کا غلام ہو جائے گا۔"

یہ گفتگو سنتے ہوئے سعید خان چونک اٹھا۔ وزیر خان کے لہجے میں عجیب سی لگاوٹ تھی۔ لگتا تھا گھوڑے کے متعلق نہیں، وہ اپنے بارے میں کہہ رہا ہے۔ سعید خان نے اسٹیلا کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے بہت قریب نہیں تھی۔ پھر بھی اس کے چہرے پر ہلکی سی تمتماہٹ واضح طور پر نظر آرہی تھی۔ ایسے میں سعید خان کا پریشان ہو جانا فطری تھا۔ وہ پریشانی بھی [illegible] ڈالی تھی۔ وزیر خان کے لہجے اور انداز نے اس کے خدشے کی تصدیق کر دی تھی کہ وہ اسٹیلا کے چکر میں ہے۔ دوسری طرف اسٹیلا کے لیے وزیر خان کو لفٹ دینا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

"...اب آپ اسے چمکاریں۔ پیار سے اس کی گردن اور کمر سہلائیں" وزیر خان کہہ رہا تھا۔

اسٹیلا نے ہچکچاتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور گھوڑے کی گردن سہلانے لگی۔ ساتھ ہی وہ اسے چمکار بھی رہی تھی۔ گھوڑا کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے ہنہنانے لگا۔ جیسے شناسائی کا اظہار کر رہا ہو "دیکھیں، اتنی سی دیر میں کیسے مانوس ہو گیا ہے" وزیر خان نے کہا۔

اسٹیلا خوش بھی نظر آرہی تھی اور حیران بھی۔ وہ اب بھی

گھوڑے کو سہلا اور پچکار رہی تھی۔
"اب آپ گھوڑے پر سوار ہوں۔" وزیر خان نے کہا۔
"کیسے؟"
"یہ... یہاں پاؤں رکھیں اور..."
اسٹیلا ہچکچا رہی تھی۔ وہ خوف زدہ بھی تھی۔ وزیر خان نے اسے عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔ "لیکن میں گر جاؤں گی۔" اسٹیلا نے کہا۔
"میں آپ کو سنبھالنے کے لئے کھڑا ہوں۔ میں گرنے نہیں دوں گا آپ کو۔"
اسٹیلا نے پاؤں جما کر رکھا۔ لیکن توازن بگڑ گیا۔ وزیر خان نے پھرتی سے اس کی کمر تھامی اور سہارا دے کر اسے گھوڑے پر سوار کرا دیا۔ یہ دیکھ کر سعید خان کو وحشت ہونے لگی کہ وزیر خان کا ہاتھ خطرناک حد تک میم صاحب کی کمر سے لپٹا تھا۔
گھوڑے کی لگام وزیر خان کے ہاتھ میں تھی اور اسٹیلا رچرڈسن گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھی تھی۔ وزیر خان زبانی طور پر اسے سمجھا رہا تھا کہ گھوڑے کو کس طرح کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ "بس تم لگام نہ چھوڑنا۔" اسٹیلا گھبرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"آپ بے فکر رہیں میم صاب۔"
وہ گھوڑے کی لگام پکڑے چل رہا تھا۔
دو تین دن میں میم صاب میں اتنا اعتماد آ گیا تھا کہ اب وزیر خان کے لئے لگام پکڑنا ضروری نہیں تھا۔ لیکن وہ کبھی دور نہیں جاتے تھے۔ ہر حال جتنا کچھ بھی تھا، سعید خان کے لئے تو وہ بھی سوہانِ روح بن گیا تھا۔ وہ اس دن کو کوستا تھا جب وہ وزیر خان کو یہاں لایا تھا۔ اس روز وزیر خان نے اسٹیلا سے کہا "اب تو آپ دوڑ کر چل سکتی ہیں۔ اب میں آپ کو ایسی ایسی جگہیں دکھاؤں گا کہ آپ خوش ہو جائیں گی۔"
"نہیں ابھی نہیں۔ ابھی میں دور نہیں جا سکتی۔ ایسا کرو، آج تم میرے ساتھ بیٹھو اور گھوڑا دوڑا کر دکھاؤ۔"
باغیچے میں کام کرتے ہوئے سعید خان نے منہ پھیر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ منظر اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ گھوڑے کی دور جاتی ٹاپوں کی آواز سن کر اس نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ دونوں ایک ہی معلوم ہو رہے تھے۔ سعید خان نے کھرپی ایک طرف رکھی اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔
وہ جانتا تھا کہ اب وزیر خان سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔ جس حد تک ممکن تھا، اس سے زیادہ وہ اسے پہلے ہی سمجھا چکا تھا۔ اب تو بات بالکل ہی بگڑ جاتی۔ اور یہ اسے گوارا نہیں تھا۔ اس وقت تک بھی ان کے درمیان اتنا کھنچاؤ پیدا ہو چکا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے بات کم ہی کرتے تھے۔
وہ سعید خان کے لئے ایک سخت دن ثابت ہوا تھا۔ لیکن اس کا انجام بے حد خوش گوار تھا۔ اس روز وہ گھر پہنچا تو بابا نے اسے خوش خبری سنائی۔ وہ زمیں دار بن چکے تھے۔

○☆○

اسٹیلا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ تدبیر کارگر ثابت ہو رہی ہے۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام والی بات تھی۔ ایک طرف تو رائیڈنگ سیکھنا پُرلطف ثابت ہو رہا تھا۔ دوسری طرف وہ سعید خان کے ردِعمل پر بھی نظر رکھے ہوئے تھی۔ اور وہ بے حد حوصلہ افزا تھا۔ اب تک تو وہ صرف اسٹڈی کرتی رہی تھی۔ مگر اب اسے بات کو آگے بڑھانا تھا۔ وہ سست رفتاری سے بڑھنے والے معاملات پر اکتفا نہیں کر سکتی تھی۔ اب اسے جو قدم بھی آگے بڑھانا تھا، سوچ سمجھ کر بڑھانا تھا۔
اسی دوران اس نے سعید خان کو نظر انداز کرنے کی عادت ڈال لی تھی۔ وہ اس سے صرف اس وقت بات کرتی، جب ضروری ہوتا۔ سعید خان پر اس کا ردِعمل یہ ہوا تھا کہ وہ اپنے آپ میں سمٹ گیا تھا۔ اس کے سوا اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ اس بات سے اسٹیلا کو خوشی ہوئی تھی۔ اس کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ سعید خان آپے سے باہر ہونے والا آدمی نہیں۔ وہ اپنی اوقات جانتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس وزیر خان کم ظرف آدمی تھا۔ وہ ایسا شخص تھا، جسے انگلی پکڑنے کا موقع دیا جائے تو وہ پہنچا پکڑ لے۔ مگر سعید خان ایسا نہیں تھا۔ ہاں وزیر خان کو اس کے قریب دیکھ کر... بلکہ اسے وزیر خان کے قریب دیکھ کر اس کے تیور بدل جاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر اسٹیلا سعید خان کو بہت غور سے دیکھتی رہی تھی۔ وزیر خان جب اسے کمر سے تھام کر گھوڑے پر بٹھاتا تو سعید خان منہ پھیر لیتا۔ اور جب وہ گھوڑے پر اس کے ساتھ بیٹھا تھا تو لگتا تھا کہ سعید خان پر قیامت گزر گئی ہے۔
لیکن اسٹیلا رچرڈسن کے لئے یہ بات بھی آگ لگانے والی تھی۔ اس لئے کہ یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ سعید خان کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کے نظر انداز کرنے کو اس نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اور جو وہ اس کی اور وزیر خان کی قربت سے چڑتا تھا تو اس کی وجہ بھی رقابت نہیں تھی۔ رقابت ہوتی تو وہ اسٹیلا کے لئے باعثِ طمانیت ہوتی۔ سعید خان اس بات سے صرف اس لئے چڑ رہا تھا کہ وزیر خان اس کی بہن کا منگیتر تھا۔ یہ بات اسٹیلا کو اور توہین کا احساس دلا رہی تھی۔ اسٹیلا کا غصہ اور مہمیز ہو گیا تھا۔ توہین کا بدلہ لینے کی خواہش اور شدید ہو گئی تھی۔
بہرکیف اب اسٹیلا نے بات آگے بڑھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
اگلے روز اس نے لباس کے سلسلے میں خاص اہتمام کیا۔ وہ لباس دراصل بے لباسی کا اہتمام تھا۔ گیارہ بجے اس نے وزیر خان کے ساتھ رائیڈنگ کی۔ پھر وہ وزیر خان کو اپنے ساتھ کاٹیج میں لے گئی۔ وہ جانتی تھی کہ سعید خان اس وقت لکڑیاں کاٹنے کے لئے گیا ہوا ہے۔ اس نے وزیر خان کو قالین پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ قالین پر پلے بوائے کا تازہ شمارہ اس نے پہلے ہی سے رکھا ہوا تھا۔ وزیر خان رسالے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ لیکن اس کی ہاتھ بڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

"تم یہاں بیٹھو۔ میں کپڑے تبدیل کر لوں۔ پھر تمہارے لئے چائے بناؤں گی۔ سعید خان آ جائے تو اسے بھی بٹھا لینا۔" اس نے وزیر خان سے کہا اور اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں اس نے گھڑسواری کا لباس اتار کر اپنا منتخب کردہ گاؤن پہنا۔ مگر فوراً ہی نیچے آنے کی بجائے کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔
کوئی پندرہ منٹ بعد اسے سعید خان کندھے پر لکڑیوں کا گٹھر لادے آتا دکھائی دیا۔ وہ مسکرائی اور کھڑکی سے ہٹ گئی۔ نیچے کا منظر وہ تصور میں دیکھ سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وزیر خان نے اس کے اوپر آتے ہی پلے بوائے اٹھا لیا ہوگا اور اس سے لطف اندوز ہو رہا ہوگا۔ ایسے میں اسے سعید خان کے آنے کا پتا بھی نہیں چلے گا۔ اور سعید خان خود اس مرحلے سے گزر چکا تھا۔ اسے بہت کچھ یاد آ جائے گا۔ اسے تو وہ رسالہ خاص طور پر دیا گیا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوا تھا وہ بھی اس کی نظروں میں پھر جائے گا۔ پھر یا تو وہ وزیر خان سے جھگڑے گا یا اندر ہی اندر جلے اور جھلسے گا۔ دونوں صورتوں میں لوہا گرم ہی ہوگا۔ سعید خان یہی سمجھے گا کہ وہ اسے بھی اسی طرح لبھا رہی ہے۔
اسٹیلا نے انہیں پانچ منٹ کا وقت دیا۔ وہ کمرے سے نکلی اور نیچے چل دی۔ ابھی اسے لوہے کو اور گرم کرنا تھا۔
نیچے کمرے کا منظر اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے کشیدگی کا احساس ہو گیا۔ ان دونوں کے چہروں پر کھنچاؤ بہت واضح تھا۔ لیکن وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ ان کے درمیان گفتگو بالکل نہیں ہوئی ہے۔ رسالہ ایک طرف پڑا تھا اور وہ اس جگہ نہیں تھا، جہاں اس نے اسے چھوڑا تھا۔ رسالہ جیسے بکھرا ہوا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وزیر خان نے گھبراہٹ میں اسے پھینکا ہوگا۔
اس نے دونوں لڑکوں کو دیکھا۔ وزیر خان نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی تھی۔ سعید خان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی سرخی تھی۔ لگتا تھا، وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ "میں لکڑیاں کاٹ لایا ہوں میم صاب" اس نے کہا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔
"شکریہ سعید خان۔"
"اب میں جاؤں؟"
"میں نے چائے کے لئے روکا تھا تمہیں۔"
"دل نہیں چاہ رہا ہے چائے کا۔"
"چلو ٹھیک ہے۔" اسٹیلا نے کہا۔ وہ اٹھ کر جانے لگا تو اسٹیلا نے اسے پکارا "سنو سعید خان۔"
سعید خان نے پلٹ کر اسے دیکھا "جی میم صاب۔"
"وہ مجھے کچھ چیزیں منگانی ہیں شہر سے۔"
"ابھی...؟ اسی وقت؟"
"نہیں۔ کھانے کے بعد چلے جانا۔"
وزیر خان کو خیال آیا کہ اس میں کچھ پیسے بچ بھی سکتے ہیں۔
اس نے جلدی سے کہا "میں چلا جاؤں گا میم صاب۔"
"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ میرے پاس کچھ کام بھی نہیں ہے۔" سعید خان بولا۔ ایک وقت تھا کہ اس قسم کی صورتِ حال میں وہ کوشش کرتا تھا کہ خود بازار چلا جائے۔ صرف میم صاب کے ساتھ اکیلا رہنے سے بچنے کے لئے اور آج وہ چاہ رہا تھا کہ وزیر خان بازار چلا جائے۔ صرف اس لئے کہ وہ اسے میم صاب کے پاس اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔
"نہیں، وزیر خان نہیں جا سکتا۔ اس سے مجھے کام ہے۔" اسٹیلا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
"لیکن میم صاب، میرا کام" سعید خان نے احتجاج کیا۔
"تمہیں میرے حکم پر چلنا ہوگا۔ یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے کہ کس وقت کس سے کیا کام لینا ہے۔" اسٹیلا کا لہجہ سخت ہو گیا۔
"جو حکم میم صاب" سعید خان نے مری مری آواز میں کہا۔ پھر پوچھا "اب میں جاؤں؟"
"ہاں جاؤ۔ کھانے کے بعد بازار چلے جانا۔"
"میں بھی جاؤں میم صاب؟" وزیر خان نے پوچھا۔
"تم بیٹھو۔ چائے پی کر جانا۔"
سعید خان چلا گیا۔ اسٹیلا کچن میں چلی گئی۔ اس نے وزیر خان کے لئے چائے بنائی۔ اس دوران اس نے کھانے کے لئے سینڈوچ بھی بنا لئے۔ وزیر خان کو چائے کی پیالی تھما کر اس نے اپنے لئے ایک جام بنایا۔ پھر وہ وزیر خان کی طرف متوجہ ہوئی "تم بازار کیوں جانا چاہتے تھے؟" اس نے کڑے لہجے میں پوچھا۔
وزیر خان کا چہرہ تمتمانے لگا۔ وہ کھسیانی ہوئی ہنسی ہنسنے لگا "وہ تو میرا حق ہے۔ آپ بھی دیکھ رہی ہیں کہ میری ترکیب کام دکھا رہی ہے۔"
"تمہیں اس کا صلہ مل جائے گا۔"
"مجھے یقین ہے کہ آپ بے انصاف نہیں ہیں" وزیر خان عیاری سے مسکرایا۔
چائے پینے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور باہر چلا گیا۔ اسٹیلا نے اسے روکا بھی نہیں۔ وہ کاؤچ پر بیٹھ کر اپنے جام سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی رہی۔ ڈیڑھ بجے اسٹیلا نے ان دونوں کو آواز دے کر بلایا تاکہ وہ کھانا کھا لیں۔ کھانے کے بعد اس نے خریداری کی فہرست اور پیسے سعید خان کو دیے "جاؤ، تم یہ چیزیں خرید لاؤ" اس نے کہا۔
سعید خان نے بڑی بے دلی سے دونوں چیزیں جیب میں رکھیں۔
"بہتر میم صاب۔"
وزیر خان بھی ساتھ ہی باہر جانے لگا تو اسٹیلا نے اسے روک لیا "تم رک جاؤ وزیر خان۔ تم سے ایک کام ہے مجھے۔"
اس پر سعید خان کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدم ٹھٹکے۔ اس نے پلٹ کر باری باری وزیر خان اور اسٹیلا کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں شکایت اور بے بسی تھی۔ وہ چند لمحے ان دونوں کو

دیکھتا رہا۔ پھر چلا گیا۔
اس کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔ اسٹیلا اپنے جام سے گھونٹ لیتی رہی۔ وزیر خان کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ قالین پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ آج اسے وہ سب ملنے والا ہے۔ اسے اپنا دل حلق میں دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔
اسٹیلا نے جام خالی کر کے رکھا تو وزیر خان نے لرزتے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بے تابانہ اسے چومنے لگا۔ اسٹیلا کے لئے یہ سب کچھ خلاف توقع نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے غصے اور نفرت سے وزیر خان کو ایک طرف دھکیل دیا "یہ کیا بدتمیزی ہے" وہ غرائی۔
وزیر خان نے حیرت سے اسے دیکھا "آپ نے کہا تھا کہ مجھے صلہ دیں گی۔"
"ہاں۔ مگر میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ یہ تو میں نے تمہیں ابتدا میں ہی کہہ دیا تھا کہ یہ خیال دل سے نکال دو۔"
"تو پھر؟"
اسٹیلا نے اٹھ کر اپنا پرس اٹھایا اور اس میں سے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے "یہ لو اور اب جاؤ۔"
وزیر خان نوٹوں کو دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے نوٹ جیب میں رکھ لئے "تو اب میں جاؤں؟"
"ہاں جاؤ اور گھوڑوں کے درمیان کام کرو جا کر" اسٹیلا نے زہریلے لہجے میں کہا۔
"جو حکم میم صاب" وزیر خان نے کہا اور باہر کی طرف چل دیا۔
وزیر خان اصطبل میں جانے کی بجائے باہری دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ سعید خان کے بازار بھیجے جانے پر اس نے ایک توقع قائم کر لی تھی۔ پھر رسالہ دیکھ کر بھی اس نے خود کو بھڑکا لیا تھا۔ لیکن اب میم صاب نے اسے آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تھا۔ اسے توہین کا احساس ہونے لگا۔ وہ اس حد تک بھڑکا کہ اس نے سوچا اندر جا کر زبردستی......
مگر پھر اسے میم صاب کا آخری جملہ یاد آ گیا۔ وہ قدرتاً معقولیت سے سوچنے لگا۔ آدمی گھوڑوں کے درمیان رہے تو بدبودار تو ہو گا۔ یہ میموں اور صاب لوگوں کے تو نخرے ہوتے ہی ہیں۔ اسے اس بات کا بھی خیال رکھنا ہو گا۔

○☆○

اب اسٹیلا پہلا وار کرنے کے لئے تیار تھی!
وہ اسٹیج تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اس نے اپنا خالی جام قالین پر ایک طرف لڑھکا دیا۔ پھر اس نے ایک اور جام بنایا اور وہیں بیٹھ کر مزے لے لے کر گھونٹ گھونٹ پیتی رہی۔ خالی جام اس کے سامنے لڑھکا ہوا تھا۔ جس جام سے وہ پی رہی تھی' اسے اس نے پوری طرح خالی نہیں کیا۔ کچھ مشروب باقی تھا کہ جام اس نے قالین پر رکھ دیا۔ بلکہ ہوائے اب بھی وہیں پڑا تھا' جہاں وزیر خان نے اسے رکھا تھا۔ اس نے اسے اٹھایا' ایک خاص ورق نکالا اور پھر رسالے کو الٹا کر کے رکھ دیا۔ اب اسے دیکھ کر کوئی یہی سمجھتا کہ کسی نے رسالہ دیکھتے دیکھتے کسی کام سے اٹھتے ہوئے اسے اس طرح رکھ دیا ہے۔ تاکہ زیر نظر صفحہ تلاش نہ کرنا پڑے۔
اسٹیج سیٹ کرنے کے بعد وہ اوپری منزل پر اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ اب اسے بس آنے والے کا انتظار کرنا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ گھڑی میں وقت دیکھا تو اندازہ ہوا کہ سعید خان کو گئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا تھا۔ یہ طے تھا کہ سعید خان بہت زیادہ تیز رفتاری دکھائے گا۔ وہ زیادہ دیر کاٹیج سے دور رہنا نہیں چاہے گا۔
اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ سعید خان سامان کا تھیلا اٹھائے آتا دکھائی دیا۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ سعید خان متلاشی نگاہوں سے اصطبل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اسٹیلا نے اس کے چہرے پر اطمینان کا تاثر ابھرتے دیکھا۔
اسٹیلا زیر لب مسکرائی۔ وہ جانتی تھی کہ جب وہ نیچے پہنچے گی تو سعید خان کے چہرے پر اس سے بالکل مختلف تاثر ہو گا۔
سعید خان کاٹیج کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسٹیلا کے اندازے کے مطابق وہ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو اسٹیلا نے سیڑھیاں اترنا شروع کیا۔ نیچے پہنچتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کام اس کی توقع کے مطابق ہوا ہے۔ سعید خان نے کمرے پر ایک نظر ڈالی ہو گی اور دہل گیا ہو گا۔ ایک طرف لڑھکا ہوا خالی جام' دوسرا جام جس میں مشروب باقی تھا۔ پلٹ کر رکھا گیا رسالہ۔ اس نے بے ساختہ رسالہ اٹھا کر اس ورق کو دیکھا ہو گا۔ اور رسالہ اس کے ہاتھ میں ہی تھا کہ اسے اسٹیلا کے قدموں کی چاپ سنائی دی ہو گی۔ اس نے گڑبڑا کر رسالہ ایک طرف پھینک دیا ہو گا۔
رسالہ اب مختلف جگہ پر رکھا ہوا تھا۔ سعید خان قالین کے بالکل پاس سر جھکائے کھڑا تھا۔ سامان کا تھیلا پاس ہی فرش پر رکھا تھا "لے آئے سامان؟" اسٹیلا نے پوچھا۔
سعید خان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب وحشت تھی "جی میم صاب" اس نے مری مری آواز میں کہا۔
اسٹیلا اس کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے تھیلے کا منہ کھول کر دیکھا اور طمانیت سے سر ہلایا "ٹھیک ہے۔"
سعید خان نے جیب سے پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھائے "یہ پیسے بچے ہیں میم صاب۔"
اسٹیلا نے ہاتھ بڑھا کر رقم لے لی۔ وہ پچاس سے زیادہ روپے تھے۔ اس نے سعید خان کو غور سے دیکھا' جس کے چہرے پر اب مایوسی نظر آ رہی تھی۔ یقیناً اسے توقع تھی کہ وہ پوری رقم نہ سہی' کچھ نہ کچھ اسے ضرور دے گی "شکریہ سعید خان" اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا "بس اب تم جاؤ۔"
لیکن سعید خان وہیں کھڑا رہا۔ اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی "کیا بات ہے سعید خان۔ میرا خیال تھا کہ آج تمہیں کام بہت

ہے" اسٹیلا کا لہجہ ذرا سخت ہو گیا۔
"جی کام تو بہت ہے۔"
"تو پھر جاؤ۔ کام کرو" اسٹیلا نے بے رخی سے کہا۔
"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میم صاب۔ ایک بات پوچھنی تھی۔"
"کیا بات ہے۔ اب تم بھی پوچھ گچھ کرو گے مجھ سے" اسٹیلا نے دانستہ طور پر لہجہ اور سخت کر لیا۔
سعید خان بری طرح نروس ہو گیا۔ لیکن بات ایسی تھی کہ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے اپنا حوصلہ مجتمع کرتے ہوئے کہا "وزیر خان..... میرا مطلب ہے میم صاب کہ وزیر خان یہاں آیا تھا؟" کہتے ہوئے اس کی نظریں خود بخود لڑھکے ہوئے جام کی طرف اٹھ گئیں۔
"ہاں' آیا تو تھا۔"
"تو..... تو کیا اس نے شراب بھی پی؟"
"تم ہندوستانیوں کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہے" اسٹیلا نے نفرت سے کہا "تم لوگوں کو ذرا منہ لگایا جائے تو سر چڑھ جاتے ہو۔ مجھے ابتدا ہی میں تمہیں روک دینا چاہئے تھا۔ مجھے کہنا چاہئے تھا کہ تمہیں مجھ سے پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔ اتنا ہی تجسس ہے تو جا کر وزیر خان سے پوچھ لو۔ مگر میں نے اخلاقاً تمہیں جواب دے دیا تو اب تم بدتمیزی پر اتر آئے ہو۔ اس سوال کا جواب دوں گی تو تمہاری بدتمیزی بڑھ جائے گی۔ تم اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہو گے۔ اس لئے اسی وقت تمہارا منہ بند کرنا ضروری ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ اور جو کچھ پوچھنا ہے' وزیر خان سے پوچھو۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے اپنی اوقات یاد رکھا کرو۔"
سعید خان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ بغیر ایک لفظ کہے وہ پلٹا اور باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اسٹیلا مسکرائی۔ اسے اندازہ تھا کہ پہلا وار ہی کافی مؤثر ثابت ہوا ہے۔

○☆○

سعید خان کام شروع کرنے کی بجائے سیدھا وزیر خان کی طرف گیا۔ وزیر خان اصطبل کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا "بازار سے آ گئے یارا؟" اس نے سعید خان کو دیکھتے ہی پوچھا۔
"ہاں" سعید خان نے جواب دیا۔ پھر پوچھا "میم صاب کو تم سے کیا کام کرانا تھا؟"
"میم صاب کو؟ مجھ سے؟ کام؟" وزیر خان حیران نظر آنے لگا۔
"ہاں۔ جب تم میری جگہ بازار جانا چاہ رہے تھے تو میم صاب نے کہا تھا کہ تم سے کوئی اور کام کرانا ہے۔"
وزیر خان کی آنکھیں چمکنے لگیں "اچھا وہ" اس نے شرارت بھرے لہجے میں کہا "معاف کرنا یارا' بس اس سلسلے میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔"
"کیوں نہیں بتا سکتے؟" سعید خان نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔
"میم صاب نے منع کیا تھا۔"
سعید خان نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا۔ لیکن مزید پوچھ کچھ نہیں کی۔ سعید خان کچھ دیر وزیر خان کے پاس بیٹھا رہا۔ وزیر خان کو ایک غیر معمولی بات محسوس ہوئی۔ سعید خان بغیر کسی معقول وجہ کے اس سے قریب۔ بہت قریب ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیوں؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ تاہم ردعمل کے طور پر وہ اس سے کھنچ گیا۔
بالآخر سعید خان کو اٹھنا پڑ گیا۔ لیکن وہ مطمئن نہیں تھا۔ وہ وزیر خان کا منہ نہیں سونگھ پایا تھا۔ لیکن وزیر خان جس طرح اس سے بچ رہا تھا' اس سے اس کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہو رہے تھے۔ بہرکیف وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔
شام کو اسٹیلا نے اسے کاٹیج میں بلایا "یہ سب اٹھا کر ادھر رکھ دو" اس نے اشارے سے بتایا۔
سعید خان نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔ وہ واپس جا رہا تھا کہ اسٹیلا نے اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔
"مجھے افسوس ہے سعید خان کہ مجھے تم سے سخت گفتگو کرنی پڑی" اسٹیلا نے کہا۔
"کوئی بات نہیں میم صاب۔"
اسٹیلا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں "لیکن تم نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ تمہیں حد سے نہیں بڑھنا چاہئے تھا۔"
"میں یہ بات سمجھتا ہوں میم صاب۔"
"مجھے دلی افسوس ہے۔"
"اس کی ضرورت نہیں۔ میم صاب۔ آپ مالک ہیں اور میں نوکر ہوں۔"
"تم جانتے ہو' میں نے کبھی ایسا نہیں سمجھا۔ میں نے ہمیشہ تم سے دوستانہ تعلق رکھنے کی کوشش کی۔"
"مالک اور نوکر میں دوستی نہیں ہوتی میم صاب" سعید خان نے خشک لہجے میں کہا۔
"لیکن تمہارا بھائی وزیر خان یہ نہیں سمجھتا۔"
"ایسے نوکر بھی ہوتے ہیں۔ وزیر خان کم ظرف آدمی ہے میم صاب۔ آگے آپ جانیں۔"
"میں جانتی ہوں۔ اسی لئے میں نے اسے تمہارے جتنی اہمیت کبھی نہیں دی" اسٹیلا کہتے کہتے رکی۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی "لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم وزیر خان کے معاملے میں اتنے جذباتی کیوں ہو جاتے ہو۔"
"کیا کروں۔ اس سے رشتہ ہی ایسا ہے" سعید خان نے گہری سانس لے کر کہا۔
"تم جانتے ہو کہ وہ کم ظرف ہے۔ اس کا کردار بھی ٹھیک نہیں۔ پھر کیوں اپنی بہن کی شادی اس سے کرتے ہو۔"
"آپ نہیں سمجھیں گی میم صاب۔ یہاں کے رسم و رواج سے واقف جو نہیں ہیں۔ اب رشتہ ختم ہو گا تو میری بہن کی بدنامی

ہوگی۔ اور جہاں تک کردار کا تعلق ہے تو اتنا برا بھی نہیں۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تمہیں اندازہ نہیں کہ وزیر خان مجھ سے کس طرح کے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے۔"

سعید خان کا چہرہ تمتمانے لگا "مجھے اندازہ ہے۔ اور میری آپ سے التجا ہے کہ اسے منہ نہ لگائیں۔ وہ آپ کے لئے بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔"

"تم میرے نہیں اپنے نقصان کی فکر کرو" اسٹیلا نے تیز لہجے میں کہا "تم یہ نہیں سوچتے کہ میں کتنی تنہا ہوں۔ اسی لئے میں نے تم سے دوستی کرنی چاہی تھی۔ لیکن تم نے مجھے مایوس کیا" اس نے کچھ توقف کیا جیسے اسے اپنی بات پوری طرح سمجھنے کی مہلت دے رہی ہو "لیکن تم نے مجھے مایوس کیا" اس نے دہرایا "اچھی بات ہے۔ وزیر خان مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔ مگر وہ مجھ میں دلچسپی لیتا ہے۔ مجھ سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔ اب میں تو یہی سوچوں گی کہ کچھ بھی نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہی ہے۔"

"میری التجا ہے کہ آپ ایسا نہ کریں۔"

اسٹیلا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنی تیز لہجے میں کہا "صرف تم ہی مجھے روک سکتے ہو۔ کیسے.... یہ بھی تم جانتے ہو۔"

سعید خان کی نظریں جھک گئیں۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اس کے انکار کی غمازی کر رہے تھے۔

"وزیر خان.... تمہارا ہونے والا بہنوئی کیسا بھی سہی' ایک لحاظ سے تم سے بہتر ہے" اسٹیلا نے زہریلے لہجے میں کہا "وہ غیر مشروط طور پر میرا غلام بننا چاہتا ہے۔ میرے اشارے پر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے' کچھ بھی چھوڑ سکتا ہے" یہ کہتے ہوئے اسٹیلا کا لہجہ معنی خیز ہو گیا "ویسے ابھی تک تو میں نے اسے منہ نہیں لگایا ہے۔"

سعید خان کی آنکھوں میں برہمی چمکی۔ لیکن وہ اب بھی خاموش رہا۔

"پتا نہیں' میں تم سے یہ باتیں کیوں کر رہی ہوں۔ خیر' تم جا سکتے ہو" اسٹیلا نے جھنجلا کر کہا۔

"بہتر میم صاحب" سعید خان نے کہا اور سر جھکائے ہوئے چلا گیا۔

اسٹیلا کو مایوسی ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ پہلے ہی وار میں سعید خان کی مزاحمت دم توڑ جائے گی۔ مگر وہ زیادہ سخت جان ثابت ہوا تھا۔ پھر بھی فکرمند ہونے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے ترکش میں ابھی کئی تیر باقی تھے اور وہ جانتی تھی کہ کب اسے کون سا تیر چلانا ہے۔

○☆○

سعید خان اس روز بہت پریشان تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بات آگے بھی جا سکتی ہے۔ میم کو اس کی کمزوری کا احساس ہو گیا تھا اور یہ طے تھا کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے بغیر نہیں مانے گی۔

وہ اس سلسلے میں سوچتا رہا اور اسے وزیر خان پر غصہ آتا رہا۔ یہ سب کچھ وزیر خان کی کمزوری ہی کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ اس نے اس میم کی وجہ سے اس کی دوستی کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ سعید خان کو افسوس تھا کہ وزیر خان اتنا کم عقل ثابت ہوا ہے۔

وہ سوچتا رہا کہ اس مسئلے کا کوئی حل بھی ہے۔ اب تک کی صورت حال تو یہ تھی کہ اس کی وزیر خان کی دوستی تک میں فرق آ گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہنے لگے تھے۔ دونوں ایک دوسرے پر شک کرتے تھے۔ اب سعید خان کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ اتنی دور سے آ کر کسی اجنبی ملک پر حکومت کرنا کتنا مشکل تھا لیکن انگریزوں نے اسے کتنا آسان بنا دیا۔ اس سلسلے میں انگریزوں کا کیا طریق کار تھا' اس کا اندازہ اسٹیلا کو دیکھ کر ہو رہا تھا۔

بالآخر سعید خان کو ایک حل سوجھ ہی گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وزیر خان نے بھی زمین خرید لی ہے۔ مالی معاملات بہت بہتر ہو گئے تھے۔ مقام اور مرتبے کے اعتبار سے دونوں خاندان دیکھتے ہی دیکھتے بلند ہو گئے تھے اور یہ انگریزوں کی... اسٹیلا اور ہیری رچرڈسن کی مہربانی تھی۔ تو اب ریشم کی شادی میں کیا قباحت تھی۔ یہ خیال آتے ہی سعید خان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ واقعی... یہ تو سادہ سی بات ہے۔ فطری بات ہے۔ ریشم کی شادی وزیر خان سے ہو جائے۔ اس کے بعد وزیر خان کچھ بھی کرتا رہے اسے کوئی پروا نہیں ہو گی۔ شادی ہو گی تو ریشم کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔ ابھی تو وہ بے چاری معلق ہے۔ شادی کے بعد تو ویسے بھی سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

سعید خان کمرے سے نکلا اور باورچی خانے میں ماں کے پاس چلا گیا "کیا بات ہے' بھوک لگ رہی ہے؟" ماں نے پوچھا۔

"نہیں ماں۔ ایک ضروری بات کرنی ہے مجھے۔"

"کیا بات ہے پتر؟" ماں نے تشویش سے اسے دیکھا۔

"کوئی خاص بات نہیں ماں۔ بس ریشم کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ریشم کے بارے میں؟"

"ہاں ماں۔ اب دیر کیسی۔ اس کی شادی بس کر دینی چاہئے۔ اب تو اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس اور وزیر خان بھی زمین دار بن گیا ہے۔"

"کہتا تو تو ٹھیک ہے۔"

"صرف یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا ماں۔ تمہیں کل ہی وزیر خان کے ہاں جانا ہے۔"

ماں ہچکچا رہی تھی "لیکن تیاری بھی تو کرنی ہے۔"

"تیاری کیسی۔ میں جانتا ہوں' زیور اور کپڑے تو تم بہت پہلے سے جمع کر رہی تھیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ کل جا کر بات کروں گی۔"

"صرف بات نہ کرنا۔ تاریخ بھی لے کر آنا۔ ہم ریشم کو کب تک بٹھائے رکھیں گے۔"

کیا تھا۔ وہ سو نہیں سکا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ وزیر خان سے نفرت کررہا تھا۔ وزیر خان صرف کم ظرف نہیں تھا۔ اس نے دوڑ کا احسان فراموش بھی ثابت کردیا تھا۔ لیکن رشتہ ایسا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ رات بھر سو نہ سکا۔ صبح وہ جلدی کالج چلا گیا۔ وہ وزیر خان کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ پھٹ پڑے گا اور بات اور خراب ہوجائے گی۔ اس کے لیے منافقت آسان نہیں تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وزیر خان کا سامنا تو اسے کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ ضروری تھا کہ وہ خود کو اس کے لیے تیار کرلے۔

کالج پہنچ کر اس نے کلہاڑی اٹھائی اور جنگل کی طرف چل دیا۔ اپنا غصہ درختوں پر اتارنے ہی میں عافیت تھی۔

وہ لکڑیوں کا گٹھر لے کر واپس آیا تو اسٹیلا بھی بیدار ہوچکی تھی اور وزیر خان بھی آچکا تھا۔ وزیر خان اصطبل کے کاموں میں مصروف تھا۔ ایک دو گھنٹے گزرے تو سعید خان کو یہ طمانیت خیز احساس ہوا کہ وزیر خان بھی اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ وہ بھی اس سے گریزاں ہے۔

اس روز وزیر خان اپنے معمول کے مطابق گھوڑے نکال کر نہیں لایا۔ اسٹیلا رائیڈنگ کے لیے تیار ہوکر آئی تو اسے گھوڑے کہیں نظر نہیں آئے۔ اس نے وزیر خان کو پکارا "ابھی آیا میم صاب" اصطبل سے وزیر خان کی آواز آئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گھوڑے لے کر چلا آیا "آج کوئی اور جگہ دکھاؤ مجھے" اسٹیلا نے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"ضرور میم صاب۔ چلیں آپ گھوڑے پر سوار ہوں۔"

وہ دونوں چلے گئے۔ سعید خان کے اندر پھر ایک جہنم دہکنے لگا۔ خاصے غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے میم صاب سے بدظن کرنا ہوگا۔

اس شام اسٹیلا رچرڈسن کو اس وقت بہت حیرت ہوئی' جب سعید خان نے معمول سے پہلے چھٹی کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اسے یہ بتانے کے لیے کالج میں آیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اسٹیلا نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا "تم عام طور پر چھ بجے سے پہلے تو نہیں جاتے اور ابھی تو پانچ بھی نہیں بجے ہیں۔"

"کوئی خاص بات نہیں میم صاب۔ اب کوئی کام بھی تو نہیں ہے۔"

اسٹیلا کا ذہن اس کے لیے کوئی کام سوچنے میں مصروف ہوگیا۔ لیکن سعید خان نے اسے سوچنے کی مہلت نہیں دی۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔ سلام میم صاب۔"

اسٹیلا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ چلا گیا۔ اسٹیلا سوچتی رہی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ ابھی چند روز پہلے تو سعید خان اسے وزیر خان کے ساتھ تنہا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اور آج وہ خود انہیں تنہائی فراہم کررہا تھا۔ اسٹیلا کو یقین ہوگیا کہ سعید خان اپنے گھر ہرگز نہیں گیا ہوگا۔ بلکہ وہ کہیں چھپ کر اس پر نظر رکھے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ آج وہ اس پر کاری وار کرسکتی ہے۔

اگر اس کا اندازہ درست تھا تو لوہا گرم کرنے کے لیے سعید خان کو انتظار کرانا ضروری تھا۔

اسٹیلا کالج سے نکلی اور اصطبل کی طرف چل دی۔ وزیر خان گھوڑوں کے لیے دانے پانی کا بندوبست کررہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب وہ جانے والا ہے۔ اس نے اسٹیلا کو مستفسرانہ نظروں سے دیکھا "کیا بات ہے میم صاب؟"

اسٹیلا اسے دیکھ کر مسکرائی "تم صلے کی بات کرتے رہتے ہو نا بیٹے۔"

وزیر خان کی آنکھوں میں امید چمکی۔

"سوچتی ہوں' تمہیں صلہ ملنا چاہیے۔"

"مجھے یقین تھا میم صاب کہ آپ بے انصافی نہیں کریں گی۔"

"آج تم دیر تک رک سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں میم صاب۔"

"تو پھر رک جاؤ۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد کالج میں چلے آنا۔ مگر ایک شرط ہے۔"

"حکم کریں میم صاب جی۔"

"جلد بازی نہ کرنا۔ صلہ قسطوں میں ملے گا۔ تمہیں اپنے آپ پر قابو رکھنا ہوگا۔ میرے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔ حکم عدولی کی اور میری مقرر کردہ حد سے آگے بڑھے تو کبھی کچھ نہیں ملے گا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو۔"

"میں سمجھ گیا میم صاب۔"

"بس تو سات بجے کالج میں آجانا۔"

اسٹیلا کالج میں واپس آگئی۔ وہ کیبنٹ کے پاس گئی' بوتل نکالی۔ لیکن کچھ سوچ کر بوتل واپس رکھ دی۔ آج خود کو ہوش میں رکھنا ضروری ہے۔ اس نے خود کو یاد دلایا۔ آج پینی بھی ہے تو صرف دکھانے کے لیے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کھیل خراب ہو۔

ادھر وزیر خان پر ہیجان طاری تھا۔ اس کے لیے تو ایک پل بھی صدی کے برابر تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسی وقت کالج میں جا گھستا۔ لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ بنتی ہوئی بات خراب ہو۔ وہ میم کی ہر ہدایت پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے شکایت کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

وقت سست رفتاری سے گزرتا رہا۔ وزیر خان اترتی ہوئی دھوپ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ وہ موسم گرما تھا۔ سورج سات بجے کے بعد غروب ہوتا تھا۔ وزیر خان مغربی افق میں لڑھکتی ہوئی نارنجی گیند کو دیکھتا رہا۔ اس کا بس چلتا تو اس گیند کو سامنے والی پہاڑی چوٹی سے نیچے دھکیل دیتا۔

بالآخر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے قدم کالج کی طرف اٹھ رہے تھے۔

○☆○

سعید خان اپنے سوچے ہوئے پروگرام پر عمل کررہا تھا۔ کالج سے وہ سیدھا گھر گیا۔ نہا دھو کر اس نے کپڑے بدلے' کھانا کھایا اور گھر سے نکل آیا۔ گاؤں کے باہر وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں کھڑا ہوگیا' جہاں سے وہ گاؤں میں جانے والوں کو دیکھ سکتا تھا۔ مگر وہ خود ان کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔

اسے وزیر خان کی آمد کا انتظار تھا اور وہ جانتا تھا کہ وزیر خان اب کسی بھی وقت آتا نظر آجائے گا۔

لیکن اس کی توقع پوری نہیں ہوئی۔ اس کے اندازے کے مطابق وزیر خان کو آدھے گھنٹے سے زیادہ کی تاخیر ہوگئی تو وہ بے چین ہوگیا۔ اسے بدترین اندیشے ستانے لگے۔ وہ سوچنے لگا کہ اس سے حماقت سرزد ہوئی ہے۔ سچ ہے کہ جذباتیت کبھی انسان کو درست فیصلہ نہیں کرنے دیتی۔ یہ فیصلہ تو اس نے درست کیا تھا کہ میم صاب سے مدد لینی ہے۔ لیکن وہ انہیں چھوڑ کر وقت سے پہلے نکل آیا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ اور اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اس غلط فیصلے نے تو شاید صورت حال کو اور خراب کردیا تھا۔

اس کا اضطراب اتنا بڑھا کہ وہ جھنڈ سے نکل آیا اور کالج کی سمت چل دیا۔ کچھ دور جا کر اسے خیال آیا کہ اگر اس وقت آتے ہوئے وزیر خان سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی تو کیا ہوگا۔ وہ کیا کہے گا کہ کہاں جارہا ہے اور کیوں جارہا ہے۔ یہ امکان بھی موجود تھا کہ وزیر خان اس کے ساتھ لگ لے گا۔

یہ سب کچھ اس نے سوچا۔ مگر اضطراب ایسا تھا کہ اس کے بڑھتے ہوئے قدم رکے بھی نہیں۔ ہاں وہ وزیر خان کو دینے کے لیے مناسب جواب سوچتا رہا۔ وہ جھوٹ گھڑتا اور خود ہی مسترد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ کالج کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے قدم بے اختیار باغ کی طرف اٹھ گئے۔ یہ بھی محفوظ جگہ تھی۔ وہ رات بھی نہیں تھا اور باغ کو کالج سے دیکھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وہاں پہنچ کر سعید خان نے اطمینان کی سانس لی۔ یہ بہت بڑی بات تھی کہ راستے میں اس کا وزیر خان سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ سوچتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس بات کا ایک تشویش ناک پہلو بھی ہے۔ سوال یہ تھا کہ وزیر خان اب تک یہاں کیوں ہے اور کیا کررہا ہے۔

یہ خیال آتے ہی اس کا اضطراب دوچند ہوگیا۔ سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سوا سات بجے ہیں۔ اس نے کالج کی طرف دیکھا۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ لیکن صاف نظر آرہا تھا کہ روشنی بھی ہے۔

وہاں کیا ہورہا ہے؟ یہ سوال سعید خان کے دل میں خنجر کی طرح اتر گیا۔ اس کا جواب بہت آسان تھا۔ وہ خود جا کر دیکھ سکتا تھا۔ لیکن کیا یہ مناسب ہے۔ سعید خان سوچتا اور الجھتا رہا کہ کیا کرے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

○☆○

کالج میں جو کچھ ہورہا تھا' وہ اسٹیلا رچرڈسن کے لیے پُرلطف کسی اعتبار سے بھی نہیں تھا۔ وہ شطرنج کی ایک بے لطف بازی تھی جو وہ ایک اہم بازی جیتنے کی خاطر بے دلی سے کھیل رہی تھی۔ اسے کسی خاص نتیجے کی توقع نہیں تھی۔ وزیر خان کے آنے پر اس نے اپنے لیے ایک جام بنایا تھا۔ پھر وہ وقفے وقفے سے چھوٹا سا ایک گھونٹ لیتی۔ وزیر خان کو آئے ہوئے آدھا گھنٹا ہوچکا تھا۔ مگر جام ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اسے ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دوسرے جام کی نوبت آئے۔

یہ بات اس کے لیے باعث اطمینان تھی کہ وزیر خان اس کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔ اس نے جس حد تک اسے اجازت دی تھی' وہ اس سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ اس سب کے دوران اسٹیلا تصور میں سعید خان کو دیکھ رہی تھی جو چھپ کر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ہر لمحے وہ اس کے ردعمل کی توقع کررہی تھی۔ اس کا اشتعال میں آنا فطری تھا۔ لیکن ہر لمحے اسے مایوسی ہوئی۔ سعید خان ابھی تک حرکت میں نہیں آیا تھا۔

وہ سعید خان کو اور زیادہ مشتعل کرنے کے چکر میں وزیر خان کو ڈھیل دیتی گئی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ خود اسے بھی اس کھیل میں لطف آنے لگا ہے۔ یہاں بے دلی سے کھیل جانے والی دکھاوے کی وہ بازی جان دار ہوگئی تھی۔ اس وقت احساس ہوا' جب وہ بازی ہار چکی تھی۔ ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ یہ کھیل رائیگاں ثابت ہوا ہے۔ اس کا مقصد پورا نہیں ہوسکا تھا۔ کیوں؟ اس کی ایک ہی وجہ ہوسکتی تھی۔ اور وہ یہ کہ اس کا پہلا اندازہ ہی غلط تھا۔ سعید خان کہیں وہیں موجود ہی نہیں تھا۔ ہوتا تو اس تماشے کا خاموش تماشائی ہرگز نہ رہتا۔

کیف و انبساط کی ایک لہر تھی' جو ایک پل میں اس کے وجود سے گزر گئی تھی۔ اور اب وہ بے کیف تھی۔ خمار سے ملتی جلتی کسی کیفیت سے دوچار۔ اس نے بدمزگی سے وزیر خان کو دیکھا۔ لیکن اسی لیے کسی نامعلوم حس نے اسے بتایا کہ اس کے ساتھ بے زاری کا رویہ مناسب نہیں ہے۔ وہ ترپ کا وہ پتا ہے' جسے ابھی اس کے کام آنا ہے۔ وزیر خان کی افادیت ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ بڑھ گئی تھی۔ اس نے مسکرا کر وزیر خان کو دیکھا اور نرم لہجے میں پوچھا "اب تو تم خوش ہو۔"

"جی اسٹیلا میم صاب۔"

اسٹیلا کو سعید خان کی بات یاد آگئی۔ سعید خان نے وزیر خان کے بارے میں کہا تھا کہ وہ کم ظرف ہے۔ اور اس وقت وزیر خان نے اس بات کو درست ثابت کردیا تھا۔ اسی لیے تو اس نے اسے اسٹیلا میم صاب کہا تھا۔ اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ یہ شخص تھوڑے ہی دنوں میں اسے بدتمیزی سے اسٹیلا کہہ کر پکارنے لگے گا۔

"ایک بات یاد رکھنا وزیر خان" اس نے سرد لہجے میں کہا "مجھے خود سری اور بدتمیزی پسند نہیں ہے۔ اور تم میری حکم عدولی بھی کبھی نہ کرنا۔"

"آپ بے فکر رہیں اسٹیلا میم صاب۔"

"بس اب تم جاؤ۔"
"لیکن میم صاب۔"
"تم تو پہلی بات ابھی ہی بھول گئے۔ میں نے کہا ہے ابھی تمہیں صرف تعمیل کیا کرو۔" اسٹیلا نے سخت لہجے میں کہا۔
"سلام میم صاب" وزیر خان نے کہا اور رخصت ہو گیا۔
اس کے جانے کے بعد اسٹیلا سوچتی رہی کہ کچھ بھی سہی، اتنے دنوں میں پہلی بار اسے تشنگی کا احساس ہوا ہے۔ مگر اس وقت اسے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ چند منٹ بعد یہ تشنگی اس کے کتنے کام آئے گی۔
اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا، اپنے لیے جام بنایا اور قالین پر نیم دراز ہو گئی۔ گزرے ہوئے لمحوں کو اس وقت اس نے انجوائے نہیں کیا تھا۔ لیکن اب وہ انہیں زیادہ انجوائے کر سکتی تھی۔

O☆O

سعید خان کو باغ میں کھڑے کافی دیر ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی سوچ اور الجھ رہا تھا۔ اس کی قوت فیصلہ کام نہیں کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ دندناتا ہوا جائے اور کاٹیج میں جا گھسے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ یہ بڑا اقدام ہے تباہ کن ہو گا۔ وزیر خان کو وہ خوب جانتا تھا۔ یہ طے تھا کہ اس کے اس اقدام سے بات بالکل ہی بگڑ جائے گی۔ دوسری طرف میم صاب سے بھی کھلی دشمنی ہو جائے گی۔ جب کہ اسے میم صاب کی مدد کی ضرورت ہے۔
چنانچہ اسے زہر کے یہ گھونٹ پینے ہی تھے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اسے کتنی دیر انتظار کرنا ہو گا۔ کئی بار اس نے ارادہ کیا کہ جا کر جائزہ تو لے۔ مگر بلا وجہ خطرہ مول لینا بھی مناسب نہیں تھا۔ اب تک کا صبر بھی ضائع ہو جاتا۔ وزیر خان کا سامنا کرنا بے حد نامناسب تھا۔ پھر اسے ایک اور خیال نے چونکا دیا۔ یہ ضروری تو نہیں کہ وزیر خان کاٹیج میں موجود ہو۔ یہ بات تو اس نے خود ہی فرض کر لی تھی۔ اس بنیاد پر کہ اس نے وزیر خان کو گھر آتے نہیں دیکھا تھا۔ جب کہ یہ بھی ممکن تھا کہ وزیر خان گھر پہنچ چکا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی وقت سے کچھ پہلے کاٹیج سے نکل آیا ہو اور اس کے جھنڈ میں پہنچنے سے پہلے اپنے گھر پہنچ چکا ہو۔ اور ممکن ہے کہ وہ کاٹیج سے نکل کر گھر جانے کی بجائے کہیں اور چلا گیا ہو۔ تو اس صورت میں کیا وہ اپنے پہلے مفروضے کے تحت رات بھر یہاں کھڑا وزیر خان کے رخصت ہونے کا بے سود انتظار کرتا رہے گا۔ یہ تو حماقت ہو گی۔ کم از کم اسے وزیر خان کے کاٹیج میں موجود ہونے کی تصدیق تو کر ہی لینی چاہیے۔
اس خیال سے وہ باغ سے نکلنے ہی والا تھا کہ کاٹیج کا دروازہ کھلا۔ اس وقت تک اندھیرا ہو چکا تھا۔ لیکن وزیر خان کو پہچاننے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ دوبارہ درختوں کی اوٹ میں دبک گیا۔ وزیر خان کے جانے کے بعد بھی وہ کچھ دیر احتیاطاً وہیں کھڑا رہا۔ حالانکہ وزیر خان کے انداز سے یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ کسی کام کے لیے نکلا ہے اور واپس آئے گا۔ کچھ دیر بعد سعید خان باغ سے نکلا اور کاٹیج کی طرف چل دیا۔ چند لمحے بعد وہ کاٹیج کے بند دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

O☆O

اسٹیلا کی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ اس کے وجود میں طمانیت اور سرشاری لہرا رہی تھی۔ آنکھیں مندی جا رہی تھیں۔ اس نے جام خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ اس کیفیت میں مے نوشی بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ جب پیے بغیر ہی نشہ ہو رہا ہو تو پینے کی ضرورت کہاں رہ جاتی ہے۔ اس نے یونہی آنکھیں موند لیں۔ لمحوں میں اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔
دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس وقت کون آ سکتا ہے۔ اس نے سوچا۔ وزیر خان؟ یہ ناممکن نہیں تھا۔ وہ اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی "کون ہے؟" اس نے درشت لہجے میں پکارا۔
"میں ہوں میم صاب۔۔۔ سعید خان۔"
ایک لمحے کو اسٹیلا کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ سعید خان؟ یہ یہاں اس وقت کس لیے آیا ہے؟ کیا اس کا پہلا اندازہ درست تھا؟ کیا سعید خان یہاں موجود تھا؟ لیکن ایسا تھا تو اس نے مداخلت کیوں نہیں کی۔ اسٹیلا سوچتی رہی۔۔۔
"میم صاب، دروازہ کھولیں۔"
اسٹیلا چونکی اور اس نے خشک لہجے میں پوچھا "کیا بات ہے؟ کیوں آئے ہو تم؟"
"دروازہ تو کھولیں۔"
"میں اس وقت دروازہ نہیں کھولوں گی" اسٹیلا نے بے رخی سے کہا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وزیر خان کی دی ہوئی طمانیت کے زور پر وہ اس وقت سعید خان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کر سکتی ہے۔ یوں اسے جھکانے میں اور مدد ملے گی۔
"میم صاب، میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں" دروازے کے اس طرف سے سعید خان نے التجا کی "مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"
"کل بات کر لینا۔ اس وقت میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔"
"خدا کے لیے میم صاب۔ کل وزیر خان موجود ہو گا۔ بات ایسی ہے کہ میں اس کے سامنے نہیں کر سکتا۔"
"مگر یہ کون سا وقت ہے مجھے تنگ کرنے کا۔"
"میم صاب، ضروری نہ ہوتا تو میں کبھی نہ آتا" سعید خان اب گڑگڑا رہا تھا۔
اسٹیلا نے دروازہ کھول دیا۔ مگر اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں "آ جاؤ۔ مگر میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکوں گی۔"
سعید خان اندر آ گیا۔ وہ کھڑا ہچکچاتا رہا۔ اسٹیلا نے اسے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا تھا اور دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا "اب بولو بھی۔ کیا مسئلہ ہے۔" اسٹیلا نے سخت لہجے میں کہا۔
"ذاتی نوعیت کا مسئلہ ہے۔ لیکن آپ اسے حل کر سکتی ہیں۔"
"بتاؤ تو" اسٹیلا نے جھنجلا کر کہا۔
"وہ میم صاب جی۔۔۔ وزیر خان شادی کے معاملے میں ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے" سعید خان نے کہا۔
"شادی۔۔۔ کس کی شادی؟" اسٹیلا نے حیرت سے پوچھا۔
"اس کی اپنی شادی میم صاب جی۔۔۔ میری بہن کے ساتھ۔"
اسٹیلا کی آنکھیں چمکنے لگیں "اوہ تو یہ بات ہے۔ لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں۔ یہ تو تم لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے۔"
"آپ اسے مجبور کر سکتی ہیں۔"
"میں کیسے مجبور کر سکتی ہوں۔"
"آپ کا حکم وہ ٹال نہیں سکتا۔"
"تم ٹال سکتے ہو تو وہ کیوں نہیں ٹال سکتا" اسٹیلا نے سرد لہجے میں کہا۔
سعید خان کی نظریں جھک گئیں "مجھ پر احسان کر دیں میم صاب۔"
"مگر میں اسے مجبور کیسے کر سکتی ہوں؟"
"آپ اسے دھتکار دیں۔ اسے اپنی اوقات یاد آ جائے گی اور میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آپ اسے ملازمت سے نکال بھی سکتی ہیں۔"
"یہ تو ناممکن ہے۔ گھوڑوں کا خیال کون رکھے گا؟"
"اچھا، دھتکار تو سکتی ہیں اسے۔"
"لیکن میں ایسا کیوں کروں؟" اسٹیلا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا "میں تنہائی سے اکتائی ہوئی عورت ہوں۔ وہ تو میرے لیے ایک نعمت ہے۔ اسی وجہ سے تو میں نے تمہیں اہمیت دی تھی۔ مگر تم میری توقع پر پورے نہیں اترے ورنہ تو میں کبھی اسے منہ نہیں لگاتی۔"
سعید خان نے کچھ بھی نہیں کہا۔ بے بسی سے ٹکر ٹکر اسے دیکھتا رہا۔
"میں اگر اسے دھتکار بھی دوں تو ضروری نہیں کہ وہ شادی کر ہی لے۔"
سعید خان کی آنکھوں میں امید چمکی "مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔"
"تمہارے کہنے پر میں ایسا کر سکتی ہوں تمہارا مسئلہ حل ہو نہ ہو، یہ تمہارا دردِ سر ہے۔"
"میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا میم صاب" سعید خان نے پُرامید لہجے میں کہا۔
"لیکن مجھے اس کے بدلے کیا ملے گا؟" اسٹیلا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔
سعید خان کی آنکھیں پھر جھک گئیں "میں آپ کو کیا دے سکتا ہوں میم صاب۔"
"تم جانتے ہو کہ مجھے کیا چاہیے۔ اب دل چاہے تو سودا کر لو۔"
"میم صاب، یہ ممکن نہیں۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔"
"اس میں احسان فراموشی کہاں سے آ گئی؟"
"آپ نہیں سمجھیں۔ صاب کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ وہ اچھے آدمی ہیں۔ یہ ان کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"
اسٹیلا پر جھنجلاہٹ طاری ہو گئی "اچھی بات؟ بات اچھی بات کی ہو بھی نہیں رہی ہے۔ بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ تم بالغ آدمی ہو۔ یہ کس قسم کی گفتگو کر رہے ہو۔ مجھے تم لوگوں کی یہی بات تو بری لگتی ہے کہ تم لوگ بیک ورڈ ہو۔"
"مگر صاب نے ہمیشہ میرے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ مجھے عزت دی۔ میں ان کی عزت کی حفاظت کر سکتا ہوں، لٹیرا تو نہیں بن سکتا۔"
"کمال ہے" اسٹیلا نے اشتعل کہا۔ اس کی منطق نے اسے تنگ کر کے رکھ دیا تھا "فضول اور احمقانہ باتیں مت کرو" اب وہ بھڑک گئی تھی۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے اور اپنے سینے پر رکھ لیے "بچے مت بنو ڈارلنگ۔ اب بڑے ہو جاؤ" اس نے نرم لہجے میں کہا۔
سعید خان نے نرمی سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے "میں مجبور ہوں میم صاب۔ احسان فراموشی میرے خون میں ہی نہیں ہے۔"
"تب تو تم واقعی مجبور ہو" اسٹیلا نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں کہا "مگر میں بھی مجبور ہوں۔ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانا میری فطرت کے خلاف ہے۔"
اب سعید خان گنگ تھا۔ کچھ توقف کے بعد اسٹیلا نے کہا۔
"اب تک تو میں نے تمہارے ہونے والے بہنوئی کی بالکل حوصلہ افزائی نہیں کی ہے" اس کا لہجہ زہریلا تھا "مگر تمہاری دو ٹوک گفتگو کے بعد میں اس سلسلے میں غور ضرور کروں گی۔ امید ہے، تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"
سعید خان کا چہرہ فق ہو گیا "مم۔۔۔ میم۔۔۔ صص۔۔۔ صاب۔۔۔ مم۔۔۔"
"اب تم جا سکتے ہو" اسٹیلا نے سرد لہجے میں کہا "تم پہلے ہی میرا بہت وقت برباد کر چکے ہو۔"
سعید خان ہارے ہوئے جواری کی طرح دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

O☆O

اسٹیلا کے چند دن اس امید میں گزرتے رہے کہ اس کی دھمکی کارگر ثابت ہو گی اور سعید خان اس کے آگے سرنگوں ہو جائے گا۔ اسی طرح برسات کا موسم آ گیا لیکن سعید خان کے

رویے میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ بلکہ سعید خان پہلے سے زیادہ سمٹ گیا تھا۔ اب وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتا۔ وزیر خان سے بھی اس کی بات نہ ہوتی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کام پر آتا تو سلام کرتا اور پھر جاتے ہوئے سلام کرتا۔ درمیان میں سامنا بھی نہ ہوتا۔

آخر اسٹیلا کا ضبط جواب دے گیا۔

اس روز اس نے چائے بنائی اور ان دونوں کو اندر بلا لیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھے چائے کے گھونٹ لیتے رہے۔ اسٹیلا انہیں تولنے والی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ پھر اچانک اس نے کہا "وزیر خان آج تو میرا مچھلی کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"حکم کی دیر ہے میم صاب۔ آج شام کو مچھلی پکڑنے چلا جاؤں گا" وزیر خان کے لہجے میں مسرت تھی۔ اس دن کے بعد اسے میم صاب کی قربت نہیں ملی تھی۔ رابطے کے دوران کئی بار اس نے پیش قدمی کی تھی۔ لیکن میم صاب نے اسے روک دیا تھا۔ اب یہ تو کھلا اشارہ تھا۔

"میں ایک بات کہوں میم صاب؟" سعید خان نے پوچھا۔ اس کا لہجہ حشلانہ تھا۔

"کیا بات ہے سعید خان؟"

"یہ دو مہینے مچھلی کھانے اور پکڑنے کے نہیں ہوتے میم صاب۔"

"کیوں سعید خان؟"

"اس موسم میں مچھلی کا ذائقہ اچھا نہیں رہتا۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ مچھلی صحت کے لیے نقصان دہ ہو جاتی ہے۔"

"اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی" اسٹیلا نے کہا۔

اب تک وزیر خان خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ سعید خان اس کا بنا بنایا کھیل خراب کر رہا تھا۔ اس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا "سب بکواس ہے۔ مچھلی صحت کے لیے نقصان دہ کبھی نہیں ہوتی۔ ہاں بزرگوں نے اس عرصے میں مچھلی کے شکار کو روکنے کے لیے یہ کہانیاں گھڑی ہیں۔"

"ایسا ہے تب بھی یہ تو سچ ہے کہ اس موسم میں مچھلی کا شکار نہیں ہونا چاہیے" سعید خان نے تند لہجے میں کہا "یہ تو مچھلی کی نسل ختم کرنے کے برابر ہے۔"

"تم دونوں مت الجھو۔ میں اس سلسلے میں سوچوں گی" اسٹیلا نے کہا۔

چائے ختم کر کے وہ دونوں باہر چلے گئے۔ سعید خان بہت پریشان تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اگر آج اس نے اس معاملے کو یہیں نہیں روکا تو پھر کبھی بھی نہیں روک سکے گا۔ یہ مچھلی والا معاملہ تو خود اس کے ساتھ بھی ہو چکا تھا۔ اس کے اندر تو برائی کے خلاف مزاحمت تھی۔ اس لیے وہ بچ کر نکل آیا تھا۔ لیکن وزیر خان تو خود برائی کی طرف لپک رہا تھا۔ اس ایک موقع کے بعد تو شاید کچھ بھی نہ بچتا۔

اسٹیلا کا پہلا جملہ سنتے ہی جو اضطراب اس کے اندر مچلا تھا وہ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ بہت بے چین تھا۔ لیکن اس کیفیت میں بھی وہ سوچنے پر مجبور تھا۔ سوچنا یہ تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ جانتا تھا کہ میم اس سے کیا چاہتی ہے۔ وہ اس کی ضد اور مستقل مزاجی کا قائل ہو گیا تھا۔ عورت کی تنک مزاجی کے متعلق اس نے بہت کچھ سنا تھا اور وہ اس سے خائف بھی تھا۔ وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ جو کچھ وہ کر رہی تھی یا کرنے کی دھمکی دے رہی تھی اس سے زیادہ بھی بہت کچھ کر سکتی تھی۔ ویسے جو کچھ کرنے کی اس نے دھمکی دی تھی اس کے لیے وہی بہت کافی تھا۔ اب تک اس نے بھرپور مزاحمت کی تھی۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔

یہ خیال آتے ہی سعید خان لرز اٹھا۔ وقت آ گیا تھا کہ ایک اچھے جنگجو کی طرح وہ ہتھیار ڈال دے۔ اپنی زندگی لڑنے کی حد تک تو جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ مگر جہاں اپنے پیاروں کو گزند پہنچنے کا خدشہ ہو وہاں ہتھیار رکھ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

سعید خان کسی حتمی نتیجے پر تو نہیں پہنچ سکا۔ لیکن اس کے اندر گناہ کے لیے ایک آمادگی پیدا ہو گئی۔ اس کے ساتھ وہ اداس بھی ہو گیا۔ کاش... کاش وزیر خان ایسا نہ ہوتا۔ کاش ریشم سے اس کی منگنی نہ ہوئی ہوتی۔ لیکن اب حقائق بدل تو نہیں سکتے تھے۔

بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے بلا تاخیر میم سے بات کرنا ہوگی اور اس معاملے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ہوگا۔ یہ فیصلہ کر کے وہ اٹھا اور کاٹیج کی طرف چل دیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پھر بھی اس نے دستک دی۔

"کم ان۔"

وہ اندر چلا گیا۔ اسٹیلا صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک رسالہ تھا۔ وہ سعید خان کو دیکھ کر مسکرائی "آؤ سعید خان۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔"

"جی میم صاب۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم مجھے مچھلیوں کے متعلق بتاؤ گے۔"

"مچھلیوں کے متعلق تو میں بتا چکا ہوں۔"

"وہ میں نے سن لیا تھا۔ اب اصل بات کرو مجھ سے" اسٹیلا نے خشک لہجے میں کہا۔

"میں نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا میم صاب۔"

"لیکن اصل بات یہ ہے کہ تم نہیں چاہتے کہ وزیر خان یہاں آئے۔"

"جی ہاں۔ میں اس وقت اسی سلسلے میں آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری مدد کریں۔"

"اس بات کا جواب میں پچھلی بار دے چکی ہوں۔ لیکن تم احسان فراموش نہیں ہو۔ اس لیے بات نہیں بن سکی" اسٹیلا نے بے رحمی سے کہا۔

سعید خان نے سر جھکا لیا "میں آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔ آپ وزیر خان کو مچھلیوں کے لیے منع کر دیجئے گا۔ میں آج رات آپ کے پاس آؤں گا۔"

اسٹیلا کا دل بلیوں اچھلنے لگا "ٹھیک ہے۔ لیکن آج میرے ساتھ کوئی چالبازی نہ کرنا ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے میم صاب" سعید خان پلٹا اور باہر آ گیا۔ اس کے قدم تو بوجھل ہو رہے تھے لیکن سینے سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔

اس شام دونوں دوست ساتھ ہی رخصت ہوئے۔ لیکن دونوں کی کیفیات مختلف تھیں۔ سعید خان مطمئن تھا۔ جب کہ وزیر خان جھنجلایا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میم صاب نے صرف سعید خان کی وجہ سے اسے مچھلی لانے سے منع کیا ہے۔ لیکن بات ایسی تھی کہ وہ کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔

○☆○

اس رات اسٹیلا رجو دین کے لیے انتظار میں بھی لذت تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس بار کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ ان کے جاتے ہی وہ رات کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ اس نے بہت عرصے کے بعد ڈنر کا خصوصی اہتمام کیا۔

تیاری مکمل ہونے کے بعد اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ نو بجے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ اٹھ کر گئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور سعید خان اس کے سامنے تھا "سلام میم صاب۔"

"آج یہ نہیں چلے گا سعید خان" اسٹیلا نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے بانہوں میں لے کر میرے رخسار پر پیار کرو۔"

سعید خان چند لمحے ہچکچایا۔ پھر اس نے اسٹیلا کی ہدایت پر عمل کیا۔

"آؤ بیٹھو۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔ کھانے کے دوران تفصیلی بات بھی ہو جائے گی۔ اور پھر..." اسٹیلا نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

سعید خان بیٹھ گیا۔ اسٹیلا کھانا لگانے میں مصروف ہو گئی۔ میز اس نے پہلے ہی سیٹ کر لی تھی۔ کھانا لگانے کے بعد اس نے دو موم بتیاں روشن کر دیں اور سعید خان کو پکارا "آجاؤ ڈارلنگ کھانا لگا دیا ہے میں نے۔"

سعید خان اٹھ کر وہاں چلا گیا۔ میز دیکھ کر وہ اپنی حیرانی نہ چھپا سکا۔ یہ اہتمام اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسٹیلا کے بیٹھنے کا انتظار کرتا رہا۔ اسٹیلا بیٹھی تو وہ بھی بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے سامنے رکھی کٹلری کی پلیٹ کو دیکھا۔ پھر اسے نظرانداز کر کے اپنے انداز سے کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کبھی کبھی وہ کن انکھیوں سے میز کے اس حصے کو دیکھتا جہاں سرخ شراب کی بوتل اور جام رکھے تھے۔

اسٹیلا کھانے کے دوران سعید خان کو کھاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں... بڑے جنگلی پن سے کھا رہا تھا۔ اسٹیلا کو وہ پہلا دن یاد آ گیا جب اس نے سعید خان کو دیکھا تھا۔ اس روز اسے اس کی اس خود اعتمادی نے ہی متاثر کیا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ وہ مزے لے لے کر کھا رہا ہے اور وہ جنگلی پن کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ ایسے میں

غلط فہمی

ٹریفک سارجنٹ "میں اتنی دور سے چلا رہا ہوں پھر بھی آپ نہیں رکے۔ آپ کو آواز کی رفتار سے جانا چاہیے۔"

ڈرائیور "معافی چاہتا ہوں صاحب مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ چلا رہے تھے۔ میں سمجھا کوئی میری کار کے پیچھے آ رہا ہے۔"

اسٹیلا کو وہ پتھر کے زمانے کا کوئی وحشی معلوم ہوتا تھا۔ شاید اس کے لیے اس کی یہی بد اطواری وجہ کشش تھی۔

اسٹیلا نے خوب صورت صراحی اٹھائی اور دونوں جام بھر دیے "ممم... اب یہ پیو" اس نے کہا۔

"میم... میم صاب میں... میں نہیں پی سکتا۔"

"یہ وہ گندی شراب نہیں ہے پاگل آدمی۔ یہ وائن ہے۔ میٹھی ہوتی ہے" اسٹیلا نے اسے سمجھایا۔

"یہ بتائیں اس میں نشہ ہوتا ہے یا نہیں؟" سعید خان نے پوچھا۔

اسٹیلا کو اس کی سادگی پر پیار آنے لگا۔ اب ایسے آدمی سے وہ جھوٹ تو نہیں بول سکتی تھی "نشہ تو ہوتا ہے۔ لیکن بہت کم۔"

"تو پھر میں نہیں پی سکتا۔ اور میری التجا ہے کہ آپ بھی نہ پئیں" سعید خان نے کہا۔ پھر خود ہی وضاحت بھی کر دی "نشے سے کوئی لذت بڑھتی نہیں۔ الٹا کم ہو جاتی ہے۔"

اسٹیلا کو حیرت ہوئی۔ وہ تو یہ بات جانتی تھی۔ لیکن سعید خان کو کیسے معلوم ہوا "کیوں... تم نے کبھی پی ہے؟"

"نہیں میم صاب۔ لیکن پینے والوں سے ان کی کہانیاں سنی ہیں۔ آپ میری بات مان لیں۔"

"اور اگر میں تمہیں یقین دلاؤں کہ ایک جام سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بس ترنگ آتی ہے تو؟"

"میں تو پھر بھی نہیں پی سکتا میم صاب۔ یہ حرام ہے۔"

اسٹیلا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا "میں نہیں سمجھتی کہ اس وقت تم مجھ سے بحث کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ لیکن میں تم پر مذہب کے معاملے میں کوئی جبر کر کے دوستانہ ماحول کو مجروح نہیں کرنا چاہتی۔"

سعید خان نے شکر گزاری سے اسے دیکھا۔ وہ دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اسٹیلا اچھی عورت ہے۔

"اب تم یہ بتاؤ کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اسٹیلا نے پوچھا۔

"وہ تو میں بتا چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے شادی پر مجبور کر دیں۔"

"یہ ضروری نہیں کہ وہ میری بات مانے" اسٹیلا کا لہجہ سوچ

مل بیٹھ سکتا۔" اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مجھ سے بات ماننے کی قیمت وصول کرے۔ یہ اندازہ تم لگا سکتے کہ ایسا ہوا تو وہ کیا مطالبہ کرے گا۔"

اس کی بات سن کر سعید خان کا جسم تھرتھرا گیا۔ اس نے ذرا توقف کے بعد کہا "پھر آپ ایسا کریں کہ بس اسے روک دیں" اسے بالکل منہ نہ لگائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس صورت میں بات خود ختم ہو جائے گی۔"

"ہاں یہ بہتر ہے۔ لیکن تم جانتے ہو کہ مطلب پورا ہو جانے کے بعد تم نے انھیں پھیریں بھی کیا ہوگا۔"

"میں یہ بعد میں سوچوں گی" سعید خان نے برا مانتے ہوئے کہا۔ اسٹیلا مسکرانے لگی "میں جانتی ہوں۔ اب تم چل کر ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔ میں ذرا دیر میں آتی ہوں" یہ کہہ کر وہ بیڈ روم کی طرف چل دی۔ اسٹیلا کے لیے وہ خاص موقع تھا۔ اسے احساس تھا کہ سعید خان مجبور ہو کر اس کے قریب آیا ہے۔ گویا یہ ایک کاروباری معاہدہ تھا۔ لیکن وہ اس کاروبار کو محبت کا روپ دینا چاہتی تھی۔ ڈرائنگ روم میں اس نے خاص طور پر کئی رسالے رکھ دیے تھے۔ اب اسے اوپر جا کر تیار ہونا تھا۔ تیاری کا پورا نقشہ بھی اس کے ذہن میں موجود تھا۔

○☆○

اگلے روز جمعہ تھا۔ سعید خان صبح ہوتے گھر گیا تھا۔ اسٹیلا نے بہت اصرار کیا تھا لیکن وہ رکنے کو آمادہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اسٹیلا سو گئی تھی۔

وزیر خان اپنے معمول کے مطابق صبح نو بجے کاٹیج پہنچا۔ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ سعید خان ابھی نہیں آیا ہے۔ مگر دس بج گئے تو اسے تشویش ہونے لگی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ خاص طور پر اس لیے کہ اس شام کو صاب کو گھر آنا تھا۔

اصطبل کی طرف واپس جاتے ہوئے اس کے قدم کاٹیج کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے دروازے کو دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر چلا گیا۔ اندر کا منظر دیکھ کے وہ بت بن کر رہ گیا۔ وہاں کئی رسالے بکھرے ہوئے تھے۔ اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی نظر ڈائننگ روم کی طرف اٹھ گئی۔ ڈائننگ ٹیبل اسے صاف نظر آرہی تھی۔ اس طرف چلا گیا۔ ڈائننگ ٹیبل بھی بہت کچھ بتا رہی تھی۔ وہاں شراب کی صراحی اور دو خالی جام رکھے تھے۔ یہ بھی طے تھا کہ وہاں دو افراد نے بیٹھ کر کھانا کھایا ہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اسٹیلا کے ساتھ کون ہوگا۔

اپنا رد عمل خود وزیر خان کے لیے بھی حیران کن تھا۔ اسے ایسا لگا کہ اس کے سینے میں آگ بھڑک اٹھی ہے۔ بے سوچے سمجھے وہ اوپر خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ اسٹیلا کی خواب گاہ کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ وہ اندر چلا گیا۔ وہاں جو کچھ اس نے دیکھا، اس کے بعد کسی شک وشبے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ وزیر خان سوتی ہوئی بیم پر جھپٹنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ تکیے کے نیچے پستول رکھتی ہے۔ یہ وقت مناسب نہیں تھا۔ تاہم اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ بیم کو اپنی توہین کی سزا ضرور دے گا۔ وہ دبے پاؤں بیڈ روم سے نکلا اور دروازہ بند کر کے نیچے چلا آیا۔

اصطبل میں کام کرتے ہوئے بھی اس کے کان باہر کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ ساڑھے دس بجے سعید خان آگیا۔ وہ آتے ہی باغیچے میں مصروف ہو گیا۔ اسٹیلا عام طور پر بارہ بجے تک گھڑسواری کے لیے تیار ہو کر آجاتی تھی۔ لیکن اس روز ساڑھے بارہ بج گئے۔ وزیر خان بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اسٹیلا گیارہ بجے سو کر اٹھی۔ اس پر کسلمندی طاری تھی۔ وہ باتھ روم میں جا کر نہائی تو ذرا صاف ہوا۔ کچن میں جا کر ناشتا تیار کرتے ہوئے وہ وزیر خان کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس روز اس کا گھڑسواری کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن کھڑکی سے باہر جھانکتے ہی اس کا موڈ بن گیا۔ موسم بہت اچھا ہو رہا تھا۔ آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اس کا دل باہر جانے کو مچلنے لگا۔ ناشتا کر کے وہ لباس تبدیل کرنے اوپر چلی گئی۔ وہ تیار ہو کر اصطبل کی طرف گئی۔ وزیر خان اسے دیکھتے ہی باہر آگیا "سلام بیم صاب۔ آپ چلیں۔ میں گھوڑے لے کر آتا ہوں۔"

وزیر خان معمول کے مطابق گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے اسے سہارا دینے لگا تو اسٹیلا نے درشتی سے اسے منع کر دیا "اب میں خود بھی سوار ہو سکتی ہوں۔"

وزیر خان کے سینے کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ لیکن زہر کے وہ گھونٹ پینا اس کے لیے زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا۔ یہ اطمینان اس کے لیے کافی تھا کہ وہ جلد ہی حساب بے باق کر دے گا۔ اس نے سر اٹھا کر بادلوں کو دیکھا۔ بارش ہونا یقینی تھا۔ بلکہ شدید بارش کی توقع تھی۔ وزیر خان کو حیرت ہوئی کہ سعید خان نے بیم صاب کو روکنے کے لیے ٹانگ کیوں نہیں اڑائی۔ سعید خان نے اسٹیلا کو سہارے کے لیے منع کرتے سنا تو اسے طمانیت کا احساس ہوا۔ موسم کے تیور وہ بھی سمجھ رہا تھا۔ لیکن اس نے دخل اندازی مناسب نہیں سمجھی۔ گزشتہ روز وہ مچھلی کے معاملے میں دخل دے چکا تھا۔ آج دخل اندازی کر کے وہ وزیر خان کی برائی کیوں مول لیتا۔ اب تو حالات سنوارنے کی صورت پیدا ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں کو گھوڑے دوڑا کر جاتے دیکھتا رہا۔

○☆○

اس روز وزیر خان نے راستے کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ بارش شروع ہونے کے متعلق بھی اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ لیکن بارش کا آغاز اتنی شدت سے ہوا کہ وہ بھی بوکھلا گیا۔ اس وقت وہ ایک پہاڑ کے درمیان موجود تھے۔ گھوڑے چڑھائی کا سفر طے کر رہے تھے۔ ان کی رفتار بھی زیادہ نہیں تھی۔

اوپر پہاڑ پر جنگل تھا۔ وزیر خان اس جنگل کے ہی ارادے سے نکلا تھا۔ لیکن ابھی فاصلہ بہت تھا اور بارش طوفانی ہو رہی تھی۔ محض لمحوں میں ان کے لباس تر بتر ہو گئے۔

"وزیر خان ہمیں پناہ تلاش کرو۔ بارش بہت تیز ہے" بارش کے شور کی وجہ سے اسٹیلا کو چیخنا پڑ رہا تھا۔

"بیم صاب یہاں تو کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آتی۔ لگتا ہے اب جنگل میں ہی پناہ مل سکے گی۔"

وہ گھوڑوں کو دوڑاتے رہے۔ بارش کا پانی اتنا سرد تھا کہ اسٹیلا کے جسم میں تھرتھری دوڑنے لگی۔ اب تو بارش کی بوچھار اسے کوڑوں کی طرح لگ رہی تھی۔

ابھی وہ جنگل سے کچھ دور ہی تھے کہ وزیر خان کی نظر اتفاقاً اس پہاڑی کھوہ پر پڑ گئی۔ اس نے چیخ کر اسٹیلا سے رکنے کو کہا اور خود گھوڑے کو کھوہ کی طرف موڑ لیا۔ اس نے اندر جا کر جائزہ لیا۔ وہ اچھا خاصا بڑا غار تھا۔ وہ پلٹا اور باہر نکل آیا "غار تو کافی بڑا ہے" اس نے اسٹیلا کو بتایا "بارش رکنے تک ہم بہ آسانی یہاں رک سکتے ہیں۔ بس گھوڑوں کا مسئلہ رہے گا۔ آپ جلدی سے غار میں چلیں۔ میں گھوڑوں کو کسی درخت سے باندھ کر آتا ہوں۔"

اسٹیلا تیزی سے گھوڑے سے اتری اور غار میں چلی گئی۔ غار خاصا گرم تھا۔ لیکن لباس بھیگ جانے کی وجہ سے اس پر جو لرزہ چڑھا ہوا تھا، وہ ایسی آسانی سے اترنے والا نہیں تھا۔ ادھر وزیر خان نے گھوڑوں سے زین کھولی۔ ساتھ بندھے ہوئے تھیلوں میں کمبل بھی تھے جو اس نے احتیاطاً رکھے تھے۔ وہ زینیں اور تھیلے لے کر غار میں بھاگا "تھیلوں میں کمبل ہیں۔ بھیگے کپڑے بیمار کر دیں گے۔ آپ کپڑے اتار کر کمبل لپیٹ لیں۔ میں گھوڑوں کو کہیں باندھ کر آتا ہوں۔"

وزیر خان گھوڑوں کی لگامیں تھام کر اوپر چل دیا۔ ایک درخت اس کی نظر میں تھا۔ گھوڑوں کو باندھ کر واپس آتے ہوئے اس نے کچھ درختوں سے نچلی چھوٹی ٹہنیاں توڑ لیں جو سوکھی تھیں۔ اچھی خاصی ٹہنیاں جمع کر کے وہ غار کی طرف چل دیا۔

غار میں اسٹیلا خود کو کمبل میں لپیٹے زمین پر بیٹھی تھی۔ اس کے بالوں سے اب بھی پانی ٹپک رہا تھا۔ اس کے جسم میں اب بھی ہلکی سی لرزش تھی۔ وزیر خان نے کچھ چھوٹی ٹہنیاں رکھ کر انہیں جلایا۔ ٹہنیاں سلگ اٹھیں تو اس نے اوپر بڑی ٹہنیاں ترتیب سے رکھ دیں۔ آگ سلگا کر اس نے دوسری زین اسٹیلا کے برابر والی اور خود منہ پھیر کر کمبل کی آڑ میں کپڑے اتارنے میں مصروف ہو گیا۔ کپڑے اس نے آگ کے سامنے رکھ دیے۔ اسٹیلا اپنے کپڑے پہلے ہی رکھ چکی تھی۔

دوسری زین پر بیٹھ کر اس نے اسٹیلا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "ارے۔ آپ تو ابھی تک لرز رہی ہیں۔ بہت سردی لگ رہی ہے۔"

اسٹیلا نے کوئی جواب دینے کی بجائے ناگواری سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن وزیر خان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

"زمین پر بے آرام بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے" وزیر خان نے کہا "ہم دونوں ایک کمبل میں بیٹھ سکتے ہیں۔ دوسرا بچھانے کے کام آسکتا ہے۔"

"مجھے یہیں اور یہاں... میرا ہاتھ چھوڑو" اسٹیلا نے سخت لہجے میں کہا۔

لیکن وزیر خان اپنا کمبل بچھانے میں مصروف ہو گیا۔ اسٹیلا نے اٹھ کر غار کے دہانے کی طرف بھاگنا چاہا۔ مگر وزیر خان نے اسے دبوچ لیا "کہاں جاتی ہو" [illegible] کر کے دیکھو ایک کمبل میں کتنی گرمی ہوتی ہے۔"

"تم مجھے ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میری اجازت کے بغیر تم کچھ بھی نہیں کرو گے" اسٹیلا نے کہا۔ لیکن وزیر خان کی نگاہوں سے اسے خوف آنے لگا۔

"اس علاقے میں ایسا نہیں ہوتا" وزیر خان نے تند لہجے میں کہا اور اس کے کمبل میں گھس گیا۔ اس نے اسٹیلا کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری اور سختی تھی "تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ کل تم نے کیا کھیل کھیلا ہے۔ اب میں تمھارا غلام بن کر نہیں رہ سکتا۔"

"میں کچھ بھی کروں۔ تم کون ہوتے ہو اعتراض کرنے والے۔ اپنی اوقات یاد رکھو" اسٹیلا چلائی۔

جواب میں وزیر خان کا ہاتھ حرکت میں آیا اور اسٹیلا کے رخسار پر انگلیوں کے نشانات ثبت ہو گئے۔ اسٹیلا حلق کے بل چلانے لگی۔ اس کی چیخ پکار سے وزیر خان پر دہشت طاری ہو گئی۔ اس نے اسٹیلا کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اسٹیلا پہلے مدد کے لیے پکارتی رہی۔ پھر وہ گڑگڑائی اور آخر میں بے بس ہو کر گالیاں بکتی رہی۔ لیکن وہ باز کے پنجوں میں آئی ہوئی چڑیا کی طرح تھی۔ مزاحمت اس کے بس میں ہی نہیں تھی۔

باہر بارش اسی طوفانی انداز میں ہو رہی تھی۔

غار کے اندر طوفان گزر چکا تھا۔ اسٹیلا کی سسکیوں اور وزیر خان کے ہانپنے کے سوا کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ وزیر خان نے اپنے طور پر اسٹیلا کو کچل دیا تھا۔ لیکن اس کی دہشت ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ نفرت بھری نظروں سے اسٹیلا کو دیکھ رہا تھا۔

"تم تصور نہیں کر سکتے منحوس آدمی کہ تمہارا کیا حشر ہونے والا ہے" اچانک اسٹیلا چلائی "تمہیں اپنے اس کیے کی وہ سزا ملے گی کہ دوسروں کو بھی عبرت ہو گی۔ تمہیں کتے کی موت نصیب ہو گی۔ تڑپ تڑپ کر مرو گے تم۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے......"

وہ جذبات کی رو میں کہے جا رہی تھی۔ اس نے نہیں دیکھا کہ اس کے کہے ہوئے ہر لفظ پر وزیر خان کے چہرے کا تاثر کس طرح بدل رہا ہے۔ اس کی نظریں تو اس وقت اٹھیں جب وزیر خان اس کا گلا دبوچ رہا تھا "تو...... تو مجھے دھمکی دیتی ہے؟" وہ نفرت سے کہہ رہا تھا "مجھے؟ وزیر خان کو؟" اور اس کی انگلیوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

اسٹیلا مر چکی تھی۔ وہ اب بھی اس کا گلا دبائے ہوئے تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اسٹیلا کا جسم بے جان ہو چکا ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

○☆○

سعید خان بہت پریشان تھا۔ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وزیر خان اور میم صاحب واپس نہیں آئے تھے۔ کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ بیری رچرڈسن چھ بجے کاٹیج پہنچا تو اس نے سکون کی سانس لی۔

ایک گھنٹے بعد بارش تھمی تو وہ انہیں ڈھونڈنے نکلے۔ لیکن انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس طرف گئے ہوں گے۔ گھوڑوں پر تو کہیں بھی جا سکتا ہے۔ اتنے بڑے علاقے میں انہیں تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ پھر رات بھی ہو گئی اور انہیں لوٹنا پڑا۔ اگلے روز پورا دن گزر جانے پر بھی ان کا سراغ نہ مل سکا۔ بیری رچرڈسن نے سرکاری طور پر بھی مدد طلب کر لی۔ سعید خان کے گاؤں کے لوگ بھی تلاش میں شامل ہو گئے۔ وزیر خان کے گھر والے بھی بہت پریشان تھے۔

پانچویں دن لاش مل گئی۔ دونوں گھوڑوں اور وزیر خان کا کہیں پتا نہیں تھا۔ لیکن سب کچھ واضح تھا۔

بیری رچرڈسن انگریز بھی تھا اور بااختیار بھی۔ وزیر خان کی تلاش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا لیکن اسے بہت اچھا اسٹارٹ مل گیا تھا۔ وہ ہاتھ نہیں آیا۔ بلکہ اس کے متعلق کبھی کوئی اطلاع بھی نہیں ملی۔ بیری رچرڈسن بہرحال شریف آدمی تھا۔ اس نے وزیر خان کے گھر والوں کو بھی پریشان نہیں کیا۔ لیکن وہ تندہی سے اسے تلاش کرتا رہا۔ یہ الگ بات کہ اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

دو سال ہو گئے۔ ریشم کی شادی ہو گئی۔ وزیر خان سے نہیں اس لیے کہ وزیر خان نے تو اپنے گھر والوں سے بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ ریشم کی شادی اچھے گھر میں ہوئی تھی۔ اس کا شوہر بھی بہت اچھا تھا۔ سعید خان بہت خوش تھا۔ اس کے نزدیک تو اسٹیلا رچرڈسن کو قتل کرنے سے پہلے بھی وزیر خان ریشم کے قابل نہیں تھا۔ جان چھوٹ گئی تھی۔

○☆○

"...... تو یہ ہے اس بے نظیر مزاحمت کی کہانی" بابا فرقان نے گہری سانس لے کر کہا "اور یہ ہے انگریزوں کی غیرت للکارنے اور اس مٹی کو انگریز کے خون سے غسل دینے کا قصہ۔ جو کچھ جانتا تھا، میں نے تمہیں بتا دیا۔ اب فیصلہ تم خود کرو۔ میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

ایک نوجوان نے سر اٹھایا اور بابا فرقان سے پوچھا "آپ نے یہ نہیں بتایا کہ وزیر خان کا کیا بنا؟"

"قتل کے اس واقعے کے چار برس بعد ملک آزاد ہو گیا اور وزیر خان ہیرو کی حیثیت سے واپس آ گیا۔"

"آپ ووٹ کے سلسلے میں ہمیں کوئی مشورہ دیں گے؟" ایک اور جوان نے پوچھا۔

بابا فرقان تھوڑی دیر سوچتا رہا "میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں" بالآخر اس نے کہا "تم لوگ پڑھے لکھے ہو۔ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہو۔ تم بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔ اب تک تم کئی اسمبلیاں بھی دیکھ چکے ہو۔ کیا اب تک نہیں سمجھ سکے کہ اپنے جیسے لوگوں میں سے لیڈر منتخب کرو، جن سے جواب طلبی بھی کر سکو ورنہ کیا حاصل اس جمہوریت کا۔ یہ تو وہی غلامی ہے۔ ہاں تم اس پر فخر کر سکتے ہو کہ اب بدیسی آقاؤں کی بجائے اپنوں کی غلامی کر رہے ہو۔"

جوانوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، بابا فرقان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں سلام کر کے چلے آئے۔

الیکشن کا نتیجہ سامنے آیا تو سب حیران رہ گئے۔ تھوڑے ووٹوں سے ہی سہی، اپنے علاقے اور لوگوں کی خدمت کا شوق رکھنے والا امیدوار کامیاب ہو گیا تھا۔ اب لوگوں کی آنکھوں میں مستقبل کی امید کے دیے جھلملا رہے تھے۔

پگلی

علیم الحق حقی

وہ ایک پاگل بڑھیا تھی. کیونکہ بدلتی ہوئی دُنیا اُس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور بدلتی ہوئی دُنیا جس کی سمجھ میں نہ آئے اُسے پاگل کے سوا اور کہا بھی کیا جاسکتا ہے مگر وہ بڑھیا پاگل کے سوا شاید کچھ اور تھی.

ایک ایسی کہانی جس کے انجام میں واقعی ایک دھماکا پوشیدہ ہے

پاگل بڑھیا کہلانے سے پہلے وہ صرف بڑھیا کہلاتی تھی۔ ...اس سے پہلے وہ بوڑھی مسز نیلسن تھی اور اس سے پہلے (یہ بہت' بہت پرانی بات ہے) وہ مسز نیلسن تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ مسٹر نیلسن بھی ہوتے تھے مگر اب توبس ان کی چند نشانیاں رہ گئی تھیں۔ جنگ کی یادگاریں جو مینٹل پیس پر لائن سے رکھی ہوئی تھیں۔ اب تو مینٹل پیس سے گرد بھی نہیں جھاڑی جاتی تھی۔ ...ان میں ایک بحری جنگی جہاز کا ماڈل تھا۔ دشمن کا ایک ہیلمٹ تھا' دشمن ہی کا ایک بم تھا' ایک چاقو تھا' کچھ اور چیزیں تھیں چھوٹی چھوٹی۔ دشمنوں کے بیج اور بٹن وغیرہ۔

ان دنوں دشمن بہت دور کی چیز معلوم ہوتا تھا اور شاپنگ بہت آسان تھی۔

اب تو چند بلاک کا فاصلہ بھی میلوں پر محیط معلوم ہوتا ہے۔ پہلے چند بلاک چلنا کتنا اچھا لگتا تھا۔ پیڑوں کے سائے سائے...

پرانی طرز کے خوش نما مکانات کے ساتھ ساتھ چلنا کتنا بھلا لگتا تھا۔ پرانے فیملی اسٹورز تھے، جہاں سے اشیائے ضرورت خریدی جاتی تھیں۔

اب تو سب کچھ بدل گیا ہے۔

ایک تو یہ کہ درختوں کو بدلتے وقت کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے کا شعور نہیں تھا۔ ان کی شریر شاخیں بجلی کے تاروں سے چھیڑ چھاڑ کرتی تھیں۔ ان کی جڑیں گندے پانی کی لائنوں کے لئے رکاوٹ بنی تھیں اور ان کے تنے فٹ پاتھوں کو تنگ کرتے تھے۔

چنانچہ بیشتر پرانے درخت کاٹ ڈالے گئے۔

یہ ایک بہت بڑا شاک تھا، جس کے لئے بوڑھی مسز تیلسن کو کسی نے ذہنی طور پر تیار کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ایک دن کہیں کوئی بڑھا درخت فٹ پاتھ پر کمر جھکائے کھڑا نظر آتا۔ دوسرے دن وہاں مرے ہوئے تنے، بریدہ شاخوں اور زخمی ٹہنیوں، پتوں اور برادے کے سوا کچھ نہ ہوتا اور اگلے دن وہ کچھ بھی نہ رہتا۔

پرانے طرز کے مکانات بھی گرا دیئے گئے تھے... اور جو نہیں گرائے گئے تھے، ان کے حلیے تبدیل ہو گئے تھے۔ انہیں اور اونچا کر دیا گیا تھا اور ان کے کئی کئی حصے کر دیئے گئے تھے۔ اب وہ اپارٹمنٹ کہلاتے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ مکینوں کو ان اپارٹمنٹس سے وہ وابستگی محسوس نہیں ہوتی تھی، جو پرانے گھروں سے انہیں رہی تھی۔

جہاں تک پرانے فیملی اسٹورز کا تعلق ہے وہ بھی اس انقلاب کی زد میں آئے تھے۔ ایسے ہی ایک اسٹور کے مالک مسٹر برمن نے کہا تھا "میں تو اب کوئی چیز بھی نہیں بیچ سکتا۔ اس لئے کہ سپر مارکیٹ سے ہر چیز اس قیمت میں مل جاتی ہے، جس میں میں خریدتا ہوں۔ اور مسز تیلسن، بچے بھی اب پہلے کی طرح اپنے والدین سے پیسے لے کر چیز خریدنے نہیں آتے۔ اب تو وہ صرف چیزیں چرانے آتے ہیں۔ میں سوچتا تھا، میرے بعد میرا بیٹا اسٹور سنبھالے گا لیکن وہ ویت نام سے تابوت میں واپس آیا۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟"

سپر مارکیٹ وہاں بنائی گئی تھی، جہاں کوئی مارکیٹ نہیں تھی۔۔۔ حالانکہ اسے وہاں بننا چاہیے تھا، جہاں پرانے اسٹور تھے۔ وہ پرانا سرکاری باغیچہ، جہاں رنگ برنگے پھول کھلتے تھے، سپر مارکیٹ کے لئے اجاڑ دیا گیا تھا۔ اب بچے باغیچوں کے بجائے سڑکوں پر کھیلتے تھے۔

اور پھر سپر مارکیٹ میں چیزیں سستی ملتی تھیں تو ادائیگی بھی نقد کرنا ہوتی تھی۔ مہینے بھر کا ادھار نہیں چلتا تھا اور سامان کوئی لڑکا گھر نہیں پہنچاتا تھا۔ پہلے تو ڈیلیوری بوائے گھر پر سودا پہنچانے آتا تھا اور اسے گھر پر بنی ہوئی کوئی چیز کھانے کو دی جاتی تو خوش ہو کر شکریہ ادا کرتا تھا۔

مسز تیلسن کی موت کے بعد اکثر ایسا ہوتا تھا کہ لڑکا سودا لے کر آتا تو ۲۵ سینٹ کے عوض لان ٹھیک کر دیتا، گھاس کاٹ دیتا۔ خالی بوتلیں لے کر شکریہ ادا کرنے کا رواج بھی تھا۔ پہلے کے غریب لوگ بوتلیں فٹ پاتھ پر یا بجلی کے کھمبوں پر مار کر توڑنے کو زیاں سمجھتے تھے۔

اب تو سب کچھ بدل گیا تھا۔ لان کی صفائی اور گھاس کی کٹائی کے لئے ایک ڈالر کے عوض بھی کسی لڑکے کی خدمات میسر نہیں آتی تھیں۔ بوتلیں تفریحاً توڑ دی جاتی تھیں... اور غریب لڑکے توڑتے تھے۔

"یہ دنیا کس طرف جا رہی ہے؟" بوڑھی مسز تیلسن ایک ایک سے پوچھتی۔ پھر وہ چیختی "میں سب جانتی ہوں، مجھے سب معلوم ہے، تم لوگ گھروں میں چھپے بیٹھے ہو۔"

یہ وہ وقت تھا، جب لوگوں نے اسے پاگل بڑھیا کا نام دیا۔ وہ کہتی تھی کہ بڑے لڑکے اس پر چٹانیں پھینکتے ہیں۔ بڑے لڑکے اس کی تردید کرتے اور پولیس کا کہنا تھا کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

جب اس نے شاپنگ کے لئے نکلتے وقت اپنے سر پر فوجی ہیلمٹ رکھنا شروع کیا تو لوگ اس پر ہنسنے لگے۔ اور وہ شاپنگ کے لئے گھر سے نکلنے پر مجبور تھی۔ وہ زمانے تو لد گئے تھے جب کسی اسٹور کو فون کر کے کہہ دیا جاتا تھا "کہو بھئی، ایستھر اور ننھے نومولود کا کیا حال ہے؟ اور ہاں، ایک پاؤ چینی اور ایک پاؤ مکھن بھجوا دینا۔"

کبھی کبھی پگی کے ذہن سے یہ بات نکل جاتی، وہ پرانا نمبر ڈائل کرتی، جو اسے اب بھی یاد تھا لیکن اب وہاں کوئی اور فیملی رہتی تھی۔ وہ اس کی خریداری کی فرمائشوں کے جواب میں گندی زبان استعمال کرتے تھے۔ لوگوں میں اخلاق نام کی چیز ہی نہیں رہ گئی تھی۔

پرانے علاقوں میں اب بھی پرانے، بڈھے جنٹلمین اور لیڈیز موجود تھیں لیکن شروع میں وہ انہیں بوڑھا ماننے کو تیار ہی نہیں تھی "میری دادی بوڑھی تھی" وہ کہتی "اور اسے پرانی خانہ جنگی یاد تھی۔ مرتے دم تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی ملنے والے کا جنم دن بھولی ہو لیکن میں نہیں سمجھتی کہ تمہیں میری دادی یاد ہو گی۔"

"لو، پاگل بڑھیا کو دیکھو، خود سے باتیں کر رہی ہیں" نوجوان لڑکیاں بہ آواز بلند تبصرہ کرتیں۔ ان کے لہجے بہت خراب ہوتے۔

اور پگی کے تصور میں لہراتی ہوئی مسز جارج، جو کبھی کی مر چکی تھی، اسے دلاسا دیتے ہوئے کہتی "تم ان کی باتوں پر کان مت دھرو مسز تیلسن۔ ہم یہ ظاہر کریں گے، جیسے ہم نے ان کا تبصرہ سنا ہی نہیں۔"

"مسز جارج... یہ تمہارا ہاتھ۔ کیا ہوا تمہارے ہاتھ کو؟"

"آؤ چہل قدمی کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ نہیں سن رہے ہوں گے تب میں تمہیں بتاؤں گی۔"

مسز جارج پیاری عورت تھی۔ اپنے زمانے میں تو وہ بہت ہی خوب صورت رہی ہو گی۔ پگی سوچتی رہی۔ آخر کسی نے اس کا ہاتھ کیوں توڑ دیا۔

"میری شاپنگ کی رقم میرے پرس میں رہتی ہے اور کہاں رکھوں؟ میں کہیں اور کھر بھی نہیں لے سکتی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

اس سے ثابت ہو گیا کہ باہر نکلتے وقت ہیلمٹ پہننا کتنا ضروری ہے۔ مسز جارج کا ہاتھ اسی چکر میں ٹوٹا۔ کسی نے اس کا پرس چھینا، اسے دھکا دے کر گرایا اور رفو چکر ہو گیا۔

ہیلمٹ نہ پہنا جائے تو وہ لوگ سر توڑ دیں۔

کون وہ لوگ؟

"تم انہیں پکڑتے کیوں نہیں؟" وہ پولیس والوں سے کہتی۔ پولیس والوں نے کہا کہ اس حلیے پر تو علاقے کے تمام لڑکے پورے اترتے ہیں۔ کس کس کو گرفتار کریں۔

مسز شلز کے قتل پر بھی پولیس والوں نے یہی کہا تھا لیکن اگر وہ ہیلمٹ پہنے ہوتی تو اس کا سر کیوں پھٹتا۔

اس سے ہیلمٹ کی اہمیت واضح ہوتی تھی۔

"پولیس ہوتی کس لئے ہے؟ تم لوگ انہیں گرفتار کیوں نہیں کرتے؟" وہ پوچھتی۔

"وہ کون؟"

پھر پگی بھی زد میں آ گئی۔

کسی نے اسے دبوچا، اس کا ہیلمٹ اتارا اور اسے دھکیل کر گرا دیا۔ پھر وہ زیادہ تیز بھی نہیں بھاگا، بار بار پلٹ کر دیکھتا اور ہنستا۔

"تم بہت خوش قسمت تھیں۔" ایک پولیس مین نے پگی سے کہا۔ "ممکن ہو تو رات کے وقت گھر سے نکلا ہی نہ کرو۔"

"لیکن یہ دن کی بات ہے۔" بڑھیا نے چیخ کر کہا۔

ایک روز کسی نے اوپر فلیٹ کی کھڑکی سے اس پر چٹان پھینکی لیکن نہیں، وہ چٹان نہیں تھی۔ وہ پتھر بھی نہیں تھا وہ تو اس کے شوہر کا یادگار ہیلمٹ تھا لیکن اسے بری طرح پچکا دیا گیا تھا۔ اب وہ ہیلمٹ ہی نہیں لگتا تھا۔

پگی نے سوچا، اب اپنے تحفظ کے لئے کیا کروں میں؟ اب گوشت خریدنے نکلوں گی تو کیا ہو گا۔ پولیس کہاں ہے؟ پولیس کیا کر رہی ہے؟

"سوری لیڈی سوری۔" پولیس مین نے کہا "آپ اتنا بڑا چاقو اپنے پرس میں رکھ کر گھر سے نہیں نکل سکتیں۔ یہ خلاف قانون ہے۔"

"تو پھر میری حفاظت کون کرے گا؟ تم لوگ تو نہیں کر سکتے۔"

بڑھیا چلائی۔ "اب تو میرے پاس ہیلمٹ بھی نہیں رہا۔"

وہ چاقو بھی اس کے شوہر کی نشانیوں میں سے تھا لیکن پولیس مین نے اسے ضبط کر لیا۔

وہ چیخ کر مسز جارج کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ اپنے زمانے میں کتنی حسین خاتون رہی ہے۔ اس نے چیخ کر مسز جارج کو پکارا لیکن سڑک پر بہت شور و غل تھا۔ ہر گھر کی کھڑکی سے ریڈیو کی، ٹیپ کی، ریکارڈ پلیئر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایسے میں اس کی آواز کون سنتا۔

وہ پھر چلائی "مدد... مدد..." لیکن اتنے شور میں کون اس کی سنتا۔

اور اس شخص کی رفتار حیرت انگیز تھی، جس نے پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے مسز جارج کا پرس چھینا تھا اور اسے نیچے گرایا تھا پھر ہنستا ہوا، پرس اچھالتا ہوا بھاگتا چلا گیا تھا۔

'ایسا تو میرے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔' پگی نے سوچا۔ 'اور اب تو میرے پاس ہیلمٹ بھی نہیں۔ چاقو پولیس مین نے ضبط کر لیا اور شاپنگ کے لئے نکلنا ضروری ہے۔ اب کیا کروں؟' اس نے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں لیکن اس میں جیبیں رہی ہی نہیں تھیں گویا پرس لے کر نکلنا ضروری تھا۔ اب کیا ہو؟

اس نے پرس کے تسمے کو ایک زنجیر کی مدد سے اپنے ہاتھ سے باندھ لیا۔ پرس میں محض چند ڈالر تھے۔

اسے اپنے عقب سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تو اس نے چلانا شروع کر دیا لیکن اتنے شور میں اس کی آواز کون سنتا۔

وہ جانتی تھی کہ ایک دن ایسا ہو گا اور اب وہی کچھ ہو رہا تھا۔

اس نے بڑھیا کے پرس پر جھپٹا مارا، زوردار جھٹکا دیا۔ استخوانی ہاتھ سے بندھی ہوئی نازک زنجیر ٹوٹ گئی اور وہ پرس لے کر یہ جا وہ جا۔

بڑھیا نے سوچا۔ میں پاگل ہی تو ہوں، جو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ میرے استخوانی ہاتھ سے بندھی ہوئی یہ زنجیر پرس کو بچالے گی۔

بڑھیا چیختی رہی، اور وہ بھاگتا رہا۔ پرس میں لوہے کی کوئی چیز کھنکھنا رہی تھی۔

اچکا بمشکل آدھے بلاک دور گیا ہو گا کہ بم پھٹ گیا۔

اب جانتے تھے کہ وہ پاگل ہے۔ پاگل خانے میں سب اس کا خیال رکھتے ہیں۔ تنہائی بھی نہیں، اور وہ آزادانہ شاپنگ کر سکتی ہے۔ وہ پرس جھلاتی ہوئی پاگل خانے کی کینٹین جاتی ہے ... اور کوئی اسے پریشان نہیں کرتا۔ کوئی اس سے پرس نہیں چھینتا۔

اب وہ محفوظ ہے!

CRAZY OLD LADY
AVARM DAVIDSON